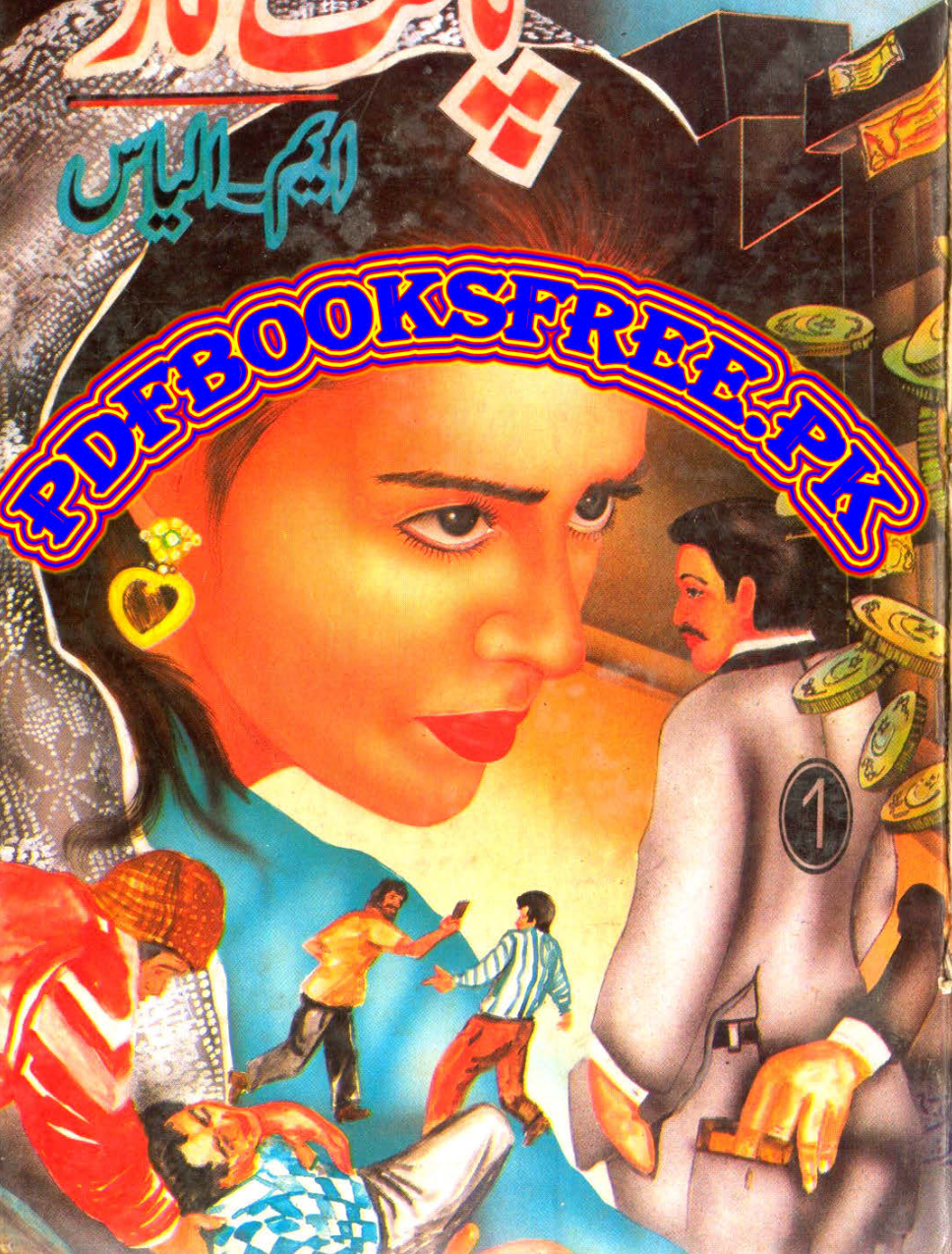


جدید دور کے
سکندر اعظم کا فسانہ

کاکٹ مار

انیم الیاس

PDFBOOKSFREE.PK



شکاری انگلیوں کی روداد جو دوسروں کی جیبوں میں ریگنے کی عادی تھیں
جدید دور کے سکندر اعظم کا فسانہ

1

پاکستان

ایم الیاس

گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
۱۱۔ عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور

1998ء

ناشر مبین خٹک

گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

تعداد 600 عدد

پیش لفظ

میں اپنی اس کہانی کے بارے اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کہانی نئے عہد کے سکندر اعظم کی کہانی ہے جو ایک جیب تراش تھا۔ جیب تراش ایک فن کار ہوتا ہے۔ اس سے کون واقف نہیں ہے۔ وہ زندگی کے تمام راستوں پر ملتا ہے۔

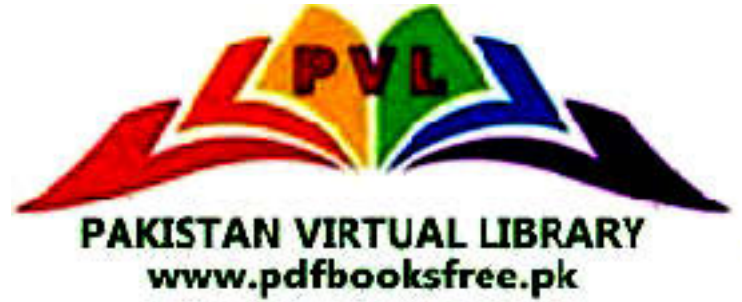
جس طرح ہر آدمی کے سینے میں ایک دل ہوتا ہے اس کے سینے میں بھی دل تھا۔ یہ ایک جیب تراش کے دل اور اسکے نازک جذبوں کی ایک اچھوتی کہانی ہے۔

میرا یہ دعویٰ تو نہیں ہے کہ ایسی کہانیاں اب لکھی نہیں جا رہی ہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ دل گداڑ کہانی آپ کو بہت متاثر کرے گی۔

ایم۔ الیاس



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk



اس آراستہ و پیراستہ گول کمرے میں، جو پہلی منزل پر واقع تھا، صبح ہی سے جوا کھیلا جا رہا تھا۔ مگر اس میں وہ تیزی اور گرمی نہیں تھی جو عام طور پر جواریوں میں کھیل کے دوران ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کھیل آپس ہی میں ہو رہا تھا۔ جیسے ہم سب یہاں وقت گزاری کے لیے جمع ہوں۔ کسی قدر محتاط ہو کر چھوٹی چھوٹی رقبیں داؤ پر لگائی جا رہی تھیں، کوئی بھی بڑا کھیل کھیلنے کے لیے یوں بھی آمادہ نہیں تھا کہ شمسو چند موٹی اسامیاں لانے گیا ہوا تھا، جنہیں اس نے دو ایک روز پہلے ہی پھانسا تھا اور اب ہم سب شکار کے انتظار میں بھوکے خون آشام بھیڑیوں کی طرح رال نکاتے ہوئے بے چین اور مضطرب ہو رہے تھے۔

دوپہر کے وقت شمسو پانچ موٹے شکار لے کر پہنچا تو کمرے میں رمی کی وجہ سے جو قدرے خاموشی اور سکون قائم تھا، درہم برہم ہو کر رہ گیا، کیوں کہ نئے مرغوں کی خواہش کے احترام میں فٹیش شروع ہو گئی تھی۔ تین پتوں کے اس کھیل کے باعث، کھیل میں نہ صرف تیزی اور گرمی، بلکہ سنسنی بھی آگئی تھی۔ ہر جواری کسی پر جوش سپاہی کی مانند، اس میدان میں اپنے طور پر قسمت آزمائی کر رہا تھا اور قسمت سے زیادہ غیر محسوس انداز اور بڑی ہوشیاری سے ہاتھ کی صفائی دکھائی جا رہی تھی۔ شکار کو ایک ہی جھگے میں تیز چھری سے کاٹنے کا مطلب تھا کہ ہم آئندہ کے لیے اس شکار سے محروم ہو جائے، لہذا ان لوگوں کو میٹھی چھری سے ذبح کیا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کھیل میں بڑے نشیب و فراز آرہے تھے۔

میں بہت محتاط ہو کر کھیل رہا تھا۔ میری نیت بھی صاف تھی۔ میں اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ قسمت مجھ پر ویسے ہی مہربان تھی۔ اس اڑے کے مالک مناف میاں کو جوئے کے کھیل میں ٹال کی رقم برابر مل رہی تھی۔ اس کے پاس ٹال میں خاصی بڑی رقم جمع ہو چکی تھی جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ بھی ہو رہا تھا۔ وہ بڑی فراخ دل سے، اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کر رہا تھا۔ انہیں چائے، بیر، سگریٹ اور ٹھنڈے مشروبات پیش کیے جا رہے تھے۔ کمرہ

تھا اور دوڑنے کی رفتار مزید تیز کر دی جیسے کوئی عفریت اس کے تعاقب میں ہو۔

لڑکی کا نوجوان ہوتا ہی قیامت ہوتا ہے، پھر حسین اور پرکشش ہو تو مزید غضب و عاتق ہے۔ لڑکی واقعی اس قدر حسین اور پرکشش تھی کہ اسے اس ویرانے میں تنہا پا کر اگر کوئی مرد اس کا تعاقب کر رہا تھا تو اس میں مرد کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس لیے کہ سانپ اور مرد ہمیشہ بے بسی سے ہی ہتھیار اٹھاتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ اس لڑکی کے تعاقب میں کالج کا کوئی نوجوان یا بھریڑی عمر کا کوئی مرد ہو گا... جو عمد و بیاں کے ہمانے یہ سوچ کر لے آیا ہو گا کہ یہاں کھلی فضا ہے اور یہ جگہ شر سے مایلوں دور ہے، یہاں کسی کا ڈر اور خوف نہیں ہے۔ اگر لڑکی کو اس نیت اور کسی برے ارادے سے نہیں لایا گیا ہو گا تو پھر لڑکی کے سراپانے اس ویرانے میں کسی کو ہکا بکا دیا ہو گا۔ لڑکی کا سراپا ایسا تھا کہ ایسی سنسان جگہ پر کوئی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔ نوجوان لڑکیاں محبت میں اندھی ہو کر ایسی جگہوں پر بے دھڑک چلی جاتی ہیں جہاں انہیں کوئی تحفظ حاصل نہیں ہوتا... پھر انہیں اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ہر چاہنے والا زاہد تو نہیں ہوتا۔

میں نے تیزی سے چاروں سمتوں کا جائزہ لیا۔ مجھے اس لڑکی کے تعاقب میں دور دور تک کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ میں نے چند لمحوں تک انتظار بھی کیا کہ بس اب کوئی کسی سمت سے آتا دکھائی دے گا، لیکن وہ لمحے بھی بیت گئے اور کوئی نہیں آیا۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ لڑکی اس قدر حواس باختہ ہو کر اس انجانے راستے پر کیوں بھاگ رہی ہے جو ویرانے کی طرف جا کر گرم ہو جاتا ہے۔ ادھر نہ تو کوئی آبادی ہے اور نہ ہی کوئی ایسا راستہ ہے جو شرکی طرف جاتا ہو، جس پر سے گاڑیاں گزرتی ہوں۔ آخر وہ اس ویرانے میں کیوں پناہ لینا چاہتی ہے؟ کیا اسے وہاں تحفظ مل جائے گا؟ میں حیران و ششدر کھڑا سوچ رہا تھا۔ ”معا“ میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ لڑکی کسی کو قتل کر کے تو اس سمت میں نہیں بھاگ رہی ہے تاکہ ان گھنے درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو جائے جہاں دن کے اجالے میں بھی تاریکی چھائی رہتی ہے؟ وہ سب کچھ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہی ہوگی۔ اس نے سوچا ہو گا کہ دن کے اجالے میں قتل کر کے لوگوں کی نظروں میں آنے کا خطرہ ہے بہتر یہی ہو گا کہ ان درختوں کے جھنڈ میں رات ہونے تک چھپی رہے۔ تو کیا وہ ادھر پناہ تلاش کر رہی ہے؟

لڑکی ایک راستے پر جا کر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔ میرے اندر الجھل سی ہونے لگی۔ فطری اشتیاق اور تجسس مجھے اکسانے لگا۔ میں نے لڑکی کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کر لیا اور تیزی سے زبوں کی طرف بڑھتے ہوئے چند لمحوں کے لیے ٹھک گیا۔ میں نے مزید اطمینان کر لینا چاہا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ اس لڑکی کے تعاقب میں چار پانچ بد معاش ہوں اور وہ مسلح ہوں۔ میں منتا آدمی ان کا مقابلہ کیسے کر سکوں گا... لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ میں کوٹھی سے نکل کر اس راستے پر چل دیا جس پر وہ لڑکی گئی تھی۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ ان میں سے کسی کو میری حرکات و سکنات کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔ یوں بھی انہیں بتانے سے کچھ حاصل نہ ہوتا کیوں کہ وہ سب ایک دوسرے کی لوٹ کھسوٹ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اگر میں اس لڑکی کے

کشادہ ہونے کے باوجود گری، گھٹن اور جس کا شکار تھا۔ مناف میاں پولیس کو باقاعدگی سے جھڑپ دیتا تھا اور علاقے کا تھانے دار، جس نے اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے قانون اور اس کی بلا دستی کو جیسے جہنم میں جھونک دیا تھا، کالی بھیڑ بن کر اسے تحفظ دے رہا تھا۔ پھر بھی مناف میاں بہت احتیاط کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک کھڑکی ذرا سی کھلی رکھتا تھا، حالانکہ اسے خوفزدہ یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ اس کی کوٹھی ڈیفنس کے علاقے میں عقبی جانب واقع تھی۔ جہاں اس علاقے کی حد ختم ہوتی تھی، ادھر اونچے نیچے نیلے میدان اور گھنے درختوں کے جھنڈ کے راستے اور پگڈنڈیاں آتی تھیں۔ یہ کراچی شہر کا اعلیٰ ترین رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں صرف روسا اور شرفا کے کے بنگلے اور کوٹھیاں تھیں۔ مناف میاں کا شمار بھی شرفا میں ہوتا تھا، اس لیے کہ وہ کوٹھی اور شراب کی ایک دکان کا مالک تھا۔ اس علاقے میں پولیس اور فوج کے اعلیٰ افسران بھی رہائش پذیر تھے، لہذا کسی معمولی پولیس افسر کو وہاں گشت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ جو جتنا بڑا ہے اتنا ہی بار سوخ بھی ہوتا ہے۔ یہاں کے کسی مکین پر جس معمولی پولیس افسر نے بھی ہاتھ ڈالا، اس کا مستقبل تاریک ہو گیا... لہذا کسی کو اس علاقے میں قدم رکھ کر فرض شناسی کی مثال قائم کرنے کی جرات نہیں ہوتی۔

میں ایک معقول رقم جیت چکا تھا اور مجھے اس جوئے سے زیادہ دل چسپی بھی نہیں تھی، اس لیے گرمی، شور، دھوئیں اور جس کا ہمانہ کر کے کمرے سے نکلا اور چھت پر چلا آیا تاکہ تازہ ہوا میں سانس لے سکوں۔ فضا میں سوندھی سوندھی سی مہک بسی ہوئی تھی اور ایک ایسی نم آلود خوشبو زمین سے پھوٹ رہی تھی جسے بارش کی بوندیں جنم دیتی ہیں۔ میں ایک لمبی سانس لے کر منڈیر کی طرف بڑھا تو جسم میں فرحت کی لہری دوڑ گئی۔ گھنٹوں فرش پر بیٹھنے سے جو تھکن اور اکڑن ہو گئی تھی اسے ہوا کی تازگی نے ختم کر دیا۔ میں منڈیر کے پاس کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور میری نظرس اس کپے راستے پر مرکوز تھیں جو آگے جا کر دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ درختوں کے جھنڈ نے ان دونوں راستوں کو اپنی آغوش میں سمیٹا ہوا تھا۔ یہ جو ویرانہ تھا سنسان پڑا ہوا تھا اور وہاں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ دور دور تک کسی آدم زاد کا نشان نہیں تھا۔ مجھے یہ پر سکون نظارہ بہت اچھا محسوس ہوا، اتنا اچھا تو جوئے میں رقم جیت کر بھی نہیں لگا تھا۔

میں چھت پر کوٹھی کے عقبی حصے کی جانب کھڑا تھا... دفعتاً اس گہرے سناٹے میں ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی بھاگتا ہوا چلا آ رہا ہو۔ پھر میں نے دیکھا کہ کوئی کوٹھی کی دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا ہے۔ دیوار کی وجہ سے میں فوری طور پر نہیں دیکھ سکا کہ وہ کون ہے۔ چند لمحوں بعد دوڑنے والا سامنے آیا تو میں ششدر رہ گیا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ ساڑھی میں ملبوس... اور اس کے پاؤں میں جہیل یا سینڈل نہیں تھے۔ وہ بد حواس سی ہو کر سر اسیممگی کے عالم میں بھاگتی ہوئی اس کپے راستے کی طرف جا رہی تھی جو آگے جا کر دو حصوں میں بٹ جاتا تھا۔ لڑکی کا لباس صاف بتا رہا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ گھرانے کی ہے۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آیا تھا مگر وہ چھریے اور مناسب جسمانی حالت تھی اس نے دوڑتے ہوئے جبارگی پلٹ کر دیکھا تو اس کا خوش نما چہرہ میری نظروں کے سامنے آئے۔ لڑکی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی، اس نے اپنے نہیں بلکہ اپنی عقبی سمت دیکھا

ڈسنے کے لیے تیار کھڑا ہو۔ اس کی پٹی پٹی سی اور بڑی بڑی حسین آنکھوں میں خوف و ہراس دیکھ کر مجھے اس پر بے حد ترس آیا۔ وہ اس خوف زدہ پرندے کی طرح سہمی ہوئی تھی جو کسی طوفان کی آمد سے پہلے اپنی موت کو سامنے محسوس کر رہا ہو۔ وہ درخت کے تنے سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور بڑی سرعت سے زمین پر گر اہوا ساڑھی کا پلو اٹھا کر شانے پر درست کر لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ لڑکی کا جسم ہولے ہولے لرزنے لگا ہے... وہ خود کو قابو میں رکھنے کی جدوجہد کر رہی ہے اور اس میں اسے کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ اس نے میری بات کا جواب دینے یا پھر کچھ کہنے کے لیے اپنے ہونٹوں کو حرکت دی تو آواز ہونٹوں کا ساتھ نہ دے سکی۔ آواز اس کے حلق میں جیسے پھنس کر رہ گئی ہو۔

میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے میری آنکھوں میں نہ جانے کیا بڑھا کہ اس پر بھائی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اڑنے کے لیے پر تولنے لگی۔ میں جیسے ہی قریب پہنچا وہ بجلی کی سی تیزی سے دائیں جانب دوڑ پڑی۔ جیسے آخر دم تک اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنا چاہتی ہو۔ میں بھی چوکس تھا۔ اسے زیادہ دور نہیں جانے دیا۔ لپک کر جلد ہی اسے جالیا۔ میں نے کلائی پکڑی تو اس نے خود کو چھڑانے کے لیے پورا زور لگایا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی طاقت کسی کام نہیں آ رہی تو اس نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ وہ ایک دم سے میرے ہاتھ پر بجلی مارے گاٹ کھائے لیکن میں نے فوراً "ی اس کی کلائی مروڑ دی۔ وہ درد کی شدت سے چیخ اٹھی۔" "اوہ... میں مری... میرا بازو۔"

"سنو احمق لڑکی!" میں نے غصے سے ڈانٹا۔ "سچ بتاؤ تم کون ہو؟"

"میرا نام نیلم ہے۔ میں ایک لڑکی ہوں۔" وہ بھولپن سے اتکا کر سکی۔

"اچھا تو تم لڑکی ہو۔" میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ "میں تو سمجھا تھا تم کوئی حسین چڑیل ہو۔"

"میرا ہاتھ چھوڑ دو۔" وہ کراہنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ درد کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔ "میری کلائی چیخ رہی ہے۔"

میں نے اس کی کلائی چھوڑی تو نہیں البتہ گرفت قدرے ڈھیلی کر دی۔ "جب تک میری باتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب نہیں دو گی... ہاتھ نہیں چھوڑوں گا۔"

"تم کون ہو؟ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" لڑکی کی آواز کانپ رہی تھی۔

"چاہو تو تم مجھے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھ سکتی ہو میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"مدد کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟" لڑکی تیز طرار معلوم ہوتی تھی "تم نے مجھے پکڑ کیوں رکھا ہے؟"

"اس لیے کہ تم سر پر پیر رکھ کر بھاگنے میں ماہر معلوم ہوتی ہو۔ ریس نہ لگانے کا وعدہ کرو تو کلائی چھوڑ سکتا ہوں۔"

"وعدہ کرتی ہوں کہ بھاگوں گی نہیں۔ تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"میں نے کچھ دیر پہلے تمہیں بدحواسی اور سرایتگی کے عالم میں دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔"

بارے میں جانتا تو ان کے کانوں پر جوں تک نہ رہتی۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اسی راستے سے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا جس پر لڑکی گئی تھی۔

"اوسر گپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں بہت محتاط ہو کر قدم اٹھا رہا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی میرے قدموں کی آہٹ پا کر بدحواس ہو جائے۔ میری آمد کا احساس ہونے پر وہ مجھے اپنا وہی دشمن سمجھتی جو اس کے تعاقب میں ہے حالانکہ میں کسی برے ارادے سے نہیں بلکہ اس کی مدد کرنے کی نیت سے جا رہا تھا میں صرف یہ جانتا چاہتا تھا کہ وہ یہاں کیوں چھپی ہوئی ہے۔ اگر وہ مظلوم ہوئی تو میری ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوں گی۔ اگر وہ کسی جرم کی مرتکب ہوئی ہے تب میں کیا قدم اٹھاؤں گا...؟ یہ میں اس وقت خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس کی کمزوری اور مجبوری سے میں ہلک بھی سکتا ہوں۔ میرے جوتے میرے ہاتھوں میں تھے اور آنکھیں اندھیرے میں ہر چیز کو گھور گھور کر دیکھتی ہوئی اس کو تلاشی کر رہی تھیں۔ چند قدموں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بائیں جانب کچھ فاصلے پر میں نے سورج کی روشنی دیکھی جو درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ میں اسی جانب بڑھ گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ لڑکی اسی طرف گئی ہوگی اور شاید آس پاس ہی کہیں چھپی ہوگی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ ایک درخت سے ٹپک لگائے کھڑی تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑے گی... اور بھاگ نکلے گی... مگر اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی۔ وہ اطمینان اور سکون سے کھڑی رہی۔ جیسے میری ذات سے اسے کوئی خطرہ نہ ہو اور اگر کوئی ایسی دیکھی بات ہوئی بھی تو وہ مجھ سے منٹ سکتی ہے۔ قریب پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ آنکھیں بند کیے لیے لیے سانس لے کر خود پر قابو پا رہی ہے۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رک گیا اور تنہائی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ چہرے کے نقوش بہت چمکے تھے رنگت زیادہ صاف نہیں تھی البتہ چہرے پر نمک کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس کے چہرے سے کہیں زیادہ پرکشش اس کی ہستی تھی۔ وہ نوجوان تھی۔ عمر بمشکل سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی۔ دوڑنے سے اس کا لباس قدرے بے ترتیب سا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے حواس میں آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چند لمحے تو میں سحر زدہ سا اسے دیکھتا رہا، پھر ایک دم ہوش میں آ گیا کہ یہ سب کچھ مجھے زیب نہیں دیتا۔ اس کے چہرے مبرے اور وضع قطع سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک معصوم سی لڑکی ہے۔ ایسے سلوانے سلوانے نازک نازک ہاتھ خنجر نہیں اٹھا سکتے، پتول نہیں چلا سکتے۔ یہ تو حیات نو بچتے ہیں۔ اس کا چہرہ تیار رہا تھا کہ وہ حالات کی ستائی ہوئی ایک پریشان حال لڑکی ہے۔

میں نے سوچا اس سے پہلے کہ لڑکی آنکھیں کھول کر دیکھے اور اس سنسان جگہ ایک اجنبی کو سامنے پا کر دہشت زدہ ہو جائے مجھے اس سکوت کو توڑ دینا چاہئے۔ میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے قدرے سخت اور بلند لہجے میں پوچھا "اے لڑکی! کون ہو تم؟"

میری آواز جیسے ہی اس کی سماعت سے ٹکرائی وہ آنکھیں کھول کر ایک دم سے اچھل پڑی۔ پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ دھلی ہوئی چادر کی طرح سفید پڑ گیا اور گلے کی رگیں کھینچ گئیں۔ وہ یوں دہشت زدہ ہو گئی جیسے اس کے سامنے کوئی انسان نہیں بلکہ کوئی ناگ چھن کاڑھے

ہو گئیں، وہ شخص اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔“
 ”کیا تم اس سے واقف ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔
 ”ہر شریف آدمی اسے اچھی طرح جانتا ہے بلکہ وہ اس کے دوستوں میں سے بھی ہو سکتا ہے۔ میں بھی ایک شریف آدمی ہونے کے ناطے اسے اچھا آدمی سمجھتا ہوں۔“
 ”وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ تم اس کی تعریف کر رہے ہو۔ کہیں تم اس کے دوست تو نہیں ہو؟“ وہ خائف سی نظر آنے لگی۔

”وہ تمہاری نظروں میں اچھا آدمی نہیں لیکن اسے جو عزت و شہرت اور مقام حاصل ہے وہ کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کو بھی حاصل نہیں ہو گا۔ حالانکہ وہ ملک کے بڑے اسمگلروں میں سے ایک ہے۔ شرفا اور روسا کے ہاں اس کا آنا جانا ہے۔ اس کی جیتی جاگتی مثال تم ہو۔ تم جیسی بڑے گھرانے کی لڑکی سے اس کے مراسم ہیں۔“ میں نے کچھ توقف کر کے کہا ”میرے ایسے نصیب کہاں کہ اس کا دوست بن سکوں۔ اس کا نام بہت سنا ہے۔ بد قسمتی سے آج تک شرف ملاقات سے محروم ہوں۔“

”وہ تصویریں ایسی نہیں ہیں جیسی تم سمجھ رہے ہو، لیکن وہ تصویریں میری شادی میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔“

میں اس کی بات کا کچھ مطلب سمجھا، کچھ نہیں سمجھا۔ تاہم میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ”کیا تم رستم خان سے محبت کرتی تھیں؟ اس کے ساتھ کھینچی ہوئی تصویریں ہیں؟“
 ”ہاں“ اس نے ندامت کے انداز سے سر جھکا لیا۔

”تو اس میں خوف زدہ اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اپنے شوہر کو بتا دینا کہ اس سے صرف محبت ہی کی تھی۔ محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔ پھر یہ شر اور اس کی فضا ہی ایسی ہے کہ لڑکے لڑکیاں جوانی کی دلچسپی پر قدم رکھتے ہی دل پھیلیوں پر لیے گھومنا شروع کر دیتی ہیں۔ رہی سہی کسروی سی آرنے پوری کر دی ہے۔“

”تم تو مجھ پر طنز کر رہے ہو۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”تم نے تو دوستی اور ہمدردی کا دعویٰ کیا تھا۔ پھر زخموں پر نمک کیوں چھڑک رہے ہو؟“

”ایک مخلصانہ مشورہ دے رہا تھا جس کا تم نے اتنا اثر لے لیا۔“ میں نے کہا ”کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ وہ کس انداز کی تصویریں ہیں؟“

”وہ... تصویریں کھینچواتے وقت ضرورت سے زیادہ شوخ ہو گیا تھا ان تصویروں کو دیکھتے ہی سب سے پہلا تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کسی رومانی فلم کے جذباتی مناظر ہیں۔“

”اردو فلم کے یا انگریزی فلم کے جذباتی مناظر؟“

پہلے تو اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر اس کے لبوں پر تبسم کی ایک جھلک نمودار ہوئی اور وہ ہنسا کر بولی۔ ”اردو فلموں کے سے۔“

”کل تہتی تصویریں ہیں؟“

تم یہاں آ کر کیوں چھپ گئی تھیں؟“
 ”چند بد معاش میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میں انہیں چکر دے کر ادھر آنکلی تھی۔“ وہ اپنی کلائی دباتے ہوئے بولی۔

”کیا وہ تمہیں کسی محلے سے اغوا کر کے یہاں لائے تھے یا تم یہیں کہیں رہتی ہو؟“
 ”نہ تو انہوں نے مجھے کہیں سے اغوا کیا ہے اور نہ ہی میں اس علاقے میں رہتی ہوں۔ بلکہ میں خود ان بد معاشوں کے پاس رستم خان کے گھر آئی تھی۔“
 ”وہ کس سلسلے میں؟“ میں نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔

”چوری کرنے کے لیے... مگر بد قسمتی سے میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی اور جان کے لالے پڑ گئے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر آئی ہوں۔“
 ”ایس...“ میں بھونپکا رہ گیا۔ ”کیا تم کوئی پیشہ ور قسم کی چور ہو؟“

”ایک مجبوری کی وجہ سے آج چور بھی بننا پڑا۔“ وہ بولی تو اس کے چہرے پر حزن و ملال ابھر آیا لہجے میں بڑی افسردگی تھی۔ ”بدترین حالات نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میں اپنے کیے کی سزا پارہی ہوں۔“

”تم رستم کے ہاں کیا جانے مئی تھیں؟“ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ”رقم یا ہیرے جو اہرات...؟“

”میرے پاس دولت اور ہیرے جو اہرات کی کمی نہیں۔ خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔“ وہ نظریں جھکا کر پلکیں جھپکاتے لگی۔ ”میرا ایک خط اور چند تصویریں رستم کے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں اڑانے لگی تھی۔“

”چند تصویر بتاؤ، چند حسینوں کے خطوط، جس کا مالک ہے، رستم خان۔“ میں نے شوخی سے کہا۔ ”حیرت ہے تم نے اسے ایک ہی خط لکھا۔“

”اس ایک ہی خط نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے رات دن کا سکھ چین غارت ہو کر رہ گیا ہے۔“

”اب عقل آئی۔ خط لکھنے سے پہلے یا لکھتے وقت سوچ لیا ہوتا!“
 ”بس بھول ہو ہی جاتی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں بادل چھا گئے۔ ”زندگی میں کبھی کوئی لمحہ ایسا بھی آتا ہے کہ عقل بالکل ہی کام نہیں کرتی۔“

”وہ تصویریں کیسی ہیں؟“ میں نے پوچھا ”قابل اعتراض تو نہیں؟“

”نہیں۔“ وہ میری بات کی تہہ تک پہنچ کر چونک گئی۔ ”کیا میں تمہیں کوئی ایسی دلی لڑکی دکھائی دیتی ہوں؟“

”آج کل ظاہر سے باطن کا پتہ چلانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”یہ نقابوں کا زمانہ ہے۔ ایسے نقاب جو نظر نہیں آتے۔ بہر حال وہ خط اور تصویریں کیسی ہیں جنہیں چرانے کے لیے تمہیں مجبور ہونا پڑا اور تم اپنی جان پر کھیل کر رستم جیسے بد معاش کے گھر میں داخل

کی طرح بہہ جائے گی۔
”کیا مطلب؟“

”قتل کے بعد وہ خط اور تصویریں کیسے اور کس طرح حاصل کرو گی؟“
”سانپ مر جائے تو ڈر کس بات کا؟“

”اس سانپ کی جگہ کوئی دوسرا سانپ لے لے گا اور تمہاری خوش گوار ازدواجی زندگی میں زہر گھولتا رہے گا۔“

”کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔“ وہ سر پکڑ کر درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

”اگر میں وہ خط اور تصویریں لا دوں تو مجھے اس کا معاوضہ کیا ملے گا؟“

”تم؟“ اس نے حیران ہو کر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا، پھر اس کے چہرے پر پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اتنے بڑے بد معاش سے وہ چیزیں کیسے حاصل کرو گے؟ دیکھنے میں تو تم ایک شریف مگر لاابالی قسم کی کوئی چیز دکھائی دے رہے ہو؟“

”عقل سے...!“ میں مسکرایا۔ ”میری وضع قطع اور چہرے میرے پر نہ جاؤ۔ میں ایک اعلیٰ و ارفع قسم کی چیز ہوں۔ تمہیں میری صورت سے مطلب ہے یا اپنی چیز سے؟“
”اپنی چیزوں سے۔“

”تو پھر تم مجھے اس کارنامے کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ بتا دو۔“

”چھ لاکھ روپے۔“ وہ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد بولی۔ ”اس سے زیادہ ادا کرنا میرے بس سے باہر ہے۔“

”سودا بالکل پکا ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔ ”بعد میں کوئی لیت و لعل تو نہیں کرو گی؟“

”کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟ کس طرح یقین دلاؤں تمہیں؟“

”حیثیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ بہر حال میں تم پر اعتبار کر لیتا ہوں، مگر میری ایک شرط ہے۔“

”کیسی شرط؟“ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سوالیہ بن گئیں۔ ”چھ لاکھ بھی لو گے اور شرائط بھی منواؤ گے؟“

”شرائط نہیں بلکہ اتنی سی شرط ہے کہ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ یعنی میں تمہارا خط اور تصویروں کا لفافہ تمہاری طرف بڑھاؤں گا تو تم بھی ایک لفافہ میری طرف بڑھاؤ گی۔ بلکہ نہیں بریف کیس۔ بریف کیس بڑے بڑے نوٹوں سے بھرا ہونا چاہئے۔“

”یہ بات تھی۔“ وہ ہنس پڑی۔ اس کے چہرے پر خوشی اور طمانیت بکھر گئی تو وہ مجھے اور حسین لگی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں دے دے سے جل اٹھے تھے... ”سودا نقد ہی ہو گا۔“

”چلو یہاں سے تو نکل چلو۔“ میں نے کہا ”شام سر پر آ رہی ہے پھر تاریکی ہو جائے گی تو...“

”تو کیا ہو گا، مجھے اندھیرے سے خوف نہیں آتا۔“

”بارہ... اس کے پاس صرف بیگیٹو ہیں۔ پرنٹ اس نے مجھے دے دیے تھے۔“
”اور اس خط کا مضمون کیا تھا؟“

”خط کا مضمون...؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ایک لمحہ توقف کیا اور پوچھا
”کبھی کسی لڑکی نے تمہیں کوئی خط لکھا ہے؟“

”کسی نے لکھا بھی ہو گا تو بہر حال مجھ تک نہیں پہنچ پایا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میری زندگی کے فارم کا یہ خانہ ابھی خالی ہے۔ معلوم نہیں وہ کون لڑکی ہو گی جو اس کی خانہ پری کرے گی، مگر آج کل خط و کتابت کہاں ہوتی ہے۔ یہ تو براہ راست رابطے کا دور ہے۔ مواصلاتی نظام اور ٹیکنالوجی کے دور میں کسے خط لکھنے کی فرصت ہے۔ ٹیلی فون کر دیا یا پھر کسی ہمارے ہوٹل میں یا کسی سنان جگہ ملاقات کر لی۔“

”اس خط میں دل کی باتیں لکھی تھیں۔ محبت بھرے خط کیسے ہوتے ہیں ان میں کیا لکھا ہوتا ہے، یہ وہی سمجھ سکتے ہیں جو محبت آشنا ہوتے ہیں۔“

”تم اس سے وہ خط اور تصویریں مانگ کیوں نہیں لیتیں؟“
”ایک بار نہیں کئی بار مانگیں۔ منت سماجت کی... گزرائی بھی لیکن اس ظالم کا دل موم نہ

ہوا۔“
”آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ کیا تمہاری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تمہیں اپنی منہی میں رکھنا

چاہتا ہے؟“
”نہیں“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ اس خط اور تصویروں کے عوض ایک بڑی رقم

مانگ رہا ہے۔“
”کتنی بڑی رقم؟“

”پچاس لاکھ۔“
”پچاس لاکھ؟“ میری شئی گم ہو گئی۔ ”کیا اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟“

”اس کا تو نہیں، البتہ اس نے میرا دماغ خراب کر رکھا ہے۔“ اس کا لہجہ ٹوٹا ٹوٹا سا تھا۔
”پچاس لاکھ تو بہت بڑی رقم ہے۔“ میں نے سرگوشی کی۔ ”اگر تم کسی بد معاش کو ایک

لاکھ روپے دے دو تو وہ رستم کا پتہ ہی صاف کر دے گا۔“
”کیا کوئی ایسا بد معاش ہے جو میرا کام کر سکے؟“

”ایک نہیں بہت ہیں۔ تم اسے ٹھکانے لگانے کے لیے کتنی رقم دے سکتی ہو؟“
”پانچ لاکھ۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم بہت بڑے باپ کی بیٹی ہو جب ہی وہ تم سے اتنی بڑی رقم کا مطالبہ کر رہا ہے۔“

”ہاں“ اس نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔
”مگر قتل کر دینے میں ایک قباحت ہے۔ تمہارا اصل مقصد پورا نہیں ہو گا اور رقم بھی پانی

آتی رہی ہوں۔ گزشتہ سال میں نے کالجوں کے دوڑ کے مقابلے میں بھی اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ لہذا میں دوڑ پڑی... لیکن محسوس ہوا کہ کھیل کے میدان میں دوڑنا زیادہ آسان ہے۔ یہاں تو پیر من من بھاری ہو رہے تھے۔ مرنے کی مانند کرتی، سر پر پیر رکھ کر بھاگتی رہی۔ وہ میرے تعاقب میں لگ گئے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ میں ان لوگوں کو چمکے دے کر اس دیرانے کی طرف نکل آئی۔ وہ سمجھے ہوں گے کہ میں کسی ہنگامے یا کوٹھی میں گھسی ہوں... یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ کیوں کہ ادھر آتے ہوئے میں نے کئی بار پلٹ کر دیکھا، لیکن کسی کو اپنے تعاقب میں نہ پایا۔ دور سے درختوں کا جھنڈ دیکھا تو مجھے یہ بہترین پناہ گاہ لگی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کچھ دیر یہاں چھپ کر رات کا انتظار کر لوں۔ رستم کے آدمی چھپے ہوئے اور ایک نمبری بد معاش ہیں۔ وہ شکاری کتوں کی طرح میری تلاش میں ہوں گے۔ لیکن وہ کب تک مجھے تلاش کرتے رہیں گے، تھک ہار کر لوٹ جائیں گے۔ یہ تھا میرا سارا قصہ۔

”تم واقعی ایک بہادر لڑکی ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ایک دہلی پتلی اور کمزور سی لڑکی...“

وہ میری بات کات کر بولی۔ ”جان پر بن جاتی ہے تو پھر... حوصلے سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو ایسے موقع پر روتی دیتی رہیں۔“

”شاباش“ میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ”کہا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ عظیم اور بہادر لڑکی کس باپ کی بیٹی ہے اور کہاں رہتی ہے؟“

وہ ستائش کے اس انداز پر مسکرا دی ”میں سرجن سراج الدین کی بیٹی ہوں اور پی ای سی ایچ ایس میں رہتی ہوں۔“

”سرجن سراج الدین“ میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”واقعی؟“

”کیوں میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے؟“

”اتنے بڑے باپ اور اتنے بڑے خاندان کی لڑکی کن چکروں میں پڑ گئی۔“ نیلم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ اس کے باپ سے کون واقف نہیں تھا۔ بچہ بچہ جانتا تھا۔ وہ ایک لائق اور ذہین ترین آدمی تھا۔ ملک کو اس پر بڑا ناز تھا۔ اس کی یومیہ آمدنی بے حساب تھی۔ ایک ایسے باپ اور خاندان کی لڑکی کا رستم جیسے بدنام زمانہ آدمی کے جال میں پھنسا، میرے لیے تعجب خیز تھا۔ لیکن آج کل کوئی چیز بعید نہیں تھی۔ لڑکیوں کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ وہ خوابوں میں کھو کر اپنے آپ کو تباہ کر لیتی ہیں۔ میں مناف میاں کی کوٹھی کے سامنے جا کر رکا۔ نیلم نے مجھے سوا لیہ نظروں سے دیکھا۔ ”یہ میرے دوست کی کوٹھی ہے۔ کچھ دیر یہاں آرام کر لو۔ جب تک تم منہ ہاتھ دھو کر اور چائے پی کر تازہ دم ہو جاؤ گی۔ اتنی دیر میں ٹیکسی آ جائے گی۔“

میں نے لڑکی کو چلی منزل کی نشست گاہ میں بٹھایا۔ اوپر گیا تو جوازوروں پر چل رہا تھا۔

”تمہیں نہیں آتا ہو گا لیکن مجھے بہت خوف آتا ہے۔ اندھیرے میں یوں بھی انسان اور شیطان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔“ میں نے کہا۔

”تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ساڑھی کی ٹانہیں دور کرتے ہوئے بولی۔ ”تم تو فرشتے لگتے ہو۔“

”مجھے انسان ہی رہنے دو۔ جس طرح کوئی فرشتہ انسان نہیں ہو سکتا، اسی طرح انسان بھی فرشتہ نہیں بن سکتا۔“

لڑکی نے مسکرا کر اپنے لمبے چمکیلے سیاہ بالوں کو پشت پر لہرایا اور چل دی۔ ہم درختوں کے جھنڈ سے نکل کر باہر آ گئے۔ سورج غروب ہونے میں بس چند ہی لمحوں کی دیر تھی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا ”تم گھر کیسے جاؤ گی۔ راستے میں ان بد معاشوں سے مدد بھڑھو گئی تو کیا کرو گی؟“

”کیا تم مجھے گھر تک بھی نہیں پہنچاؤ گے؟“ وہ چلتے چلتے رک گئی۔

”پہنچا دیتا ہوں۔“ میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”لیکن مجھے تمہے کہانیاں سننے کا بہت شوق ہے اس دوران تم وہ واقعہ ہی سنا دو جو کچھ دیر پہلے تمہارے ساتھ پیش آیا تھا۔“

”لڑکی نے شمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس طرف کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر اس ذلیل شخص کی ایک بڑی خوبصورت کوٹھی ہے۔ میں اس کوٹھی میں کئی بار جا چکی ہوں۔ وہاں ہر وقت تین چار ملازم موجود رہتے ہیں۔ جو ایک طرح سے محافظ ہیں۔ آج صبح فون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک دن کے لیے کسی کام سے لاہور گیا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ موقع اچھا ہے کیوں نہ

کسی طرح کوٹھی میں داخل ہو کر کسی تدبیر سے اس کی خواب گاہ میں پہنچ جاؤں۔ میرا خیال تھا کہ اس نے خط اور تصویروں کا لفافہ اپنی خواب گاہ میں چھپا رکھا ہو گا میں کوئی تین بجے کوٹھی میں داخل ہوئی اور کسی نہ کسی طرح اس کی خواب گاہ تک بھی پہنچ گئی۔ حالات اور اتفاقات نے میرا ساتھ

دیا۔ میرے خیال کے مطابق اس کے نوکر کھانا کھا کر گھری نیند سو رہے تھے۔ میں نے خواب گاہ میں پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ الماری اور میز کی تلاشی لی لیکن مطلوبہ چیز نہ مل سکی۔ پھر مجھے دیوار میں نصب ایک تجوری نظر آئی جو ایک بڑی تصویر کے پیچھے پوشیدہ تھی۔ اس پر اتفاق ہی سے

نظر پڑ گئی تھی یا یہ سمجھو کہ میرا شک مجھے اس کے قریب لے گیا تھا۔ میں وہ تصویر دیوار سے اتار دی تھی کہ وہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ تصویر کے فریم میں شیش لگا ہوا تھا۔ فرش پر گرتے ہی بڑے زور کا چھٹکا ہوا۔ رستم کے آدمی کچلی منزل پر پڑے سو رہے تھے۔ شور سن کر وہ

زینے کی طرف لپک پڑے۔ میں نے خوف زدہ ہو کر راہ فرار اختیار کی۔ کھڑکی میں گرل نہیں تھی۔ کھڑکی کے پاس ہی پائپ تھا جس کے ذریعے میں با آسانی نیچے اتر سکتی تھی۔ میں بدحواسی کے عالم میں

اس پائپ سے نیچے اتر گئی اور عقبی گیٹ سے باہر نکل ہی رہی تھی کہ ملازمین صوبت حال سمجھ کر عقبی حصے کی طرف پہنچ گئے۔ پھر ان میں سے کوئی چیخ پڑا۔ ”رک جاؤ“ ان میں سے کوئی بھی میرا چہرہ

نہیں دیکھ سکا تھا۔ میری پشت ان کی طرف تھی۔ آواز سن کر میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میرے لیے ہر لمحہ بے حد قیمتی تھا۔ میں نے دوڑ لگا دی۔ میں اپنے کالج میں چار سو میٹر کی دوڑ میں ہمیشہ اول

کی رائے قائم کرے گی۔ میں اسے اتنی جلدی اپنی ہنرمندی کے بارے میں بتانے سے گریز کر رہا تھا کہ نوکر نے آکر میری مشکل حل کر دی۔ "سکندر صاحب! ٹیکسی لے آیا ہوں۔"

"فرصت سے سوچنا کہ وہ کون سا ہنر ہو سکتا ہے!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ خط اور تصویریں کس طرح اس سے حاصل کر کے مجھ تک پہنچائیں گے۔ مجھے آپ دو ایک دن پہلے اطلاع دیں تاکہ میں رقم کا بندوبست کر لوں۔"

"یہ تو میں آپ کو کل ہی بتا سکوں گا۔ کل مجھ سے کہیں مل لیں۔"

"کہاں ملوں؟" وہ سوچنے لگی۔ "میرے گھر پر آجائیں میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"گھر پر نہیں۔" میں نے کہا "میں آپ کے گھر والوں کے سامنے گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔"

"بد قسمتی سے گھر والوں میں سے کوئی بھی گھر پر بلکہ اس دنیا میں ہی نہیں ہے۔" وہ ایک دم اداس ہو گئی۔ "میری دنیا میرے ڈیڑی ہیں۔ لیکن ان کے ہوتے ہوئے بھی میں اس دنیا میں اکیلی ہوں کیوں کہ وہ رات دن مریضوں کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں۔"

"مریضوں کے پیچھے یا دولت کے پیچھے؟"

"جو بھی سمجھ لیں۔ کل پانچ بجے گھر آجائیں۔ میں گھر پر اکیلی ہوں گی۔"

ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ نلیم نے ٹیکسی والے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بوہری بازار پر ٹیکسی روکے۔ ٹیکسی جیسے ہی نیو مارکیٹ پر رکی اس نے مجھ سے کہا "دو سو روپے ادھار دے دیں گھر چل کر لوٹا دوں گی۔"

میں نے جب سے فہنسے ہوئے نوٹ نکال کر پوچھا۔ "اس رقم کا کیا کرو گی؟"

"سینڈل خریدوں گی۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نہیں چاہتی کہ ننگے پیر گھر جاؤں اور ملازمین کے سامنے تماشوں۔"

بوہری بازار کے سامنے جہاں ٹیکسی رکی تھی اس کے سامنے جوتوں کی ایک بڑی سی دکان تھی۔ وہ مجھے ٹیکسی میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے اتری اور جلد ہی سینڈل خرید کر واپس آ گئی۔ وہ بھاگتے وقت اپنے سینڈل رستم کے ہاں چھوڑ آئی تھی۔ جب ٹیکسی سوسائٹی کی طرف جا رہی تھی تب اس نے مجھ سے کہا "آپ کیسے آدمی ہیں۔ جب میں کیا روپے اس طرح رکھے جاتے ہیں؟"

میں اسے کیا بتاؤں کہ یہ جوئے میں جیتی ہوئی رقم ہے جسے اسی طرح افزائش میں ٹھونسا پڑتا ہے۔ اسے جواب دے کر مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ لہذا میں نے اسے جواب دیا۔ "میں بچپن ہی سے بے پرواہ ہوں۔ روپے اسی طرح رکھتا ہوں۔ بڑا ہونے پر بھی یہ عادت نہیں چھوٹی۔"

"اس طرح تو جب کترے آپ کی جیب بڑی آسانی سے صاف کر دیتے ہوں گے؟" اس نے مجھے کسی بڑے آدمی کے سے انداز میں سمجھایا۔

"جب کترے" میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ "جیب کترے آسانی سے نوٹ نہیں نکال سکتے۔ ایک بار انگلی ڈالنے سے کوئی ایک ہی نوٹ نکال سکتا ہے۔ بار بار نوٹ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالیں گے تو کسی بھی لمحے مجھے پتہ چل سکتا ہے۔"

میں نے مناف میاں کو الگ لے جا کر مختصر "نلیم کی کہانی سنائی کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار سے مل کر جا رہی تھی کہ بد معاش اس کے پیچھے لگ گئے۔ میں اس کی جان بچا کر میاں لے آیا ہوں۔ وہ بچے بیٹھی ہے۔ بہت خوف زدہ اور پریشان ہے۔ میں اسے اس کے گھر پہنچا کر آتا ہوں۔ میں نے دانستہ اسے یہ نہیں بتایا کہ نلیم کون ہے اور کس کی بیٹی ہے۔ مناف میاں کو لڑکی سے زیادہ ٹال سے دل چسپی تھی۔ وہ بچے لڑکی کو دیکھنے تو نہیں آیا البتہ اس نے نوکروں سے کہہ دیا کہ لڑکی کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔

نلیم ہاتھ منہ دھو کر آئی تو اس کا سانولا چہرہ تر و تازہ دکھائی دے رہا تھا اور دمک رہا تھا۔ اس لمحے وہ مجھے اور اچھی اور حسین لگی۔ وہ اپنے خوف پر قابو پا چکی تھی۔ جب وہ چائے پی چکی تو میں نے ایک نوکر ٹیکسی لانے بھیج دیا۔ کچھ دیر سکوت رہا پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا میں اپنے محسن کا نام پوچھ سکتی ہوں آپ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟"

"میرا نام سکندر اعظم ہے۔ میں مقدر کا سکندر ہوں۔ کہاں رہتا ہوں...؟ یہ سوال کچھ عجیب سا ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ دھرتی میرا بستر ہے۔"

"بہت خوب۔" وہ ہنسی تو اس کے چہرے پر نکھار سا آ گیا۔ "آپ کیا کرتے ہیں... تعلیم حاصل کر رہے ہیں یا کہیں ملازمت کر رہے ہیں؟"

"میں ایک ہنرمند آدمی ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کے پندرہ سال اس ہنر میں مہارت حاصل کرنے کے لیے صرف کئے ہیں۔ پیدا تو میں کراچی ہی میں ہوا ہوں میں اسی ملک کا باشندہ ہوں مگر اپنے استاد محترم اور حالات کی چٹکی میں پسنے کی وجہ سے لاہور، پٹنہ کے علاوہ ہندوستان کے شہروں کلکتہ، دہلی اور بمبئی میں بھی پورے پانچ سال گزارنے پڑے۔ مشرقی پاکستان بھی میرا وطن عزیز رہا ہے۔ غرض کہ دنیا کی خاک چھان چکا ہوں۔ میرے لیے کوئی زمین اور کوئی قوم نئی نہیں ہے۔ وہاں کی بڑی بڑی درس گاہوں میں بڑے بڑے استادوں سے تربیت حاصل کی۔ خاک چھائی۔ میرے ہنر کو جلا ملی۔ جب میں اپنے ہنر میں طاق ہو گیا تو مجھے استاد دی گئیں۔ پھر میرے وطن کی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی۔ میں برسوں سے اپنے ہنر کے بل بوتے پر زندہ ہوں۔ خوش ہوں اور آسودہ زندگی گزار رہا ہوں۔"

نلیم میری تقریر کا ایک ایک لفظ بڑی توجہ، اشتہاک اور غور سے سنتی رہی۔ وہ مجھ سے مرحوب اور متاثر نظر آ رہی تھی۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ نے تفصیل سے اپنے بارے بتا دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سا ہنر ہے، کیا ٹیکنالوجی ہے؟"

وہ تم سے آپ کے مخاطب پر آ گئی۔ گویا اس کے دل کے کسی کونے میں میرے احترام کا جذبہ سراپا رہا تھا۔ لڑکی نے مجھ سے مخاطب کیا تو میں بہت خوش ہوا میں نے فوری طور پر اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ دراصل میں الفاظ ڈھونڈ کر موزوں ترین جواب دینا چاہتا تھا۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حوا کی اس بیٹی کو اپنے ہنر کے بارے میں کیسے بتاؤں۔ خدا جانے میری ہنرمندی کے بارے میں جاننے کے بعد اس کا رد عمل کیا ہو گا۔ یہ میرے بارے میں کس قسم

میں نے مناف میاں کے ہاں فلیش میں کوئی سات سو روپے کی رقم جیتی تھی جس میں سے میں نے دو سو روپے نیلم کو دیے تھے۔ جیتی ہوئی رقم کے علاوہ بھی چار سو روپے میرے پاس تھے۔ میں کئی دنوں تک ڈیوٹی سے غیر حاضر رہ کر بھی عیش کر سکتا تھا... کم از کم اس وقت تک جب تک کہ کیش میرے پاس موجود تھا۔ مجھے کوئی فکر بھی نہیں تھی... پھر چھ لاکھ کی رقم بھی تو میری قسمت کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اس کا تصور ہی بہت خوشگوار اور فرحت بخش تھا۔ مگر اس بات سے ذہن جھن رہا تھا کہ میں کوئی منصوبہ بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ چند بے حد قریبی دوستوں سے مشورہ کرنا چاہئے لیکن پھر میں نے ہر بات ذہن سے جھٹک دی۔

سب سے پہلے اچھی طرح سے کلین شیو کیا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے شام کو نیلم کے ہاں جانا تھا بلکہ روزانہ شیو کرنا میری عادت تھی۔ تیار ہونے کے بعد میں نے ناشتہ کیا تو بارہ بج چکے تھے۔ اچانک ہی میرے ذہن میں رستم سے نیلم کا خط اور تصویریں حاصل کرنے کی ایک نادر ترکیب بجلی کی طرح آئی اور میں اچھل پڑا۔ خوشی کی لہر میری نس نس میں سرایت کر گئی۔ میرا دل و دماغ خوشی سے سننا رہا تھا میں تصور میں چھ لاکھ کی رقم کو اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع کراتے ہوئے دیکھنے لگا۔ کیوں کہ رستم سے خط اور تصویریں حاصل کرنا اب میرے لیے کوئی مشکل مسئلہ نہیں تھا۔ میری ہنرمندی اس کام میں بہت مفید ثابت ہو سکتی تھی۔

شام کو نیلم کے ہاں پہنچا تو وہ بے چینی سے برآمدے میں ٹٹل ٹٹل کر میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس طرح خوش ہو گئی جیسے میں اس کے خوابوں کا شہزادہ رہا ہوں۔ میں اس کے خوابوں کا شہزادہ تو نہیں تھا البتہ اسے ایک خواب ناک زندگی کی کتنی دے سکتا تھا۔ اس نے مجھے اپنی آراستہ و پیراستہ نشست گاہ میں لے جا کر بٹھایا۔ پھر ایک خادمہ کو چائے کے لیے بھی کہہ دیا۔ خادمہ چلی گئی تو وہ بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد واپس آ کر اس نے میرے ہاتھ پر چار سو روپے رکھے تو میں نے اس کی طرف حیرت اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”دو سو روپے تو قرض کے ہیں اور دو سو ٹیکسی کا کرایہ۔“ اس نے وضاحت کی۔

میں نے دو سو کے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”کرایہ میں نہیں لوں گا۔ اس لیے کہ مجھے بھی تو اپنے گھر جانا تھا۔ یوں بھی کرایہ بچاؤ روپے ہی بنا تھا۔“

وہ جھل سی نظر آنے لگی۔ ”سکندر صاحب! پلیز مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔ آپ کا احسان میں ساری زندگی نہیں بھول سکتی۔“

”کیسا احسان؟“ میں نے تعجب خیز انداز سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ابھی تو میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا اور جو کچھ آپ کے لیے کروں گا وہ بھی احسان نہیں ہو گا۔ جس کام کا معاوضہ ادا کر دیا جاتا ہے بھلا وہ احسان کہاں رہتا ہے۔“

”یہ آپ کا احسان نہیں تو اور کیا ہے... کہ آپ مجھے بھاگتے دیکھ کر یہ سمجھے کہ کوئی بد معاش میرا پیچھا کر رہا ہو گا اور مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہو گی۔ آپ اپنی جان کی پروا نہ کرتے

”آپ کا فلسفہ میری سمجھ میں تو نہیں آیا۔“

ٹیکسی نیلم کے وسیع و عریض بچکے کے سامنے رکی تو وہ اتر کر بولی۔ ”اندر چلئے۔ چائے پی لیں اور اپنی رقم بھی لے لیں۔“

”کل...“ میں نے جواب دیا ”آج بہت تھک گیا ہوں۔ گھر جانا چاہتا ہوں۔ اجازت دیں۔“

”کل شام پانچ بجے۔“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر مجھے وعدہ یاد دلایا۔ ”میں انتظار کروں گی۔“

لیاقت آباد پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ الا عظم اسکوائر تک میں پیدل چلتا ہوا گیا۔ یاسین ہوٹل میں رات کا کھانا خوب سیر ہو کر کھایا۔ انور جزل سنور اینڈ بیکری سے ڈبل روٹی اور مکھن کی ٹکیہ خریدی۔ انڈے دکھائی دیے تو وہ بھی خرید لیے، پھر گھر گیا۔ میں نے نیلم سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ اگلے روز شام کو اس کے ہاں پہنچ جاؤں گا مگر میرے ذہن میں اس کا خط اور تصویریں حاصل کرنے کی کوئی ترکیب نہیں تھی۔ معلوم نہیں کس رو میں، میں نے اس سے کہہ دیا تھا لیکن اب اسے رستم جیسے ضیث آدمی سے نجات دلانا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا مجھ میں لاکھ برائیوں کے باوجود یہ اچھی عادت تھی کہ میں جو وعدہ کرتا ہوں اسے ضرور پورا کرتا ہوں۔ میں نیلم سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کئی ترکیبیں سوچیں... مگر ان پر عمل کرنا بہت مشکل تھا۔ رستم سے ٹکر لینا آسان نہیں تھا۔ وہ ایک بڑے گروہ کا سرغنہ تھا۔ اس کے ایک اشارے پر میری ٹکا ہوئی کر کے دریا برد کر دیتا اس کے لوگوں کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بار بار میرے جی میں آ رہا تھا کہ اس معاملے سے ہاتھ کھینچ لوں۔ کوئی غریب لڑکی ہو تو اس کے لئے شاید ہمدردی میں کچھ کر گزرتا... لیکن نیلم جیسی دولت مند لڑکی کو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ دولت کے بل بوتے پر کسی کی بھی خدمات حاصل کر سکتی ہے... یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیلم اپنے اداس سراپا کے ساتھ میرے تصور میں مجسم ہو گئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اس دنیا میں تنہا ہے۔ اس کا اداس چہرہ مجھے بے چین کر گیا... پھر وہ رقم جو اس کام کے عوض مجھے مل سکتی تھی، میرے ذہن میں گھوم گئی۔ لال لال نوٹ... جنہیں ہاتھ میں لیتے ہی رنگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اور جن پر نظر ڈالتے ہی آنکھیں روشن سی ہو جاتی ہیں۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ انعام کی رقم بہت بڑی ہے۔ یک مشت اتنی بڑی رقم کسی اور کام میں ہاتھ نہیں لگ سکتی۔ چھ لاکھ کسی بھی آدمی کے لیے معمولی نہیں ہوتے۔ پھر مجھ جیسے آدمی کے لیے تو یہ بہت بڑی رقم تھی۔ میرے ان گنت خواب پورے ہو سکتے تھے۔

میں ساری رات رستم سے وہ خط اور تصویریں حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے منصوبے بناتا رہا۔ مگر ڈھنگ کی کوئی ترکیب میرے ذہن میں نہ آئی۔ سوچتے سوچتے آنکھ کب گھٹی، مجھے پتہ بھی نہ چلا اور جب آنکھ کھلی تو دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ آج میں نے ڈیوٹی پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اس غیر حاضری سے مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔ میری جیب نوٹوں سے بھری ہوئی تھی...

ہے لیکن اس نے کوئی ایسی بات نیلم سے کہہ دی تھی کہ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ اس نے ریسیور رکھ کر اپنی پشت صوفے سے نکالی اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے ایک گھرا سانس لے کر دوسرے ہی لمحے آنکھیں کھول دیں۔

”کیا کہا تھا اس غیبت نے؟“

”وہ تیار تو ہو گیا ہے لیکن اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے پولیس سے مدد لینے کی کوشش کی تو اس کا بال بیکا نہیں ہو گا اور وہ انتقام مجھے نہیں بلکہ میرے ڈیڑی کو قتل کر دے گا۔“

نیلم نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”اب مجھے کیا کرنا ہے۔“

”میرے ساتھ چل کر ایک بریف کیس خریدنا ہے۔“

”وہ کس لیے؟“

”اس لیے کہ اس بریف کیس میں تم وہ چھ لاکھ روپے رکھ کر لاؤ گی جو مجھے ادا کرنا ہیں۔“

”لیکن رستم نے خط اور نیگیٹو کا لفافہ دے دیا تو اسے رقم کہاں سے دوں گی؟“

”پہلے تو اس سے کہنا کہ وہ تمہیں ایک نظر خط اور نیگیٹو دکھائے۔ جب وہ دکھائے گا تو اطمینان کر کے لفافہ اسے واپس کر دینا اور کہنا کہ تمہاری کار میں رقم کا بریف کیس موجود ہے باہر چل کر بریف کیس لے لے اور اطمینان کر کے تمہاری چیزیں تمہیں دے دے۔ وہ تیار ہو جائے گا۔ جب وہ ہوٹل سے باہر آئے گا اور پارکنگ میں تمہاری کار کے پاس پہنچے گا تو گڑگڑا کر کہنا کہ فی الحال میں چھ لاکھ کا بندوبست کر سکی ہوں۔ باقی رقم اسے دو تین قسطوں میں پہنچا دوں گی۔ وہ یہ رقم لے کر تمہاری چیزیں تمہیں دے دے اور تم پر اعتماد کرے کہ تم...“

”وہ میری بات نہیں مانے گا اور مجھے سے بچ و تاب کھاتا ہوا چلا جائے گا۔“

”میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ نیلم کے چہرے پر گہرا استعجاب بکھر گیا۔ دوسرے لمحے وہ کسی خیال کے زیر اثر خوف زدہ اور متحیر دکھائی دینے لگی۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ جیسے ہی وہ باہر آئے گا آپ اس پر حملہ کر دیں گے اور اس سے وہ لفافہ لے کر فرار ہو جائیں گے؟“

”معلوم ہوتا ہے کہ جاسوسی ناول بہت پڑھتی ہو۔“

”کہیں آپ کا منصوبہ قتل و غارت گری کا تو نہیں ہے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں ہنس پڑا۔

”آپ چھ لاکھ کے لیے اسے قتل کر دیں گے؟“

”لوگ چھ روپے کے لیے بھی قتل کر دیتے ہیں۔ یہ تو چھ لاکھ روپے ہیں۔“

”مگر آپ نے یہ بھی سوچا کہ رستم کو قتل کرنے کی صورت میں آپ بھی زندہ نہیں رہیں گے اور قتل کر دیے جائیں گے۔“ وہ تشویش سے بولی۔

ہوئے میری مدد کو پہنچے۔ پھر تھائی اور میری بے بسی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور مجھے حفاظت سے گھر پہنچا دیا۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میری لاش ہی وہاں پڑی ملتی۔“

نیلم بہت سنجیدہ اور جذباتی ہو گئی۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔ ”اگر آپ کو کبھی میری مدد کی ضرورت پڑی تو مجھے اپنا دوست ہی پائیں گے۔ مجھے آپ کے کسی کام آکر بہت خوشی ہو گی۔“

”یہ دنیا بڑی مطلبی ہے۔ بعد میں کون کسی کو پوچھتا ہے؟“

”ایسا نہ کہئے سکندر صاحب! خدا کے لیے میرے بارے میں ایسا نہ سوچیں۔ میں ساری زندگی آپ کے احسان تلے دبی رہوں گی۔“

”اچھا اب اصل بات کی طرف آئیے۔ احسانات کا حساب کتاب تو بعد میں ہوتا رہے گا۔ ذرا ٹیلی فون ادھر لے کر آئیں۔“

نیلم اٹھی اور اسٹینڈ سے فون اٹھا کر میرے سامنے والی تپائی پر رکھ دیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ”میں جیسا کہوں گا آپ ویسا ہی کریں گی۔“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میرا ایک ایک لفظ غور سے سنو“ میں نے آپ جناب کا تکلف برطرف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”رستم خان واپس آ چکا ہے۔ اسے فون کرو اور اس سے کہو کہ کل شام ٹھیک پانچ بجے گلشن میں واقع روماریستوراس میں وہ خط اور تصویروں کے نیگیٹو لے کر پہنچے اور تم دس لاکھ روپے لے کر وہاں پہنچ رہی ہو۔“ رقم کا سنتے ہی نیلم کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے چہن ہو رہی تھی لیکن میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس سے کہنا کہ تم بار بار بلیک میل ہونے کی بجائے ایک ہی بار ادائیگی کر کے معاملہ ختم کر دینا چاہتی ہو۔ نیز تم اس سے کسی کہیں، کمرے یا سنان مقام پر نہیں مل سکتیں۔ وہ کسی وجہ سے کہیں یا کمرے ہی میں ملنے پر اصرار کرے گا۔ لیکن تم صاف کہہ دینا کہ اگر اسے رقم چاہئے تو اسی صورت میں اور اتنی ہی مل سکتی ہے ورنہ وہ جو چاہے کرے۔ اس کے بعد نہ تو تم اسے کوئی رقم دو گی اور نہ ہی وہ خط اور تصویروں کے نیگیٹو خریدو گی۔ چاہے وہ تمہیں اور تمہارے باپ کو بدنام ہی کیوں نہ کرنا شروع کر دے۔“

”مگر سکندر صاحب!“ جیسے ہی میں نے بات ختم کی وہ مضطرب ہو کر بولی۔ ”میں اسے رقم ادا نہیں کرنا چاہتی اس کے علاوہ دس لاکھ کا بندوبست کہاں سے کروں گی؟“

”پہلے تم اسے فون کر کے جو کچھ میں نے کہا ہے وہ کہہ کر تو دیکھو۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”وہ راضی ہو جائے تو بتاؤں گا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔“

نیلم کو کچھ تردد ما ہوا۔ پھر اس نے بادل خواستہ ریسیور اٹھا کر رستم کا نمبر ملایا ان دونوں میں چند لمحے تک گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے نیلم کے چہرے اور گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ آمادہ ہو گیا

مجھے بچے سے اوپر دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔ ”میرے یار تو تو روزِ بروز جوان، سارٹ اور وجیہ ہوتا جا رہا ہے۔ میری بات مان لے تو تجھے کسی فلم میں ہیرو کا چانس دلا دوں۔ قسم سے سکندر! تجھ جیسا وجیہ ہیرو فلمی دنیا میں نہیں ہے۔ انہیں بسیار خوری نے فریہ اور بھدا بنا دیا ہے۔“

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”دوست مجھ پر رحم کرو میں جیسا ہوں، جہاں ہوں، وہیں اچھا ہوں۔“

”تم بہت دنوں بعد آئے ہو یار۔ کہاں تھے اب تک؟ آئے کیوں نہیں... تمہاری بھالی اور بچے تمہیں یاد کرتے ہیں۔“ وہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

”مصرفیت کچھ زیادہ رہی۔ ایک سال ڈھاکہ میں رہ کر آیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تمہارے پاس اس لیے نہیں آتا کہ تم ایمان خراب کرنے والی اور ہلکی ہلکی باتیں کرتے رہتے ہو۔“

”اچھا...“ وہ میرے سینے پر مکا مارتے ہوئے بولا۔ ”اگر میں کسی نوجوان کو فلمی دنیا میں چانس دلانے کا وعدہ کروں تو وہ کسی پالتو جانور کی طرح میرے ہاتھ پاؤں چاٹتا پھرے گا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ آج کیسے راستہ بھول پڑے؟“

”مجھے تم سے ایک کام آ پڑا ہے اور وہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔“

”کیا تمہارا کام تمام کرنا؟“ اس نے شرارت سے پوچھا۔

”جو مزاج یار میں آئے۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ اور اسے اپنی ملاقات کا مقصد

بتایا۔

میری بات سن کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”مگر کیوں؟“

”اس لیے کہ حقیقی دنیا کے اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہوں لیکن تمہاری مدد کے بغیر نہیں کر سکتا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ؟“

میں نے اسے مختصر طور پر اپنے منصوبے کے بارے میں بھی بتا دیا۔ وہ میرا بہت مخلص دوست تھا مگر میں نے اسے چھ لاکھ کی رقم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جو اس منصوبے کی کامیابی کے بعد حاصل ہونے والی تھی۔

”تم ایسا کرو کہ کل تین بجے یہاں آ جاؤ۔ کل بھی ہمارے پروڈکشن کی شوٹنگ نہیں ہو رہی ہے۔ میں چھٹی پر ہوں۔ گھر پر مطلوبہ سامان موجود ہے۔ تم ایک ٹیک کام کرنے جا رہے ہو لہذا میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔“

”شکریہ دوست“ میں نے ممنونیت سے کہا۔ ”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“

”غصہ... رات کا کھانا کھا کر جانا۔ تمہیں گھر کا کھانا کہاں نصیب ہوتا ہو گا۔“

”کھانا کل آ کر کھاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس منصوبے میں مجھے اپنے چند دوستوں سے

مدد لینا ہے۔ اس وقت ان کے پاس جاؤں گا۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ”جناب متحمل مجھے کیسے اور کس طرح قتل فرمائیں گے؟ جب کہ وہ عالم بالا کی سیر کر رہے ہوں گے۔“

”وہ نہیں، اس کے ساتھی۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ ”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ رسم تنہا آئے گا۔ وہ کہیں بھی جاتا ہے تو مسلح ضرور ہوتا ہے اور ساتھی اس کی دم سے بندھے رہتے ہیں۔ وہ سب مسلح ہوتے ہیں۔“

”دیکھو مس نیلم... جو کچھ تم سے کہا ہے وہی کرو اس موقع پر اس خاکسار کو جو معرکہ انجام دینا ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہے۔ تم خاموش تماشائی بنی رہنا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس معرکے میں ایک قطرہ خون بھی نہیں بے گا۔ کسی کو خراش تک نہیں آئے گی۔“

”ج! وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔ ”اگر ایسا ہو گا تو کسی معجزے سے کم نہیں ہو گا۔“

نیلم کی خادمہ کسی قدر لجاتی ہوئی ٹرائل میں چائے اور بسکٹ لے کر آ رہی تھی۔ ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ خادمہ میز پر برتن سجانے لگی تو نیلم نے مجھ سے پوچھا کہ ”سکندر صاحب! آپ نے کس کالج سے گریجوایشن کیا ہے؟“

”ابھی گریجوایشن کیا تو نہیں مگر جلد ہی کرنے والا ہوں۔ ویسے اسلامیہ کالج کا طالب علم رہ چکا ہوں۔“

خادمہ چلی گئی تو نیلم نے کھڑے ہو کر میز پر چلنے کی دعوت دی۔ چائے کے دوران وہ میرے بارے میں تجسس رہی لیکن میں بڑی خوب صورتی سے اس کے سوالوں سے اپنا دامن بچاتا رہا۔ چائے پی کر ہم بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔

نیلم کے پاس بہترین قسم کی کار تھی۔ ہم اس کار میں بوہری بازار پہنچے۔ ایک دکان سے نیلم نے بریف کیس خریدا۔ میں نے اس بریف کیس کے نمبر سیٹ کر کے نیلم کو دے دیا۔ بوہری بازار سے نکل کر میں نے نیلم کو گھر جانے کے بہانے رخصت کیا۔ وہ مجھے میرے گھر تک لفٹ دینا چاہتی تھی، مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ مجھے بھی اپنے منصوبے کے سلسلے میں کچھ کام کرنا تھا۔ جیسے ہی نیلم کی کار نظروں سے اوجھل ہوئی میں نے بوہری بازار سے ویسا ہی ایک بریف کیس اور خریدا۔ اس کے بھی وہی نمبر سیٹ کیے جو نیلم کے بریف کیس کے تھے۔ اس کے بعد میں نے عزیز برادرز سے اپنے ٹاپ کا ایک سفاری سوٹ خریدا۔ ایک اسٹیشنری کی دکان سے چند مختلف رنگوں اور سائز کے لفافے لئے اور رکشے کے ذریعے ناظم آباد پہنچا۔ وہاں میرا ایک دوست عقیل احمد رہتا تھا جو فلم اسٹوڈیوز میں کسی میک اپ مین کا معاون تھا۔ دروازے پر دستک دیتے ہی اس کی سب سے بڑی بیٹی بیلا نے دروازہ کھولا۔ جو نو دس سال کی تھی۔ میں کوئی تین چار سال بعد عقیل سے ملنے گیا تھا۔ بیلا نے اس کے باوجود بھی مجھے پہچان لیا۔ وہ تازہ کی طرح لمبی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔

عقیل کے کھانے کے لیے سبزی ترکاری لینے گیا ہوا تھا۔ فلم کی شوٹنگ اتنی ہو جانے کی وجہ سے اسٹوڈیوز نہیں آیا تھا۔ جب وہ بازار سے لوٹا تو مجھے دیکھ کر خوشی سے لپٹ گیا۔ پھر

چال میں جلی سی لڑکھاہٹ۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے مجھ پر ایک اجنبی سی نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔

میں جلد بازی میں کھیل بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر میں نیلم کے پیچھے ہونٹل میں داخل ہو جاتا تو رستم یقیناً مجھ پر شک کرتا۔ میں نے اس شخص کے بشرے سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اڑتی چڑیا کے پر گن سکتا ہے۔ اس لیے میں نے نیلم کی طرف توجہ نہیں دی۔ ٹاول خریدنے کے بہانے میں ہونٹل سے متصل کتابوں کی دکان پر جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک انگریزی کے ٹاولوں کے سرورق دیکھتا رہا پھر اپنی چمڑی کے سارے کسی کمزور بوڑھے کے سے انداز میں ہونٹل میں داخل ہو گیا۔

ہال کا سرسری جائزہ لینے پر میری نظر ان دونوں پر پڑی جو ایک پر سکون گوشے میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے آس پاس کی بہت سی میزیں خالی پڑی تھیں... ہال تقریباً "خالی ہی تھا" البتہ تین چار نوجوان جوڑے مختلف میزوں پر بیٹھے راز و نیاز میں مصروف تھے۔

پھر میری نظر نیلم پر پڑی تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ وہ رستم کے ساتھ میز پر بیٹھی والمانہ انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ جیسے سارے گلے شکوے مٹ گئے ہوں اور رستم کی شخصیت نے اسے مسخر کر لیا ہو۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ دونوں آپس میں خج اور تند گفتگو کر رہے ہوں گے، فضا میں کشافٹ کھلی ہوئی ہو گی، ہونٹل کا ماحول کشیدہ سا لگ رہا ہو گا، مگر یہاں تو بساط ہی ایسی پڑی تھی۔ میں حیران و پریشان بچی بچی نظروں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رستم نے نیلم کو پرتاناز کر دیا ہے۔ اسی لیے نیلم کا غصہ، حقارت اور نفرتیں جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں ہیں۔ اب اس کی غلافی آنکھوں میں رستم کے لیے محبت کے چراغ جل رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں، پھر خیال آیا کہ ڈراپ سین تک رکنا چاہیے۔

وہ رستم سے باتوں میں ایسی کھوئی ہوئی تھی جیسے اسے دنیا و مافیہا کی کوئی فکر ہی نہ ہو۔ اس نے مجھے ہال میں ایک بار بھی تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ میری طرف نگاہ کرتی تو میں اشارے سے اسے اپنی شناخت کراتا اور منصوبے پر عمل کرنے کے لیے کہتا لیکن اسے تو کسی بات کی فکر نہیں رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ وہاں کسی منصوبے پر عمل کرنے نہیں آئی۔

میری اعلیٰ شخصیت سے متاثر ہو کر چند ہیروں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ ہر ایک کی غیر محسوس یہ کوشش تھی کہ میں اس کی میز پر جاؤں۔ وہ ٹپ کی فکر میں کھل رہے تھے۔ میں وہاں چائے پینے نہیں بلکہ کسی ڈرامائی عمل کے لیے گیا تھا اور اپنے منصوبے کے مطابق ایسی کسی میز کا انتخاب کرنا چاہتا تھا جہاں بیٹھ کر ان دونوں کو اپنی نظر میں رکھ سکوں۔ کچھ دیر بعد میں نے ایسی میز کا انتخاب کر لیا۔ اور ہیروں کو چائے کا آرڈر دیا۔

معلوم نہیں کیوں مجھے الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر باہر چلا جاؤں۔ مگر کوئی غیر مرئی طاقت مجھے روکے ہوئے تھی۔ میں چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتا ہوا ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ دونوں چائے پیتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور میں ہونٹوں کی طرح انہیں تک رہا تھا۔

عقیل نے بادل خواست مجھے اجازت دے دی۔

دوسرے دن پانچ بجے کے قریب روماریستوراں سے نصف فرلانگ کے فاصلے پر میں اپنے دوست توحید کی کار سے اتر گیا۔ پھر اسے ضروری ہدایات دے کر خراماں خراماں چلتا ہوا ریستوراں کی طرف گیا۔ اس وقت میرے ایک ہاتھ میں چمڑی تھی اور دوسرے میں پائپ تھا۔ میں نے جو سفاری سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا، وہ بے حد قیمتی اور عمدہ تراش کا تھا۔ میرے چہرے کو سفید داڑھی نے نصف سے زیادہ چھپا لیا تھا۔ اس سفید داڑھی میں میں کہیں کہیں سے کالے بال بھی جھانک رہے تھے۔ سر پر ہیٹ بھی تھا۔ ظاہری وضع قطع سے میں کوئی اعلیٰ افسر لگ رہا تھا۔ اس وقت مجھے نیلم تو کیا نیلم کے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے تھے۔ جب عقیل نے میرا میک اپ کیا تھا تو میں خود کو نہیں پہچان سکا تھا۔

ریستوراں میں داخل ہونے سے پہلے میں نے پارکنگ لاث کا جائزہ لیا۔ وہاں نیلم کی کار تلاش کر رہا تھا۔ لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ اسی دوران ایک شاندار اور نئے ماڈل کی مرسدیز پارکنگ لاث میں آکر رکی۔ اس کے پیچھے دو کاریں اور تھیں۔ وہ دونوں پرانے ماڈل کی تھیں۔ مرسدیز کی عقبی نشست پر جو آدمی بیٹھا تھا، وہ بہت نفیس قسم کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اسے میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ رستم تھا۔ اسٹار، بلیک میلر اور درندہ صفت مگر بارعب اور متاثر کر دینے والی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسحور کر دینے والی قوت تھی۔ وہ کار سے کسی جزل کے سے انداز سے اترتا اور اسی انداز سے چلتا ہوا ریستوراں میں داخل ہو گیا۔ ان دو پرانی کاروں میں آٹھ آدمی تھے۔ جن کے چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خون آشام بھڑے ہیں۔ بے رحم اور سفاک... جنہیں انسانوں پر رحم نہیں آتا۔ انہیں دیکھ کر کوئی بھی اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا تھا۔

رستم کی کار کا ڈرائیور باوردی تھا، مگر ان دونوں کاروں کے ڈرائیور سادہ لباس میں تھے۔ ڈرائیوروں کے سوا باقی تمام افراد کاروں سے نکل کر چاروں طرف بکھر گئے۔ وہ بڑے مستعد اور چوکس دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی پھولی ہوئی جیبوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مسلح ہیں۔ ڈرائیور اپنی اپنی نشستوں پر چوکنا بیٹھے تھے۔ جیسے کوئی غیر متوقع افتاد آن پڑے تو اس کا سامنا کر سکیں۔

میں ان لوگوں کا جائزہ لیتا ہوا آہستہ آہستہ ریستوران کی طرف بڑھ رہا تھا کہ نیلم کی کار تیزی سے آتی دکھائی دی۔ اس نے اپنی کار پہلے والی کاروں کے پیچھے کھڑی کی۔ اس کی کار ایک ولیمین کی وجہ سے چھپ گئی تھی۔ اس نے کار سے اتر کر دروازہ لاک کیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ چرمی پرس تھا۔ جب وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی تو رستم کے ساتھی اسے تھما دیکھ کر اطمینان کی سانس لے رہے تھے۔ پھر وہ اپنی اپنی کاروں میں جا بیٹھے۔ نیلم ان آدمیوں کو دیکھ کر کھٹکھٹکی جیسے آواز سنانے لگا۔ بھر وہ بے پروائی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ وہ (ظاہر) مسلمان ہے مگر اس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہے اور

رستم مجھ سے یوں معذرت طلب کرنے لگا جیسے یہ واقعہ اس کی غلطی سے پیش آیا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے میری چالاکی کو محسوس نہیں کیا۔ میں کسی بوڑھے کے انداز میں ہانپ رہا تھا جیسے میلوں پیدل چل کر... وہاں تک آیا ہوں۔ رستم کی معذرت کے جواب میں میں نے صرف ہاتھ ہلانے پر اکتفا کیا، اور ایک قریبی کرسی پر گر گیا۔ پھر میں نے چھڑی کے اشارے سے ایک ہیرے کو قریب بلایا اور اسے ایک گلاس پانی لانے کی ہدایت کی۔

یہ دیکھ کر کہ میرے جسم میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی ہے، لوگ اپنی اپنی میزوں کی طرف بڑھ گئے اور نیلم و رستم نکاس کے دروازے کی طرف جانے لگے۔ ہیرے نے مجھے پانی کا گلاس لا کر دیا جسے میں نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ میں نے بال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تو محسوس ہوا کہ وہ سب مجھ سے جہاز ہیں... ہونا بھی یہی چاہئے تھا کیوں کہ وہ سب راز و نیاز میں مصروف تھے اور میں نے ہنگامہ آرائی کر کے ان کے کیف میں خلل ڈالا تھا۔

میں نے اپنے حواس بحال کیے اور ہیرے کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ جو میری میز پر متعین تھا۔ بل ادا کرنے اور طشتی میں شپ کی رقم چھوڑنے کے بعد میں نکاس کے دروازے کی طرف گیا تو مجھے نیلم اور رستم پارکنگ لائٹ میں گھٹگو کرتے دکھائی دیے۔ اس وقت وہ لوگین وہاں سے غائب تھے جو کچھ دیر پہلے نیلم کی کار کے آگے کھڑی تھی۔ نیلم نے منصوبے کے مطابق کار کا پچھلا دروازہ کھول کر عقبی نشست سے ایک بریف کیس اٹھایا اور اسے رستم کی طرف بڑھایا، پھر بولی۔ ”اسی میں چھ لاکھ ہیں۔ خط اور تصویریں میرے حوالے کر دو باقی رقم میں دو یا تین قسطوں میں ادا کر دوں گی۔“

رستم بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا، نیلم کا جملہ سن کر یوں ٹھک گیا جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ اس نے دانت پیس کر اسے کچھ کہا جسے میں سننے سے قاصر رہا، مگر اس جملے کا رد عمل نیلم کے چہرے پر دیکھ لیا تھا۔

نیلم کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ رستم نے اس پر ایک زہریلی نگاہ ڈالی اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ پھر شاید اس نے ڈرائیور کو کار اشارت کرنے کو کہا۔ نیلم بریف کیس لے کر اس کی طرف دوڑی۔ وہ ملتجیانہ انداز میں کچھ کہہ رہی تھی۔ منصوبے کے مطابق وہ رحم کی بھیک مانگ رہی تھی اور رقم کی ادائیگی کے لیے مہلت مانگ رہی تھی۔ مگر رستم پر اس کی لجاجت کا ذرا بھی اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس کی التجاؤں کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔

پھر ڈرائیور نے کار اشارت کر دی اور وہ زائیں سے پارکنگ لائٹ سے نکل گئی۔ اس کے پیچھے وہ دونوں کاریں نکلی تھیں جن میں اس کے گرگے بیٹھے تھے۔ نیلم دل شکستہ انداز میں اس کار کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی، پھر ایک گہری سانس لے کر اپنی کار کی طرف بڑھی۔ اچانک وہ کسی خیال کے تحت ٹھٹھکی اور اس نے گرد و پیش پر نگاہ دوڑائی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ اسے میری جستجو ہے۔ مگر میں اس وقت ایک سنگی ستون کی آڑ میں تھا۔ اس لیے اسے نظر نہ آ

تقریباً” میں منٹ بعد نیلم ایک دم سجدہ ہی ہو گئی۔ اس نے رستم کی طرف جھک کر کچھ کہا تو وہ چونک پڑا پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے درمیانے سائز کا سفید لفافہ نکالا، اسے کھول کر ایک خط برآمد کیا اور اس خط کو اس طرح مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے اسے خطرہ ہو کہ نیلم اسے جھپٹ کر بھاگ نہ جائے یا اسے پھاڑ کر نہ پھینک دے۔ پھر اس نے وہ خط نیلم کے سامنے لہرایا۔ جب نیلم نے وہ خط لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے معذرت سی کی اور خط کو نہ کر کے بائیں ہاتھ میں دبا لیا۔ نیلم جھل سی ہو کر رہ گئی۔ پھر رستم نے نیلم کی طرف لفافہ بڑھایا تو اس نے لفافہ فوراً ہی رستم کے ہاتھ سے لے لیا۔

نیلم نے لفافے سے نیگیٹو نکالے اور ایک ایک کر کے انہیں روشنی میں دیکھا۔ اس کے بعد وہ نیگیٹو رستم کو لوٹا دیے۔ رستم نے وہ نیگیٹو دوبارہ لفافے میں ڈال دیے اور اس کے ساتھ خط رکھ کر اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

اس نے اپنے اطمینان کی خاطر جیب کو تھپتھپایا، پھر نیلم کی طرف جھک کر کچھ کہا۔ اس کا نیلم پر فوری رد عمل ہوا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر رستم نے ہیرے سے بل طلب کیا۔ وہ بل کی ادائیگی کے بعد اٹھنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ میں نے اس سے پہلے اپنی میز چھوڑ دی۔ میں فرش پر چھڑی مارتا ہوا کاؤنٹر کی طرف اس انداز سے بڑھا جیسے فون کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس دوران میں نے ہیرے کو ایک اشارہ کیا۔

کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ میں ان کی مخالف سمت سے گزروں۔ بھروسہ آگے آئے تو سب کچھ میرے منصوبے کے مطابق ہوا۔ جیسے ہی وہ میرے سامنے آئے اور انہوں نے قریب سے گزرتا چاہا میرا دایاں پاؤں اچانک قالین سے الگہ گیا... کچھ اس طرح سے کہ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر رستم پر گرا۔ رستم اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھا لہذا خود کو نہ سنبھال سکا۔ ہم دونوں فری اشاکل پہلو انوں کی طرح ایک دوسرے سے ختم گئے۔ فرش پر گرے۔

رستم بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ میں چوں کہ ایک بوڑھے اور ناتواں شخص کے میک اپ میں تھا لہذا میں نے اپنی اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے فوری طور پر اٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔ میری چھڑی نیلم کے قدموں میں پڑی تھی۔ میں اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں کئی بار لڑھک چکا تھا۔ یقین کیجئے اگر وہ کسی فلم کا منظر ہوتا تو مجھے بہترین اداکاری کے آسکر ایوارڈ سے نوازا جاتا۔

ہم فرش پر کیا لڑھکے کہ ہوٹل میں بھونچال سا آگیا۔ جیسے کسی نے ساکت سطح آب پر پتھر کھینچ مارا ہو۔ وہاں جتنے افراد بیٹھے تھے تقریباً” وہ سب پک کر ہماری جانب آئے رستم تو از خود کھڑا ہو چکا تھا۔ لوگوں نے مجھے سارا دے کر کھڑا کیا۔ نیلم نے چھڑی اٹھا کر مجھے پیش کی۔ ایک ٹانے کے لیے ہماری نگاہیں چار ہوئیں مگر وہ اب بھی مجھے نہ پہچان سکی۔ اس کی آنکھوں میں ششاسانی کی کوئی لر نہیں ابھری۔ جب کہ میں نے اسے اشارہ بھی کیا تھا۔

اس کی کار نظر آئی۔ سڑک پر اچھی خاصی روشنی تھی اس لیے اسے مجھے بچانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس کی کار کے مائز چرچائے اور وہ مجھ سے ایک فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والا دروازہ کھولا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ نیلم نے تمہید ہانڈے بغیر مجھ پر اپنا نزلہ اتارنا شروع کر دیا۔ ”کہاں تھے آپ؟ اور کہاں گیا آپ کا منصوبہ؟ آج تو آپ نے مجھے خوب ذلیل کرایا، رستم کے ہاتھوں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ وہ مجھے ایک نئی دھمکی دے کر گیا ہے۔“

”میں تمہارے بہت قریب تھا۔“ میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ ”یہ الگ بات ہے کہ تم نے محسوس نہ کیا ہو۔“

”اور وہ منصوبہ کہاں میا؟“ نیلم تک کر بولی۔ ”آپ نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟ آپ میرے قریب تھے؟ مگر میں نے تو آپ کو کہیں نہیں دیکھا۔ آپ تو درکنار وہاں تو آپ کا سایہ تک نہیں تھا۔“

”میں تمہارے قریب تھا اور میں نے طے شدہ منصوبے پر عمل بھی کیا ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”خاک عمل کیا ہے۔“ اس نے پھر کر کہا یہاں کھڑے ہاتھ ہلا رہے ہیں اور دعویٰ یہ کہ آپ نے منصوبے پر عمل کیا ہے۔“

”یہاں کھڑا ہاتھ ہلا رہا ہوں اور ہوٹل کے فرش پر ٹھکنا پھر رہا تھا۔ شاید وہ تم ہی تو تھیں جس نے مجھے چھڑی اٹھا کر پیش کی تھی۔“

”ت... تو... تو آپ تھے؟“ فرط حیرت سے وہ ہکھلانے لگی اور اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”جی ہاں۔ یہ وہی خاکسار ہے۔“ میں نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ یا پھر اس خاکسار کی روح تھی۔“

”اوہ میرے خدا۔“ اس نے تحیر سے کہا۔ ”آپ کا میک اپ اور میٹ اپ کس قدر شاندار تھا۔ میں تو ایک لمحے کے لیے بھی آپ کو نہ پہچان سکی۔“

”عزت افزائی کا شکریہ۔“

”لیکن وہ روپ دھارنے سے کیا حاصل ہوا؟“ اس نے مستفربانہ انداز میں کہا۔

”ایک قیمتی لٹافہ“ میں نے اپنی جیب سے ایک لٹافہ نکال کر اس کے سامنے لرایا۔

”لٹافے کا نگاہ پڑتے ہی وہ اچھل پڑی۔ اس کی حیرت دیدنی تھی۔“ ”یہ... یہ... آپ کو کیسے ملا؟ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی وہ۔“ فرط مسرت سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”تم جیسی بے قیمتی کا شکار ہو، رستم بھی اسی کیفیت میں مبتلا ہو گا۔ ہوٹل کے ڈائٹنگ ہال میں تو اسے اپنی جیب ہلکی ہونے کا احساس نہیں ہوا ہو گا۔“ میں نے کہا۔

”م... مگر آپ کا لباس اور میک اپ؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”کا۔ وہ مایوس ہو کر اپنی کار میں بیٹھ گئی۔

مجھے یقین تھا کہ میں زیادہ دیر تک وہاں اتنے اطمینان سے کھڑا نہیں رہ سکتا۔ کسی بھی لمحے رستم وہاں آندھی طوفان کی مانند لوٹے گا اور مجھے اذیت ناک انداز میں ہلاک کر دے گا۔ اس خیال کے پیش نظر میں اس سنگی ستون کی آڑ سے نکلا اور مالٹی کی بھاڑیوں کی اوٹ لے کر پارکنگ لاٹ کے آخری اور تاریک حصے میں پہنچ گیا۔ وہاں میرا دوست توحید کار لے کر میرا منتظر تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر خود کو عقبی نشست پر گرایا اور توحید کے شانے پر تھکی دی۔

توحید نے کار اشارت کی اور وینڈ اسکرین پر نظرس جماتے ہوئے پوچھا۔ تمہاری اداکاری کیسی رہی؟ کسی کو شبہ تو نہیں ہوا؟“

”نہیں“ میں نے خود کو شاباش دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنا رول خوبصورت انداز میں نبھایا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ عقل کی بات مان لوں اور واقعی فلموں میں کام کرنا شروع کر دوں۔

اس سال نہیں تو آئندہ سال اکیڈمی ایوارڈ مل ہی جائے گا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو“ توحید بخیرگی سے بولا۔ ”قلم کی یہ نسبت حقیقی زندگی میں اداکاری کرنا زیادہ مشکل ہے۔ کوشش جاری رکھو۔ کبھی نہ کبھی ایوارڈ چوری کی نگاہ میں ضرور آ جاؤ گے۔“

”تکو اس بند کرد“ میں نے اس کی گدی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اچھا کام انجام دے لیا؟“

”ہاں“

”کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟“

”کام چنگی بجاستے ہی ہو گیا۔“ وہ گمن انداز میں بولا۔

میری ہدایت کے مطابق اس نے کار ایک زیر تعمیر عمارت کے قریب روک دی۔ وہ جگہ سنان تھی اور دور تک کوئی آدم یا آدم زاد دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پھرتی سے اپنا لباس تبدیل کیا اور واٹھی نوچ کر سیٹ کے نیچے ڈال دی۔ عقل نے کوئی کیمیکل لگا کر میرے بال سفید کیے تھے اور ساتھ میں توڑ بھی دے دیا تھا کہ میں جب چاہوں اپنے بال سیاہ کر لوں۔

میں نے اس کیمیکل کو بالوں پر لگایا تو حیرت انگیز طور پر میرے بال سیاہ ہو گئے۔ میں نے کنگھا نکال کر دوسرے انداز سے بال بنائے۔ اس بدلے ہوئے روپ کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں ہوٹل روم میں پایا جانے والا وہی کمزور سا بوڑھا ہوں۔ جو فرش پر ٹھکنا پھرتے کھانے کے بعد از خود نہیں اٹھ پا رہا تھا جس کی کمر میں کوڑھ لٹکا ہوا تھا اور جو چھڑی کا سہارا لے کر چل رہا تھا۔

یہ تبدیلی بہت تیزی سے عمل میں آئی تھی اور میں دوبارہ جوان رعنا بن گیا تھا۔

توحید کو میں نے وہاں سے کھسک لینے کا اشارہ کیا۔ وہ کار لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں سڑک پر بازو پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور آنے جانے والی کاروں کو رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔

چند کاریں رکیں اور ان کے بریک چرچائے مگر میں نے مخالف سمت میں ایسی جگہوں پر جانے کے لیے لفٹ مانگی کہ انہیں معذرت کرتے ہی بنی۔ دراصل مجھے نیلم کی کار کا انتظار تھا۔ دس منٹ بعد

”اور تم... تم سے آپ کے مخاطب پر“ اس نے پستول سے میرے سر کا نشانہ لیا۔ میں پانچ تک گنتی ہوں۔ لفاظ دے دو ورنہ...”

”یہ سراسر بے ایمانی ہے“ میں نے احتجاج کیا۔ ”ہمارے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ شملہ معاہدے کی طرح تو نہیں تھا۔“

”ایک... دو... تین...“ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ انتہائی سرد اور سفاک لہجے میں گنتی گنتے لگی۔ وہ واقعی سنجیدہ تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا وہ محض دھمکی نہیں دے رہی ہے اور اپنی بات کو عملی جامہ پہنا کر رہے گی۔

سڑک سنسان تھی۔ دور دور تک کسی شخص کا سایہ تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے بڑی بے بسی سے اسے دیکھا مگر اسے مطلق رحم نہ آیا۔ جیسے ہی اس نے... چار... کہا ویسے ہی اس کے چہرے پر درندگی ابھر آئی۔ اب اس کے ”پانچ“ کہنے کی دیر تھی۔ اس نے پانچ کہہ کر اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا ہی تھا کہ میں نے چیخ کر کہا۔ ”ٹھہرو“

اس کا ہاتھ فضا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ وہ اس قدر چوکس تھی کہ میری کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ مرنے کا کیا نہ کرتا۔ میں نے جیب سے لفاظ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور مردہ لہجے میں بولا ”مس نلیم آپ سو فیصد متا فحے میں رہیں۔ چھ لاکھ بھی ہضم کر گئیں۔“

”کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔“ وہ میرے ہاتھ سے لفاظ لیتے ہوئے بولی۔ ”کیا چھ لاکھ کوئی معمولی رقم ہوتی ہے؟“

”میں صرف آپ ہی کو نہیں دنیا کی ساری عورتوں کو بے وقوف سمجھتا ہوں۔ اگر عورت میں عقل ہوتی تو اس دنیا کا وجود کبھی برقرار نہ رہتا۔ یہ کب کی ختم ہو گئی ہوتی۔ خدا ابھی بیچتا ہوتا کہ اس نے عورت کو عقل جیسی نعمت سے کیوں سرفراز کیا۔“ میں نے توقف کر کے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بائیں ہاتھ سے پرس کھول کر لفاظ اس میں رکھ رہی تھی۔ مگر اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کا رخ بدستور میری جانب تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لمحات غفلت اسے موت کے منہ میں پہنچا دے گی۔ جب اس نے لفاظ اپنے پرس میں رکھ لیا تب میں نے کہا۔ ”آپ نے وعدہ خلائی کر کے غفلت کی کا نہیں بد دیا تھی کا ثبوت دیا ہے۔ بد دیا تھی کا انجام اچھا نہیں ہوتا... پھر آپ نے اس شخص کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے جس نے جان کی بازی لگا کر رستم جیسے خطرناک شخص سے لفاظ حاصل کیا۔ چھ لاکھ مجھ جیسے غریب کے لیے بہت بڑی رقم ہے۔ اس سے میرے دن پھر سکتے ہیں۔ آپ کے لیے چھ لاکھ کی رقم...“

”ٹھٹ اپ۔“ وہ گرجی۔ ”کیو اس بند کرو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔“

”میں اتنی دور پیدل کیسے جاؤں؟“

”ٹھٹے ہوئے۔“ اس نے پستول فضا میں لہرایا۔ ”یہ بریف کیس دوبارہ اسی جگہ پر رکھ دو“ اور ہاں مجھ پر بریف کیس پھینکنے کی کوشش نہ کرنا۔ ایسے مناظر صرف فلموں ہی میں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔“

”اتارنے میں دیر نہیں لگتی البتہ عہدہ قسم کا میک اپ کرنے میں ضرور دیر لگتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا لائیے یہ لفاظ مجھے دے دیجئے۔“ اس نے بے قراری سے لفاظ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”تمہیں یاد نہیں کہ ہمارے مابین ایک معاہدہ بھی ہوا تھا۔ کہ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔“

”آپ کی ہدایت کے مطابق بریف کیس میں رقم موجود ہے۔“ اس نے کار کی عقبی نشست کی طرف اشارہ کیا۔

”مگر میں رقم کے سلسلے میں اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میرے استاد نے صیحت فرمائی تھی کہ ناگن اور عورت پر بھولے سے بھی بھروسہ نہ کرنا“ دونوں ہی دس لیتی ہیں۔“

اس کا چہرہ خفیر سا ہو گیا۔ وہ مرے مرے لہجے میں بولی۔ ”بریف کیس کھول کر دیکھ لیں۔“

میں نے جیسے ہی بریف کیس کھچلی نشست سے اٹھا... کر اپنی گود میں رکھا۔ اس نے بڑی سرعت سے اپنا چری پرس کھولا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا اس نے پرس میں سے پستول نکال کر مجھ پر تان لیا۔ اس کے چہرے پر سفاکی ابھر آئی اور آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ گرگٹ کی طرح بدل رہی تھی۔ پھر اس کے لبوں پر زہر میں بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے حکمانہ لہجے میں کہا۔ ”لفاظ میرے حوالے کر دو۔“

میں نے خوش دلی سے طر کیا۔ ”کیا اب آپ کو میرے استاد محترم کی بات کا یقین آ گیا؟“

”ہاں“ اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”اب آپ کو بھی یقین آ جانا چاہئے کہ انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔“

”اچھا ہی ہوا۔ وہ یہ دن دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے۔“ میں نے مرد آہ بھری۔

”باتیں نہ بناؤ۔ جلدی کرو۔ لفاظ میرے حوالے کر دو۔“ اس کے ہاتھ کی گرفت پستول پر مضبوط تھی۔ انگلی لمبی پر تھی... میں نے محسوس کیا کہ وہ پوری طرح اپنے حواس میں ہے۔ اس کا پستول سے کھینچنے کا پہلا تجربہ نہیں ہے۔

”اور اگر میں لفاظ تمہارے حوالے نہ کروں تو...؟“

”تو پھر میں تمہارا بیچھا اڑانے سے بھی دریغ نہیں کروں گی۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

”مگر یہ تو عام رہ گزر ہے اور گاڑیاں دندباتی ہوئی گزرتی رہتی ہیں۔“

”مگر اکا دکا“ وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”پھر یہ سوچنا تمہارا نہیں میرا کام ہے۔“

”یعنی آپ... آپ سے تم کے مخاطب پر آ گئیں۔“

”اس لیے کہ یہ وہ نیگیٹو نہیں ہیں جن کے لیے تم پریشان تھیں۔ ان میں تمہارا ایک بھی مطلوبہ نیگیٹو نہیں ہے۔ تم نے مجھے بے وقوف بنانے کے لیے یہ ڈرامہ کھیلا تھا... بلکہ یہ کتنا مناسب ہو گا کہ اپنا آلہ کار بنایا تھا اور وہ خط تو کسی اور...“

”تو تم نے اتنی جلدی نیگیٹو دیکھ لیے اور خط بھی پڑھ لیا؟“ اس نے درشتی سے پوچھا۔
اس کا مطلب ہے تم نے شناخت کر لیا ہو گا کہ یہ کس کے نیگیٹو ہیں اور خط کس کا ہے۔ میں اب ان چیزوں سے اتنا فائدہ اٹھاؤں گی کہ رستم کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا۔“

”گویا آپ نے اسی لیے اتنا لمبا چکر چلایا۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر رستم کے ہاں ڈاکا ڈالنے مئی تھیں۔“

”تم واقعی ذہین ہو لیکن تمہاری ذہانت اب دو کوڑی کی بھی نہیں رہی۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگی۔

”میری ذہانت کیسی ہے! اس کا اندازہ جلد ہی ہو جائے گا۔ اس وقت میں جو بے بس سا ہو گیا ہوں اس میں میری ذہانت کا نہیں بلکہ میری دیانت داری کا قصور ہے کہ میں نے آپ جیسی بے ایمان لڑکی پر اعتبار کر لیا۔ جو ایک بڑے باپ کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی دولت کے جنون میں مبتلا ہے۔ کس ایسا نہ ہو کہ یہ جنون آپ کو موت کی آغوش میں لے جائے۔“

”یہ لیکچر بازی بند نہیں کرو گے؟“ وہ دھاڑ کر بولی... ”گاڑی سے اتر جاؤ ورنہ میری انگلی ٹریگر پر دب جائے گی۔“

”میں دڑواہ کھول کر نیچے اترا تو میری نظر دور سے آتی ہوئی مرسلہ پر پڑی جو یقیناً“ رستم کی تھی۔ اس کی کار کے پیچھے اس کے آدمیوں کی کاریں بھی تھیں۔ ان کی رفتار بیٹ طیاروں کی مانند تھیں۔ میں نے اس سمت اشارہ کرتے ہوئے نیلم سے کہا۔ ”لو وہ دیکھو! وہ تمہارے سابقہ عاشق نامراد آ رہے ہیں۔“

نیلم نے عقبی آئینے میں دیکھا تو اسے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔ لو کی ایک ایک ہوند جیسے نچوڑی گئی ہو۔ پھر اس کا جسم دہشت سے لرزے لگا۔ وہ گڑگڑاتے ہوئے بولی۔ ”سکندر صاحب! پلیز خدا کے لیے میری مدد کیجئے۔ یہ چھ لاکھ لے لیں۔ کسی نہ کسی طرح خط اور نیگیٹو ان کے ہاتھ نہ لگتے دیں۔ اگر آپ نے یہ لفاظ بچا لیا تو میں آپ کو مزید...“ وہ پرس کھولنے لگی۔

”مگر میری ذہانت تو دو کوڑی کی بھی نہیں رہی۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ میں نے طنزیہ کہا۔

”میں تو آپ سے مذاق کر رہی تھی۔“ اس نے پرس سے لفاظ نکال کر جواب دیا۔
”حسینوں کے مذاق کے انداز بھی کیا خوب ہیں۔ میں شاعر تو نہیں ہوں۔ ایک شعر کا مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔ ہماری جان مئی آپ کی ادا ٹھہری۔“

”میں آپ کی منت کرتی ہوں ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں فوسہ تر ہوتی ہے۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے میرا ذہن پڑھ کر میرا ارادہ کیسے بھانپ لیا تھا۔ میں نے بغیر چون چرائیے اس کے حکم کی قیل کی اور بریف کیس کو پچھلی نشست پر رکھ دیا۔ پھر میں نے اس کی جانب پلٹ کر کہا۔ ”رستم یا اس کے آدمی آتے ہی ہوں گے۔ لہذا مجھے اپنے ساتھ لے چلے۔“

”وہ لوگ واپس کیوں آئے گئے؟“ اس نے چونک کر دریافت کیا۔

”خط واپس لینے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ رستم جب اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے گا تو لفاظ غائب ہو گا۔ تب وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ آپ نے ایک منصوبے کے تحت اس کی جیب سے وہ لفاظ اس ہڑسے کے ذریعے اڑا لیا ہے جو ہال میں اس سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ آپ کی تلاش میں نکل پڑے گا۔ لفاظ غائب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر دس لاکھ کی چوٹ پڑی ہے۔ یہ کڑی چوٹ وہ کیسے برداشت کرے گا۔ وہ تو آپ کو راستے ہی میں گھیر لے گا اور لفاظ کے ساتھ ساتھ یہ بریف کیس بھی لے جائے گا جس میں چھ لاکھ کی رقم موجود ہے۔“

نیلم میری بات سن کر پریشان ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ پھر ہاتھ کپکپایا تو پتہ چل گیا کہ لڑنے لگا۔ میں نے جو اندیشہ ظاہر کیا تھا وہ اپنی جگہ درست تھا۔ رستم کسی درندے کی طرح دھاڑتا ہوا پلٹ سکتا تھا۔ دوسرے لمحے وہ سنبھل کر بولی۔ ”تم مجھ سے نئی چال چل رہے ہو تاکہ مجھے خوف زدہ کر کے رقم پر قبضہ کر لو۔ میں تمہارے چکر میں نہیں آؤں گی۔“

”آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ تجربے کی بنا پر کہا ہے۔ آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتیں میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے۔“

”اس شرم میں گھاٹوں کا جال بچا ہوا ہے۔ یقیناً“ تم نے ہر گھاٹ کا پانی پیا ہو گا۔“

”میری بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ ایسی تصویریں ہیں جن کے لیے رستم اپنی جان کی بازی لگا سکتا ہے۔“

”تصویریں میرے ہاتھ لگ جانے کے بعد وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ اگر اس نے تصویریں دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو میں انہیں آگ لگا دوں گی۔“

”پھر ٹیک کام میں دیر کس بات کی۔ کیا میں ماچس پیش کر سکتا ہوں؟“ میں نے اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا۔

”خبردار! زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔“ اس نے ہاتھ فضا میں بلند کر کے نشانہ لیا۔

”تمہیں ان تصویروں کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر ان تصویروں کو آگ لگانے کی ضرورت پیش آئی تو میں انہیں رستم کے سامنے جلا کر اسے بھی جلاؤں گی۔ وہ جل کر مرنا چاہے گا تو بھی نہیں مر سکے گا۔“

”مگر تم اس خط اور نیگیٹو کو کبھی نہیں جلاؤ گی۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”تم نے یہ رائے کیسے قائم کر لی؟“ وہ چونکی۔

کے سامنے لہرایا۔ ”اس کی قیمت دس لاکھ ہے۔ مفت کا مال نہیں ہے۔ تم جب اور جس وقت چاہو قیمت ادا کر کے یہ لٹافہ حاصل کر سکتی ہو۔ میری پیشکش برقرار رہے گی۔“ اس نے لٹافہ جیب میں رکھ لیا۔ پھر اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے کار کا دروازہ کھول کر نیلم کا بریف کیس نکال لیا۔ رستم نے کار سے اتر کر کہا۔ ”میں پہلی قط لے جا رہا ہوں۔ بتایا اقساط ادا کر کے لٹافہ لے لینا اور ہاں! دوبارہ میرے ہاں ڈکیتی کی کوشش نہ کرنا“ اور نہ ہی لٹافہ حاصل کرنے کے لیے کوئی منصوبہ بنانا۔ یہ لٹافہ ہے تو بہت چھوٹا سا... مگر بے حد قیمتی ہے، بلکہ سونے کی کان ہے۔“

نیلم تو اس طرح چپ بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس کی زبان پر قانع کر گیا ہو۔ اگر سینے میں سانپوں کا غلام نہ ہوتا تو میں سمجھتا اس کی روح پرواز کر چکی ہے۔ رستم نے زور سے کار کا دروازہ بند کیا۔ جیسے ہی مجھ پر اس کی نظر پڑی، اس نے جیب سے پرس نکال کر اسے کھولا اور سو کا ایک نوٹ میری جانب پھینکا۔ ”یہ تمہارا انعام ہے۔ اسے رکھ لو۔ اگر تم بیگم صاحبہ کی کار روک کر ملازمت نہ مانگتے تو شاید میری چیزیں مجھے کبھی واپس نہ ملتیں۔ اگر تمہیں ملازمت چاہئے تو کسی دن ڈینس سوسائٹی آکر کسی سے بھی رستم کا نام پوچھ لینا۔ تمہیں میرے گھر کا پتہ مل جائے گا۔“

رستم اور اس کے ساتھی جیسے ہی اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر واپس ہوئے نیلم دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میں بجلی کی سی تیزی سے کار میں جا بیٹھا اور نیلم کا شانہ زور سے ہلا کر کہا۔ ”دیکھو! یہ رونے کا وقت نہیں ہے جلدی سے کار اشارت کرو۔ جتنی تیزی سے کار چلا سکتی ہو چلاؤ۔ کسی ایسی جگہ چلو جہاں ہم چند گھنٹے روپوش ہو سکیں۔“ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ ہڈیانی انداز میں بولی۔ ”آپ یہاں سے دفع ہو جائیں۔ اب کیا کرنا ہے، بھاگ کر۔ وہ لٹافہ بھی لے گیا اور بریف کیس بھی“

”جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔“ میں نے غصے سے اس کا ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھ دیا۔ ”اگر وہ واپس آیا تو پھر یہاں تمہاری لاش ہی نظر آئے گی۔“

”وہ کس لیے؟“ اس نے ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”وہ مرے ہوئے کو مار کر کیا کرے گا؟“

”ہاتھوں میں وقت برباد نہ کرو، ورنہ میں نتیجے کا زخمہ دار نہیں ہوں۔ یہاں سے چلو اور کسی جگہ چل کر خود کو محفوظ کر لو تو میں سب کچھ بتا دوں گا۔ حقیقت کچھ اور ہے۔“

نیلم نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ پھر اس نے کار اشارت کر دی۔ چند لمحوں بعد کار فرارے بھر رہی تھی گو وہ بڑی احتیاط سے کار چلا رہی تھی۔ پھر بھی کار بے قابو سی ہو رہی تھی۔ دو ایک بار تو ہم حادثے سے بال بال بچے۔ اس نے دفعتاً مجھ سے کہا ”قربیب ہی ہمارا ایک بھگہ خالی پڑا ہے۔ وہ برائے فروخت ہے۔ کیوں نہ وہیں چلیں۔“

”کیا رستم اس بھگہ کے بارے میں جانتا ہے؟“

”نہیں“ اس نے جواب دیا۔

”آپ آل راؤنڈر ہیں خوب کھیلتی ہیں۔“

”سکندر صاحب خدا کے لیے مذاق نہ کیجئے۔“

”سچ ہے کہ انسان نہ صرف خطا کا پتلا ہے بلکہ غرض کا بھی پتلا ہے۔ کبھی مجھے آپ کا جا رہا ہے تو کبھی تم اور کبھی سکندر صاحب۔ اس طرح میں بھی تمہیں آپ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ تم وعدہ کرتی ہو کہ یہ چھ لاکھ کی رقم میری ہے صرف میری؟“

”جی“ اس نے غلٹ سے سر ہلایا۔ ”وہ تو سر پر آپیچھے... اب کیا کریں؟“

”میرے... صرف میرے۔“ میں نے کہا۔ ”میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ تم اپنا وعدہ پورا کرنا۔“

اور ہاں انہیں کسی قیمت پر نہ بتانا کہ وہ بوڑھا آدمی میں تھا، ورنہ میں تمہیں بھی لے مروں گا۔ وہ کل تین کاریں تھیں۔ ان کاروں نے نیلم کی کار کو اس طرح حصار میں لے لیا کہ فرار کا کوئی راستہ نہ رہا۔ رستم اپنی کار خود ہی چلا رہا تھا۔ باقی دونوں کاروں میں وہی بد محاش تھے، جو ہوٹل پر رستم کے ساتھ آئے تھے۔ ان دونوں نے پلک جھپکتے میں کاروں سے نکل کر ہم دونوں کو زونے میں لے لیا۔ ان کے ہاتھوں میں خنجر اور ریو اور چمک رہے تھے۔ رستم نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف ہٹایا۔ پھر تیز و تند نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کون ہو تم؟“

”ایک بے روزگار آدمی ہوں صاحب۔“ میں نے کہا۔ بیگم صاحب سے ملازمت مانگ رہا تھا۔ دو سال سے بے روزگار ہوں۔“

”بہت خوب۔“ رستم کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”تم نے ملازمت حاصل کرنے کا یہ اچھا طریقہ سوچا ہے۔ ملازمت نہیں ملی، مال تو مل جاتا ہو گا۔ لڑکیوں اور عورتوں کو دھکا کر رقم وصول کرتے ہو۔ چلو بھاگو یہاں سے۔“

میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ رستم کار کا دروازہ کھول کر نیلم کے پاس بیٹھ گیا۔ نیلم کی حالت کسی لاش سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ رستم نے مکروہ مسکراہٹ سے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر اعلیٰ ملازمتوں کی مالک بھی ہو۔ آج میں تمہاری ذہانت کا قائل ہو گیا۔ تم نے کتنی خوبصورتی سے مجھ جیسے آدمی کو بے وقوف بنا دیا اور لٹافہ بھی اڑا لیا۔“

میں نے سوچا مجھے احتجاج کرنا چاہئے۔ میرا سارا کریڈٹ نیلم لے جا رہی تھی۔ بیشک سے چھوٹوں کے ساتھ ایسی نا انصافیاں ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ میں دل موس کر رہ گیا۔

”وہ کون عظیم پاکت مار تھا؟ میں اسے کچھ انعام دینا چاہتا ہوں۔“ رستم نے مجھے غائبانہ خراج تحسین پیش کرتے ہوئے پوچھا۔

”نیلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس پھٹی پھٹی منہ پر آنکھوں سے پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھتی رہی۔“

”میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ رستم نے ہاتھ بڑھا کر نیلم کے ہاتھ سے پرس چھین لیا۔ نیلم نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ رستم نے پرس کھول کر اس میں سے لٹافہ نکالا اور نیلم کی آنکھوں

"اب سمجھی۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "تو تم مجھ سے چال بازی کر رہے تھے۔ دھوکے سے چھ لاکھ کی رقم ہتھیانا چاہتے تھے۔ میں تو لٹاؤنے کے رنگ اور ساز سے دھوکا کھا گئی۔ اگر اس وقت مجھے ذرا سا بھی شک ہو جاتا تو میں لٹاؤ چیک کر لیتی۔"

"مگر میں نے تمہاری مصیبت سے دھوکا نہیں کھایا۔ تم نے تو مجھ سے دھوکے بازی کی ہے۔ میں جانتا تھا کہ تم ایسا کرو گی۔ دھوکا دینا تمہاری سرشت میں شامل ہے۔"

"اچھا وہ لٹاؤ کہاں ہے؟" اس نے بے پروائی سے کہا۔ میرے ٹھہرے چیلے کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

"میرے دوست کے پاس محفوظ ہے۔"

"تمہارا دوست کہاں ہے؟"

"اپنے گھر میں رقم گن رہا ہو گا۔"

"کون سی رقم؟" اس کا منہ استعجاب سے کھل گیا۔

"وہی چھ لاکھ... میں نے اس سے کہا تھا کہ رقم گن کر اطمینان کر لیتا۔ نیلم کا کوئی بھروسہ نہیں۔ رقم کم بھی ہو سکتی ہے۔"

"مگر وہ بریف کیس تو رسم لے گیا ہے۔" اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"رسم وہ بریف کیس لے گیا ہے جس میں چند روپی رسائل تھے۔"

"نہیں! وہ تقریباً" چیخ پڑی۔

"ہاں" میں مسکرایا۔ "میرے اس دوست نے تمہاری کار سے تمہارا بریف کیس اٹھا کر میرا بریف کیس رکھ دیا تھا۔"

"اوہ نو" تم آدمی ہو یا شیطان! تم نے واقعی بڑی ذہانت سے منصوبہ ترتیب دیا۔"

"مگر میری ذہانت تو تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔" میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"پلیز! مجھے معاف کر دیں۔ میں بہت نادب ہوں... وہ جمل ہی ہو گئی۔"

"اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔" میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"وہ کسمپاشی۔ پھر اس نے میری طرف سرک کر قاصدوں کو مٹانا چاہا مگر میں نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا... عدول چاہا چائے لے کر آرہے ہیں۔"

چائے رکھ کر عدول چاہا کمرے سے نکل گئے تو نیلم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کی شخصیت بہت سحر انگیز ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے مجھے کچھ ہو گیا ہو۔"

"تم پیترے کیوں بدل رہی ہو؟" میں نے تھکی سے کہا۔ "شاید میں تمہارے نزدیک سونے کا انڈا دینے والی مرغی کی حیثیت اختیار کر گیا ہوں۔"

"نہیں" وہ حذب و بھوسہ ہو کر بولی۔ "آپ کی شرافت نے میرے دل میں جگہ بنالی ہے۔"

"اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرنے لگی ہو تو پھر اپنی محبت کا ثبوت دو۔"

"کیسا ثبوت؟"

"بنگلے میں کون ہو گا؟"

"ایک پرانا بوڑھا ملازم جو خریداروں کو بنگلا کھول کر دکھاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے وہیں چلو۔ وہ جگہ مناسب رہے گی۔"

تقریباً" پندرہ بیس منٹ بعد ہم اس بنگلے میں تھے۔ نیلم نے احتیاطاً" کار گیراج میں کھڑی کر کے دروازہ بند کر دیا۔ بنگلہ کشادہ تھا اور مغربی طرز پر بنایا ہوا تھا۔ بہت ہی خوش نما اور شاندار بنگلا خالی پڑا تھا۔ مگر نشست گاہ میں ایک صوفہ سیٹ موجود تھا۔ کھانے کی میز اور کرسیاں بھی تھیں۔

نشست گاہ میں پہنچ کر میری نظر خواب گاہ پر پڑی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ موٹے سے فائدہ اٹھا کر میں دروازے تک گیا اور میں نے جھانک کر خواب گاہ کو دیکھا۔ خواب گاہ کسی شاہی محل کے حرم کی طرح تمام لوازمات سے آراستہ و بیراستہ تھی۔ میں کھو کر رہ گیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر خوب کمائی کرتے ہیں اس کا ثبوت یہ بنگلا اور اس کی خواب گاہ تھی۔ بنگلا فروخت کیا جا رہا تھا۔ اس لیے اندر سے اس کا سامان ہٹا دیا گیا تھا۔ اگر وہ سامان اور لوازمات موجود ہوتے تو بنگلہ کسی جنت سے کم نہ ہوتا۔

بوڑھے ملازم کا نام عدول تھا۔ وہ صحت مند اور مستعد آدمی تھا۔ جب ہم دونوں نشست گاہ میں صوفوں پر بیٹھ گئے تو عدول نے چائے کے لیے پوچھا۔ اثبات میں جواب پا کر وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ نیلم نے عدول کے جاتے ہی بے چینی سے پوچھا "جلدی سے بتاؤ کیا بات ہے؟"

"پہلے منہ ہاتھ دھو آؤ۔ آئینے میں جا کر اپنا چہرہ دیکھو۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے برسوں کی مریض ہو۔"

نیلم بادل خواستہ انٹھی اور خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔ اس وقت شام کے سائے اندھیرے میں ڈوب چکے تھے۔ میرے ذہن میں گزشتہ واقعات کی فلم چل رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ رسم کا اگلا قدم کیا ہو گا؟

نیلم منہ ہاتھ دھو کر آئی تو کسی قدر تروتازہ لگنے لگی۔ اس نے میرے قریب بیٹھ کر پوچھا "چلو... اب بتاؤ رسم کس لیے واپس آئے گا۔ لٹاؤ اور بریف کیس حاصل ہونے کے بعد تو اس کا مقصد پورا ہو گیا۔"

میں جواباً" مسکرایا "اس لیے کہ جب وہ کچھ دور جا کر لٹاؤ نکال کر خطا دیکھے گا تو اسے ایک سادہ کاغذ ملے گا جب کہ نیگیٹو فلمی ستاروں کے ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟" وہ اچھل پڑی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"مطلب یہ کہ میں نے لٹاؤ بدل دیا تھا... اس لٹاؤنے کی جگہ اپنا لٹاؤ رکھ دیا تھا۔"

"مگر اتنی جلدی اس ساز اور رنگ کا لٹاؤ کہاں سے مل گیا۔ پھر خطا اور نیگیٹو کا انتظام کیسے ہوا؟"

"اس کا انتظام میں نے کل ہی کر لیا تھا۔ میرے پاس صرف ذہانت کا ہتھیار ہے۔ میں اسی سے کام لیتا ہوں۔"

ابتدائی تعلیم گرامر سکول میں پائی۔ پھر سینٹ جوزف کالج میں بھی ساتھ پڑھا۔ میرے ڈیڈی ان کے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ ایک روز جب میں قرۃ العین کی سالگرہ میں شرکت کرنے گئی تھی تب ان ہیرے جواہرات کو دیکھا تھا۔ قرۃ العین اس روز مجھے اور دوسری سیبیوں کو وہ جواہرات دکھانے لے گئی جو خاندانی تھے۔ ٹایاب، انمول اور بے حد قیمتی۔ اس کے علاوہ عرب ریاست کے شہزادے نے مغنی کے موقع پر جو ہیرے جواہرات کے تحائف قرۃ العین کو پیش کیے تھے، ان کی مالیت کا اندازہ میں نہیں لگا سکی۔ وہ تو ایک خزانہ مملو ہوتا ہے۔

”تو تم بلیک میلنگ سے ان ہیروں کو حاصل کرنا چاہتی ہو؟“

”ہاں“ وہ بے یاسی سے بولی۔

”تمہیں یہ ہوس کس لیے ہے۔ آخر تم بھی اپنے مالدار باپ کی اکلوتی اولاد ہو۔ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ تم بھی تو ہیرے جواہرات خرید سکتی ہو؟“

”یہ میں اپنے لیے نہیں۔ اپنی تحظیم کے لیے کر رہی ہوں۔ انہیں اپنی تحریک چلانے کے لیے فنڈ کی ضرورت ہے۔ اور پھر ہم ان نوابوں اور جاگیرداروں سے ان کی دولت چھین لینا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس غریب عوام سے لوٹا ہوا پیسہ ہے۔ دولت ہے۔ کیا یہ لوگ ہمارا استحصال نہیں کر رہے ہیں؟“

”تم نے وہ چھ لاکھ تحظیم کو کیوں نہیں دے دیے؟“

”میں اپنا روپیہ کیوں دوں؟“ وہ گھبرا کر بولی۔

اب سمجھا“ میں نے سر ہلایا۔ ”تم ایک تیر سے دو شکار کر رہی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے نواب خاندان کو لوٹنا چاہتی ہو۔ وہ ٹایاب ہیرے اور جواہرات اپنے لیے، اور رقم تحظیم کے لیے حاصل کرنا چاہتی ہو۔ ان ہیرے جواہرات کے حصول کے لیے تم نے ایک جوا کھیلا۔ چھ لاکھ ڈالر پر لگا دیے۔ تم بازی ہار گئی ہو نیلم۔ دیکھو، خدا کس طرح سے مظلوموں کی مدد کرتا ہے۔ وہ خط اور نیکیٹو ایسے شخص کے ہاتھ لگ گئے ہیں جو انسانیت اور خدا پر یقین رکھتا ہے۔“

”اگر تم نے وہ خط اور نیکیٹو قرۃ العین یا اس کے والدین کو لے جا کر دیے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔۔۔“ اس کی نگاہ اپنے پرس کی جانب اٹھ گئی جس میں بھرا ہوا پستول رکھا ہوا تھا۔ وہ اس ٹاک میں تھی کہ پرس اٹھا کر اس میں سے پستول نکال لے۔ میں اس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اطمینان سے چائے کی پیالی اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا پھر پوچھا۔ ”مگر وہ خط ہے کیا؟“

تفصیل سے بتاؤ تو شاید میں اپنے ارادے پر کچھ نظر ثانی کروں، تمہاری پیشکش پر غور کروں۔“

”وہ خط کسی مظلوم لڑکے کے نام ہے۔ اس کی عبارت کچھ اس انداز کی ہے کہ لڑکی کی مغنی ٹوٹ سکتی ہے وہ خط قرۃ العین سے پستول کے زور پر لکھوایا گیا تھا۔“

”تو رستم نے اس خط اور نیکیٹو سے کوئی فائدہ کیوں نہ اٹھایا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے شاید کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ دراصل وہ قرۃ العین سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“

نواب خاندان کے انکار پر اس نے یہ سارا منصوبہ بنا کر قرۃ العین کو اس جال میں پھنسا۔ اس

”اپنی محبت کا ثبوت تم یوں فراہم کر سکتی ہو کہ وہ خط اور نیکیٹو جس ہستی سے متعلق ہوں اسے لوٹا دیے جائیں۔“

”نہیں“ وہ اچھلی پڑی۔ ”میں کسی قیمت پر ان نیکیٹو سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتی۔“

”مگر میں یہ لفاظی ہر قیمت پر اس ہستی تک پہنچا کر دم لینا چاہتا ہوں۔“

”تمہیں اس سے کیا حاصل ہو گا احق آدمی؟“

”خوشی... ایک ایسی خوشی جو تمہارے چھ لاکھ بھی نہیں دے سکتے۔ جانتی ہو، سب سے بڑا

گناہ کیا ہے؟ دل آزاری۔“

”احق منت ہو۔ ان نیکیٹو سے ہم لاکھوں کے مالک بن سکتے ہیں۔ یہ نواب خاندان کی لڑکی کی تصویریں ہیں۔ قرۃ العین اس کا نام ہے۔ اس کی مغنی کسی عرب ریاست کے شہزادے سے ہو چکی ہے۔ یہ تصویریں قرۃ العین کو کوئی نقد اور دوا بلا کر ہٹائی گئی تھیں۔ ایک منصوبے کے تحت اس پر ایک لاکھ خرچ ہوئے تھے۔“ اس نے رک کر سامنوں پر قابو پایا۔ ”جانتے ہو ان تصویروں نے قرۃ العین اور اس کے والدین کا کیا حال کر رکھا ہے؟“

”تو تم ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی کو خواہ مخواہ دار کرنا چاہتی ہو۔ نواب خاندان کی مٹی پلید کرنے سے تمہیں کیا حاصل ہو گا؟“

”نہیں وہ لوگ بے قصور نہیں ہیں۔“ اس نے تکرار کی۔

”پھر ان کا کیا قصور ہے؟“

”وہ خاندان دشمنوں کا ایجنٹ ہے، غدار ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ لوگ کھل کر ہائیں بازو کی مخالفت کر رہے ہیں۔ انہیں اس بات کی تمیز نہیں رہی کہ دوست کون ہے اور دشمن کون ہے۔“

”پاکل پن کی باتیں نہ کرو۔ نہ دایاں بازو ہمارا دوست ہے اور نہ بایاں بازو۔ سب اپنی اپنی غرض کے اندھے جٹوں میں جٹا ہیں۔“

”تو تم بھی اسی بیج پر سوچتے ہو۔“ وہ چونک کر بولی۔ ”گویا تم بھی دایاں بازو کے ایجنٹ

ہو؟“

”میں کسی کا نہیں بلکہ اپنے ملک کا ایجنٹ ہوں۔“ میں نے تڑ سے جواب دیا۔

”نہ! وہ نرمی سے بولی۔ ”یہ وقت فضول باتوں کا نہیں ہے۔ میری بات غور سے سنو۔“

نواب خاندان لاکھوں کروڑوں کے ہیرے جواہرات کا مالک ہے۔ ہم ان نیکیٹو کی مدد سے وہ ہیرے جواہرات حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ ساری زندگی بلیک میل ہوتے رہیں گے۔ ہم دونوں اس آمدنی میں قسٹی قسٹی ہوں گے۔“

میں نے ٹوہ لینے کی غرض سے پوچھا۔ ”کیا تم نے وہ ہیرے جواہرات دیکھے ہیں؟“

”ہاں“ نیلم نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ”قرۃ العین میری کلاس فیلو تھی۔ ہم دونوں نے

”چلو انہیں کفن تو نصیب ہو جائے گا مگر تمہاری تنظیم کو شاید یہ بھی نصیب نہ ہو۔“ میں نے خواب گاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ادھر چلو جدھر یہ پستول اشارہ کر رہا ہے اور وہاں چل کر بستر پر لیٹ جاؤ۔“

وہ خواب گاہ کی طرف دیکھ کر چوکی۔ اس کے حواس جیسے ساتھ نہیں دے رہے تھے ”وہ کس لیے؟“

”ابھی بتاتا ہوں“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس نے میرے انداز سے غلط مطلب اخذ کیا اور نفی میں سر ہلانے لگی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر خواب گاہ کی طرف دھکا دیا۔ عبدل چاچا ابھی تک ہماری طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ شاید گیٹ پر کھڑے سکرٹ پی رہے تھے۔ نیلم کی بلند آوازیں یقیناً ان تک نہیں پہنچی ہوں گی۔

جب ہم خواب گاہ میں داخل ہوئے تو میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اسے بستر کی طرف لے گیا اور تھکانہ لہجے میں کہا۔ ”چلو بستر پر لیٹ جاؤ۔“

اس نے مجھے کسی قدر نفرت و حقارت سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔

”چلو جلدی کرو“ ورنہ میں تمہاری کھوپڑی میں ایک خوبصورت سا سوراخ کر دوں گا۔“ میں نے درشتی سے کہا۔

وہ دہشت سے کانپتی ہوئی بستر پر لیٹ گئی۔ میں نے پانچویں سے چادر اٹھا کر اس کے جسم پر ڈال دی اور اپنی دستی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رات کے آٹھ بجتے ہیں میں منٹ باقی ہیں۔ اچھے بچوں کی طرح سو جاؤ۔۔۔ اور ہاں ٹیلی فون کر کے پولیس سے رابطہ قائم نہ کرنا“ ورنہ آنتیں الٹی گلے پڑ جائیں گی۔“ میں نے دروازہ کھول کر کمرے سے نکلے ہوئے کہا۔ ”پورے بیس منٹ تم خاموشی سے لیٹی رہو گی۔ اگر تم نے شور مچایا تو میں واپس آکر بغیر کسی جھجک کے تمہیں گولی مار دوں گا۔ میرے لیے خون خرابا بچوں کا کھیل ہے۔“

دروازہ بند کر کے میں نے چٹنی لگا دی... اس کا پرس تباہی پر پڑا ہوا تھا۔ اس میں پستول رکھ کر تیزی سے باہر آیا تو چاچا عبدل گیٹ پر کھڑے بیڑی پھونکتے دھواں دے دیے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ غالباً ”نیلم پہلے بھی اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں آتی رہی ہو گی۔“

میں عبدل چاچا سے گفتگو میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحوں کی بات تھی۔ وہ دروازہ پینے ہی والی تھی۔ میں بچنے سے نکل کر ایک بگلی راستے سے سڑک پر آ گیا۔ ایک خالی آٹو رکشا گزر رہا تھا۔ میں نے آواز دی۔ تو رکشا رک گیا۔ میں لپک کر اس میں جا بیٹھا۔ ”لیاقت آباد“ میں نے کہا۔

گھر پہنچ کر میں نے پہلے تو غسل کیا۔ اس لیے کہ میں بہت تھک گیا تھا۔ نہانے کے بعد چائے کی طلب ہوئی تو گھر سے نکل کر ہوٹل گیا۔ اسپیشل چائے منگوا کر پی تو جسم کی ساری تھکن اتر گئی۔ پھر میں ایک عیسائی پکڑ کر نواب صاحب کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس وقت میں نواب صاحب

منصوبے کی کامیابی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ میں نے رسم کو مجبور کیا کہ وہ یہ خط اور نیکیٹو میرے ہاتھوں فروخت کر دے۔ وہ نہ جانے کیا سوچ کر تیار ہو گیا۔ میرا خیال ہے وہ کسی وجہ سے نواب خاندان کو بلیک میل کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی گری ہوئی اور ذلیل ہستی ہو۔ اپنی ایک دوست کے ساتھ ایسی مذہبوم حرکت اور ٹاپاک سازش!“ میں نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ ”تم اس قابل ہو کہ تمہیں عبرت ناک سزا دی جائے۔ یہ سزا میں نہیں رسم دے گا۔ رسم تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”میرے الفاظ جیسے اس پر بجلی بن کر گرے۔ اس نے جھپٹ کر اپنا پرس اٹھایا اور برق رفتاری سے مجھ سے دور ہٹ کر اپنا پرس کھولنے لگی۔ اس پر بیچانی کیفیت طاری تھی۔ میں اپنی جگہ پر مطمئن انداز میں بیٹھا رہا اور چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ”تم نے اپنی چائے ختم نہیں کی؟“

وہ میری بات کا جواب کیا دیتی وہ تو پرس کھول کر اپنا پستول تلاش کر رہی تھی۔ میں نے پنی جیب سے نکال کر اگلیوں پر نہچایا۔ کیا تم یہ پستول تلاش کر رہی ہو؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

اس نے جیسے ہی میرے ہاتھ میں پستول دیکھا اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ سکت و صامت کھڑی رہ گئی جیسے مجھے میں تبدیل ہو گئی ہو۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پستول سے اس کے سر کا نشانہ لے کر اس کے قریب پہنچا۔ وہ خوف سے لرزنے لگی۔ ”اب تم چھ لاکھ سے بھی گئیں... میں وہ رقم ضرورت مندوں میں تقسیم کر دوں گا۔ وہ خط اور نیکیٹو آج ہی قرۃ العین کے والدین تک پہنچا دوں گا تاکہ وہ چین کی نیند سو سکیں۔ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرا نام سکندر ہے اور میری فتوحات کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔“

نیلم نے ہاتھ بڑھا کر صوفے کی پشت تھام لی وہ اپنی دہشت پر قابو پانے کی جدوجہد کر رہی تھی جو بے سود ثابت ہو رہی تھی۔ وہ ہڈیانی انداز میں چٹینی۔ ”سکندر کے بچے تم مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتے۔ میری جان لینا اتنا آسان نہیں ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ چیخ کر کیوں بول رہی ہے۔ عبدل چاچا کو خبردار کرنے کے لیے کہ اس کی جان خطرے میں ہے۔ میں مسکرایا ”بے بی! مرے ہوئے کو کیا مارنا؟ پھر میں اپنے ہاتھ خون میں رنگنا نہیں چاہتا۔ قدرت خود ہی تم سے ایک بھیانک انتقام لینے والی ہے۔“

”تم بہت خطرناک کھیل کھیل رہے ہو۔ رسم تمہیں شکاری کتوں کے آگے ڈالوا دے گا۔“

”اب مجھے چلنا چاہیے۔ میں نے پہلے ہی کافی وقت فضول باتوں میں ضائع کر دیا ہے۔ دیے جانے سے پہلے تمہیں ایک دوستانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں اگر خوش قسمتی سے تم رسم کے ہاتھوں سے بچ گئیں تو ایسا کرنا اس بچے کو فروخت کر کے اس رقم سے اپنے لیے ہیرے جو اہرات خرید لینا۔“

”اور میری رقم سے غریبوں کے لیے کفن خرید لینا۔“ وہ فرش پر پیر بخ کر حقارت سے

کی کوٹھی پر پہنچا رات کے نو بج چکے تھے۔ نواب یامین کے ایک مستعد ملازم نے پہلے تو مجھ سے چند رسمی سوالات پوچھے پھر اس نے شکر انداز میں کہا ”آپ کل دن میں کسی وقت تشریف لائیں۔ وہ کئی دنوں سے سخت طویل ہیں۔ اس وقت کسی قیمت پر نہیں مل سکتے۔ وہ سو رہے ہوں گے۔“

”تو پھر بیگم صاحبہ ہی سے ملا دو۔“ میں نے اس سے درخواست کی۔

”بیگم صاحبہ!“ ملازم نے ایک سرد آہ بھری۔ ”کو وہ بستر پر نہیں ہیں، بیمار نہیں ہیں مگر اب صاحب سے زیادہ بیمار دکھائی دیتی ہیں۔ خدا معلوم اس گھر پر ایسی کیا افتاد پڑی ہے کہ سب خوشیاں چھن گئی ہیں۔ کھانا پینا چھوٹ گیا ہے۔ ہم لوگوں کی کیا حال کہ ان کی خوشیوں اور غموں کے بارے میں پوچھیں۔ ویسے خوشیوں کا پتہ تو چل جاتا ہے لیکن پریشانیوں کی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔“

”قرۃ العین کا کیا حال ہے؟“ میں نے قدرے جھجک کر پوچھا کہ کہیں وہ برانہ مان جائے۔

”تقریباً“ ایک ہفتے سے کسی ملازم نے ان کی صورت بھی نہیں دیکھی، ”آواز تک نہیں سنی۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ گھر پر نہ ہوں۔ مگر وہ گھر میں ہی ہیں کمرے میں بند ہیں۔ ایک لمحے کے لیے بھی باہر نہیں نکلتیں۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں جواب دیا جیسے کسی راز ہے پردہ اٹھا رہا ہو۔

”اچھا...“ میں نے کہا۔ میں ان لوگوں کی خوشیاں لوٹانے آیا ہوں۔ بیگم صاحبہ سے جا کر صرف اتنا کہو کہ ایک صاحب بہت ضروری کام سے آئے ہیں۔ وہ ابھی اور اسی وقت تھوڑی دیر کے لیے ملنا چاہتے ہیں۔“

”ج“ ملازم نے ایک دم خوش ہو گیا۔ ”کیا ان کی خوشیاں واپس مل جائیں گی؟“

”انشاء اللہ“ میں بولا ”مگر تم ان سے یہ سب باتیں نہ کہنا۔ اس میں ایک راز پوشیدہ ہے۔“

وہ لپکتا ہوا اندر گیا۔ مجھے اندر بلا لیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک شاندار کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ نشست گاہ تھی۔ اس کی ایک ایک چیز سے نوابی شان ٹپک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد کمرے کا پردہ ہلا۔ سفید ساڑھی میں ملبوس ایک باوقار خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ مگر وہ بہت حسین تھیں۔ اور رنج و الم کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے چپکے الی یاسیت اور حزن نے میرا سینہ شق کر دیا۔ میں نے کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا تو وہ جواب دے کر بولیں۔ ”آپ کون ہیں بیٹے اور مجھ سے کس لیے ملنا چاہتے ہیں؟“

ان کی زبان سے اپنائیت میں ڈوبے ہوئے لفظ ”بیٹے“ نے جیسے سارے جہان کی دولت میرے من کی جھولی میں ڈال دی۔ میں جذباتی سا ہو گیا۔ دل بھر آیا۔ آج تک مجھے کسی نے پیار کے اس جذبے سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی ماں لگیں... جیسے میری ماں ان کے وجود میں بول رہی ہو۔ میری آنکھیں نمناک ہو گئیں... اور آواز مطلق میں چھنے لگی۔ میں نے سوچا کیا ماں کے دل میں دوسرے کے بچے کے لیے بھی ماما ہوتی ہے؟

”بیٹہ جاؤ بیٹے۔ کھڑے کیوں ہو؟ جو کچھ کہنا ہے“ اطمینان سے کہو۔ ”وہ مجھے خاموش پا کر بولیں۔“

میں مودب کھڑا رہا۔ اس لیے کہ وہ بھی کھڑی تھیں... مجھے چند لمحے خود پر قابو پانے میں لگے۔ میں نے پوچھا ”کیا میں تھوڑی دیر کے لیے نواب صاحب سے مل سکتا ہوں؟ انہیں مجھ سے مل کر خوشی ہوگی۔“

”بد نصیبوں سے مل کر کیا کرو گے بیٹے؟ ہم لوگ تو چراغ بج رہے ہیں۔“ ان کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ ”خوشیاں اب ہمارا مقدر نہیں رہیں۔“

”خدا نہ کرے۔“ میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ”ان چراغوں کے دم سے تو ہر طرف روشنی ہے۔ خدا آپ کی خوشیوں کو سلامت رکھے۔“

”یہ محض فریب ہے۔ ہم برسوں سے فریب کھا کر رہے ہیں مگر اب حوصلہ نہیں رہا۔“ وہ کرب سے بولیں۔

”کیا آپ میری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتیں۔ میں بڑی تمنائیں لیے حاضر ہوا تھا۔“ میں گڑگڑایا۔

”اچھا“ انہوں نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر بولیں ”میرے ساتھ آؤ۔“

میں ان کے پیچھے پیچھے ایک ایک راہ داری سے ہوتا ہوا ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا۔ پھر ٹھک کر رہ گیا۔ ایک حسین تراشیدہ مجسمہ نواب صاحب کے سرہانے کھڑا تھا اور نواب صاحب بستر پر دراز تھے۔ وہ نواب صاحب کا سردار ہی تھی۔ سرخ و سپید اور تھکے نقش و نگار والے چہرے میں زردی مچھلی ہوئی تھی۔ شبلی پیشانی پر گھروں کے بل تھے۔ حسین آنکھوں میں آنسوؤں کی جمیل سی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک پر شکوہ سراپا تھا۔ اس سے میرا تعارف نہیں ہوا تھا مگر میں نے قیاس کرنے میں دیر نہیں لگائی کہ وہ قرۃ العین ہے۔

مجھے دیکھ کر وہ چوگی اور ماں کی طرف استغما یہ انداز سے دیکھنے لگی۔ ایک اجنبی کو اپنے والد کی خواب گاہ میں دیکھ کر چوٹنا فطری عمل تھا۔

بیگم صاحبہ راہ داری میں میرا نام دریافت کر چکی تھیں۔ اچھا ہی ہوا انہوں نے میرا کام نہیں پوچھا تھا۔ میں انہیں اپنا پیشہ کیا بتاتا؟ وہ بیٹی کی طرف دیکھ کر بولیں ”یہ سکندر ہیں۔ آپ کے ابا جان سے ملنے آئے ہیں۔“

قرۃ العین کا استعجاب پھر بھی ختم نہیں ہوا۔ ختم ہوتا بھی کیسے؟ میں ایک غیر معروف شخص جو تھا۔ میری شخصیت سے وہ کہاں واقف تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے تعظیمی انداز میں سر ہلا کر سلام کیا۔ قرۃ العین نے رواجی انداز میں جواب دیا ”آداب“

بیگم صاحبہ نے نواب یامین کے بستر کے قریب پہنچ کر بلند آواز سے کہا ”سکندر صاحب آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔“

”سکندر؟ صاحب کون سکندر صاحب؟“ نواب صاحب نے نحیف آواز میں پوچھا۔

”آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

”اچھا“ وہ تعجب ہو کر بولے۔ ”مجھے سارا دے کر بخا دوں۔“

حالت کیا سے کیا ہو گئی ہے؟

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ وہی ہیں جنہیں میں نے ایک ماہ پہلے شتر پارک میں دیکھا تھا۔ آپ برسوں کے مریض معلوم ہو رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”غم انسان کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ دکھوں نے مجھے نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ بیماری انسان کو اتنی جلدی نہیں کھاتی جتنا دکھ اور غم کھا جاتے ہیں۔“

”ابا حضور! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجئے۔“ قرۃ العین نے غمگین لہجے میں کہا۔ پھر میری طرف مڑ کر بولی۔ ”اگر آپ برا نہ مانیں تو ابا حضور کو آرام فرمانے دیں۔ ورنہ ان کی طبیعت پھر بگڑ جائے گی۔ خدا خدا کر کے تو سنبھلے ہیں۔“

”میں دراصل آپ لوگوں کی خدمت میں ایک ایسا تحفہ پیش کرنے والا ہوں جو نواب صاحب کو ایک نئی زندگی... اور آپ سب کو کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹا سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیسا تحفہ؟“ بیگم صاحبہ نے متوجہ ہو کر پوچھا۔ ”تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟ ایسا کون سا تحفہ ہے جو ہماری خوشیاں ہمیں لوٹا سکتا ہے؟“

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ میں نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر نواب صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”آپ خود دیکھ لیں۔“

نواب صاحب نے بڑی حیرت سے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”آپ کی پامال خوشیاں“ میں نے مبہم انداز میں کہا۔

”میں کچھ... سمجھا نہیں ساجزادے؟“ نواب صاحب متحیر تھے۔

”اس لفافے میں وہ خط اور نیکیٹو ہیں جنہوں نے آپ کو اس حالت میں پہنچا دیا اور اس گھر کا چین و سکون غارت کر کے رکھ دیا۔ اب کوئی خبیث آپ کو بلیک میل نہیں کر سکتا، اس خاندان کی عزت و شرافت سے نہیں کھیل سکتا۔ اب آپ سر اٹھا کر چل سکتے ہیں۔“

”سچ بیٹے؟“

ایک لمحے کے لیے کسی کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں مجھے دیکھتے رہے۔ پھر نواب صاحب نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط اور نیکیٹو باہر نکالے۔ ان پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر جلدی سے لفافے میں رکھ دیے اور لفافہ اپنی بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے ”اسے فوراً نذر آتش کر دو۔“

وہ سب بھی سمجھ گئے کہ میں نے کیا کارنامہ انجام دیا۔ ان کے چروں پر ہلاکت جھلکنے لگی۔ نواب صاحب کی بیماری تو جیسے کافور ہو گئی۔ وہ بغیر کسی سارے کے بستر سے اٹھ گئے۔

پھر میں نے ایک نہایت رقت آمیز منظر دیکھا... جسے میں ساری زندگی نہیں بھول سکتا۔ جو جہاں کھڑا تھا وہیں قبلہ رو ہو کر سجدے میں گر پڑا۔ وہ تینوں اسی حالت میں گر گزرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرتے رہے۔

سب سے پہلے بیگم صاحبہ انھیں، پھر نواب صاحب اور آخر میں قرۃ العین... نواب صاحب

ماں اور بیٹی نے مل کر سارا دیا اور ان کو نکیوں کے سارے بٹھا دیا۔ میں نے نواب صاحب کو کئی بار دیکھا تھا۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ میں نے کسی قریب میں ایک باران کی جیب بھی ہلکی کی تھی۔ ان کے بڑے سے موٹی رقم ملی تھی۔ وہ غلطی نواب تھے کسی شیر کی مانند۔ مضبوط جسم، لمبے چوڑے، رعب دار چہرہ اور پروقار شخصیت۔ بیش سفید شروانی اور ترکی ٹوپی میں نظر آتے تھے۔ مگر وہ اس وقت بیماری کی وجہ سے بہت کمزور اور بوڑھے دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ انہیں کون سا غم کھائے جا رہا ہے۔

اور اس غم کا علاج میرے پاس تھا۔

بیگم صاحبہ کے اشارے پر میں بنگ کے پاس پہنچا۔ ماں اور بیٹی میرے مقابل کھڑی ہوئی تھیں اور ان کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ میں نے ان کے قریب پہنچ کر انہیں بڑے ادب سے سلام کیا۔ انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور پھر میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے بڑے ادب سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ مجھے سر تا پا دیکھ کر بولے ”کون ہو میاں تم؟“

”بس جی آپ کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ آپ کی بیماری کا حال سنا تو خراب کیا اور آپ کو دیکھنے چلا آیا۔“

”خدا تمہیں خوش رکھے۔“ انہوں نے ملائمت سے کہا۔ ”میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“

”مگر میں آپ کو ہزار بار دیکھ چکا ہوں۔ آخری بار میں نے آپ کو ایک ماہ پہلے شتر پارک میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”تمہیں وہ تقریر پسند آئی؟“

”جی ہاں! آپ کی اس تقریر کا ایک ایک لفظ مجھے آج بھی یاد ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ ”کبھی ہم نے یہ سوچا ہے کہ اگر یہ ملک ہمیں نہ ملتا تو کیا ہوتا...؟ ہم آج بھی غلام ہوتے! اس آزادی کی قدر کرو۔ آزادی بڑی نعمت ہے اگر ہمیں پنجابی، سندھی، چھان اور ماجر کھانا تھا تو پھر اس ملک کو بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر ہمیں ایک قوم بن کر اپنی شناخت کروانا ہے ملک کو مضبوط بنانا ہے تو پنجابی، سندھی، چھان اور ماجر کے تعصب کے جو خول ہیں انہیں توڑ کر پھینک دو اور دل کی ساری کشتافتنیں کھرچ دو۔ ورنہ دشمن تمہیں صفحہ ہستی سے مٹا ڈالے گا۔“

”شاباش تم بڑے ذہین ہو۔ تم کس صوبے سے تعلق رکھتے ہو؟ اردو بہت صاف اور شستہ بول رہے ہو؟“

”میں صرف پاکستانی ہوں اور ہر صوبے کی زبان پر یکساں عبور حاصل ہے۔ اس لیے کہ میں وطن عزیز سے محبت کرتا ہوں اور مجھے اس پر فخر بھی ہے۔“

قرۃ العین فوراً بول پڑی ”آپ کو ڈاکٹروں نے آرام کرنے اور نہ بولنے کی تاکید کی ہے۔ پھر آپ سیاست کی باتوں میں پڑ گئے ہیں۔ خدا کے لیے باتیں کم کیجئے۔ چند دنوں میں آپ کی

میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے صوفے پر لے کر بیٹھ گئے۔ ان تینوں کی آنکھوں میں... آنسو تیر رہے تھے... بیگم صاحبہ بھی میرے پاس آ بیٹھیں۔ قرۃ العین سامنے اس طرح سے جھکی کھڑی تھی جیسے میرے احسان کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہو۔

میں ان لوگوں کے لیے ابغنی نہیں رہا تھا۔ ان کے خاندان کا فرد بن گیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے ممنونیت سے کہا۔ ”بیٹے! سمجھ نہیں آ رہا کہ کن لفظوں میں تمہارا شکر یہ ادا کریں۔ تم نے ہم پر جو احسان کیا ہے، اس کا بدلہ ہم ساری زندگی بھی چکا نہیں سکتے۔ تم ہمارے لیے فرشتہ رحمت بن کر آئے ہو۔“

”یہ خط اور نیکیوں تمہارے ہاتھ کیسے لگے؟“ نواب صاحب نے بے تابی سے پوچھا۔

”محض ایک اتفاق سے“ میں نے جواب دیا اور پھر انہیں پوری کہانی سنا دی۔

”نیلیم...“ قرۃ العین کے چہرے پر حقارت اٹھ آئی۔ ”میں نے اسے ہمیشہ کسی بہن سے زیادہ چاہا ہے۔“

”کبھی کبھی چاہت کا صلہ اس صورت میں بھی ملتا ہے۔“ بیگم صاحبہ بولیں۔ ”نیلیم اور رستم خان جیسے لوگوں سے خدا سب کو محفوظ رکھے۔“

”اچھا... اب میں چلتا ہوں“ میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم اتنی جلدی کیسے جاسکتے ہو؟“ بیگم صاحبہ نے حیرت سے کہا۔ ”بیٹے تم ہمارے محسن ہو۔“

”میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ کوئی احسان نہیں کیا۔ بس آپ لوگ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کیجئے۔“

”پلیز ایک منٹ ٹھہریں، میں ابھی آتی ہوں۔“ قرۃ العین نے ملتیجانہ انداز میں کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ واپس آئی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ میری خاطر تواضع کے لیے ہدایت کرنے گئی ہے مگر وہ ایک خوبصورت پھول ہوئی چری تھیلی لیے ہوئے واپس آئی۔ اس نے وہ تھیلی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”سکندر صاحب! یہ ایک حقیر سا نذرانہ ہے۔ اسے قبول فرمائیں۔“

”یہ کیا ہے؟“ میں نے قرۃ العین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جو بھی ہے، وہ آپ کے اس عظیم احسان کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔“ قرۃ العین نے متانت سے جواب دیا۔ ”سچ پوچھئے تو عزت و ناموس سے بڑی کوئی دولت نہیں ہوتی۔ اس دولت کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی دولت بھی پیچ ہوتی ہے۔“

”میں نے کسی بھی صلے کی غرض سے آپ کی خدمت نہیں کی۔ مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔“

”خدا تمہیں خوش رکھے بیٹے۔“ نواب صاحب بولے۔ ”رکھ لو۔ قرۃ العین اپنی خوشی سے دے رہی ہے۔“

میں نے قرۃ العین کے ہاتھ سے وہ تھیلی لے لی تو مجھے شک سا ہوا۔ اپنا شک دور کرنے کی

غرض سے میں نے تھیلی کا منہ کھولا۔ میرا شک درست ثابت ہوا۔ وہ تھیلی قیمتی ہیرے جو اہرات سے ہمراہی ہوئی تھی۔ میں نے حیرت سے کہا ”یہ کیا ہے؟“

”بیٹے سچ پوچھو تو تمہارے احسان کے بدلے میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔“ بیگم صاحبہ نے کہا

”معاف کیجئے گا۔ میں یہ قبول نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“ قرۃ العین نے تحیر ہو کر کہا۔

”میں ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ یہ ضرورت سے بہت زیادہ ہو گا۔“

”قرۃ العین اپنی خوشی سے دے رہی ہے۔“ بیگم صاحبہ میرے جذبے سے بڑی متاثر نظر آ رہی تھیں۔ ”اگر ہم تم کو اپنی ساری دولت دے دیں تو وہ بھی کم ہے۔“

”مگر آپ نے مجھے ایک ایسی دولت دی ہے جو میری تمام عمر کے لیے اس سے بھی بیش بہا ہے۔ یہ ہیرے جو اہرات چوری ہو سکتے ہیں، مگر وہ دولت جسے کوئی نہیں لے جاسکتا، جو کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔“

”کون سی دولت بیٹے؟“ ان کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

”آپ کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا لفظ جو مٹا کے جذبے میں ڈوبا ہوا تھا... بیٹے... لفظ

بیٹا میرے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ ان ہیرے جو اہرات سے کہیں زیادہ قیمتی اور انمول ہے۔ کبھی کسی نے مجھے اتنی محبت سے بیٹا نہیں کہا۔ اس لفظ سے مجھے جو دولت ملی ہے وہ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ دولت دے کر اس دولت کو مت چھینئے۔“

”مگر بیٹے...“ بیگم صاحبہ نے نم ناک لہجے میں کہا۔

”یہ تحفہ میری طرف سے قرۃ العین کے لیے ہے...“ میں نے تھیلی قرۃ العین کے پیروں

میں رکھ دی۔ ”اس دنیا میں آپ کا کوئی بھائی نہیں ہے اور میری کوئی بہن نہیں ہے۔ ایک غریب

بھائی کی طرف سے بہن کے لیے حقیر سا نذرانہ۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور دروازے

کی طرف لپک پڑا۔ وہ سب تحیر سے کچھ نہ بول سکے۔ میں نے ان کی اسی حالت سے فائدہ اٹھایا اور

کمرے سے باہر آگیا۔ سڑک پر ایک خالی رکشا کھڑا تھا۔ میں نے اس کی سیٹ پر گرتے ہوئے کہا۔ ”

لیاقت آباد چلو۔“

گھر کی جانب جاتے ہوئے میں بہت خوش تھا... طبیعت میں اتنی سرشاری تھی کہ میں اپنے

آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھ رہا تھا۔ ایک لفظ میرے کانوں میں امرت گھول رہا تھا۔

میرا جسم سنستا رہا تھا۔

”بیٹے... بیٹے... بیٹے...“

... اور میری آنکھیں نم ناک ہوئی جا رہی تھیں۔

دوسرے دن میں بریف کیس لے کر رخصت بھائی کے ہاں پہنچا۔ رخصت بھائی نے بریف کیس

کھول کر دیکھا تو حیرت سے ان کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ وہ نئے نئے نوٹوں کی گڈیوں کو

ایک ایک کر کے اٹھاتے رہے اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ ان میں ساری گڈیاں سو سو کے

”ایک بات نہیں ہوئی رخصت بھائی۔ پاکت مار اور جیب تراش میں فرق ہوتا ہے۔ پاکت مار ایک بے رحم اور سفاک صفت شخص ہوتا ہے جو ہر کس و ناکس کی پاکت مارتا پھرتا ہے۔ جیب تراش وہ ہوتا ہے جو جیب نہیں کاٹتا بلکہ تراشتا ہے۔ تراش تراش کے فن سے انقلاب پیدا کرتا ہے، جیسے درزی۔ کیا جیب تراشا کوئی فن نہیں ہے جب کہ کسی بھی چیز کو تراشا ایک فن ہے۔“ میں نے انہیں سمجھایا۔ ”جیسے ہیرے کو تراشا۔“

”تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔“

”پھر کسی وقت حاضر ہو کر سمجھا دوں گا۔ اب اجازت دیجئے۔“ میں نے کہا۔

”چائے پی کر جانا۔ میرا ایک دوست حیدر آباد سے ریڑی لے کر آیا ہوا ہے۔ وہ بھی کھاتے جاؤ۔“

”ریڑی؟“ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

”جب تک تم اخبار پڑھو۔ میں ریڑی اور چائے کہہ کر آتا ہوں۔“ رخصت بھائی میری طرف اخبار بڑھا کر چلے گئے۔

میں نے اخبار کی سرخیوں پر سرسری نظر ڈالی۔ ایک سرخی پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ سرخی کچھ اس طرح سے تھی... کار اور ٹرک کے خوفناک حادثے میں مشہور اسمگلر رستم اور اس کے ساتھی ہلاک و زخمی!

میں چونک کر پوری خبر پڑھنے لگا۔ خبر تھی کہ... ”مشہور اسمگلر رستم کل شام اپنی گاڑی میں کہیں جا رہا تھا۔ اس کی کار کے پیچھے دو کاریں اور تھیں جو اسی کے ساتھیوں کی تھیں۔ تینوں کاریں گلشن کے علاقے میں ایک تنگ اور سنسان سڑک سے انتہائی تیز رفتاری سے گزر رہی تھیں کہ سینٹ کی بوریوں سے بھرا ہوا ایک ٹرک اچانک سامنے آگیا۔ کاریں اس ٹرک سے ٹکرا گئیں۔ جن کے نتیجے میں رستم اور اس کے تین ساتھی موقع پر ہلاک ہو گئے، جب کہ چار کی حالت انتہائی نازک ہے۔ ٹرک ڈرائیور معجزانہ طور پر بچ گیا، اسے صرف چند خراشیں آئیں۔“

قدرت نے رستم اور اس کے ساتھیوں سے عبرتناک انتقام لیا تھا۔ میں نے اطمینان کا ایک گرام سانس لیا جیسے میرے سینے سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو... نیلم بھی اپنی خوش بختی سے بچ گئی ورنہ رستم اسی کے پاس جا رہا تھا۔ لگاتار میں خط اور ٹیلیگرام پکارتا اور بریف کیس میں ردی رسائل پکارتا اس کی جو حالت ہوئی ہوگی میں اس سے بخوبی واقف تھا۔

فرشتہ اجل اگر اسے دنیا سے یوں نہ اچک لیتا تو نیلم یقیناً ”اس کی زندگی کی ہیئت چڑھ جاتی۔“

میں رخصت بھائی کے ہاں سے نکلا تو بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ ایک بہت بڑا کانا نکل گیا تھا اور پھر یہ کہ رقم مستحق لوگوں میں تقسیم ہونے والی تھی۔

سہ پہر تک میں گھر پر ہی رہا بلکہ رخصت بھائی کے ہاں سے آکر سو گیا تھا۔ ریڑی بہت اچھی تھی۔ میں نے کلف ہالائے طاق رکھتے ہوئے اتنی کھالی تھی کہ پیٹ بھر گیا، جی نہیں بھرا۔ گھر پہنچا تو

نوٹوں کی تھیں۔ انہوں نے میری طرف سر اٹھایا تو مجھے ان کی آنکھوں میں شکوک کی پرچھائیاں دکھائی دیں۔ انہوں نے پولیس افسر کے انداز میں پوچھا۔ ”اتنا بڑا ہاتھ کہاں مارا ہے تم نے؟“

”کہیں بھی نہیں رخصت بھائی۔“ میں نے جواب دیا۔

”دیکھو میرے سامنے جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم جانتے ہو مجھے جھوٹ سے کتنی نفرت ہے۔“

”میرے لیے اس دنیا میں آپ ہی ایسی ہستی ہیں جس کے سامنے میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ یقین کیجئے یہ رقم میں نے ہاتھ کی صفائی سے حاصل نہیں کی ہے۔“

”یہ رقم میرے پاس کیوں لائے ہو؟“ رخصت بھائی بولے۔

”اسے آپ غریبوں میں تقسیم کر دیں۔“

”کیوں؟“

”جس کی یہ رقم ہے اس کی یہی خواہش ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی معتبر آدمی کے ہاتھوں یہ رقم ضرورت مندوں اور حاجت مندوں تک پہنچ جائے۔“

”یہ کتنی رقم ہے؟“

”چھ لاکھ“

”یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ اس دور میں ایسا کون مخی پیدا ہو گیا ہے۔ بہر حال میں یہ رقم آج ہی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دوں گا۔ ویسے ضرورت مند تو تم بھی ہو۔“

”کیسے؟“

”تم دوسروں کی جیبیں جو ہلکی کرتے پھرتے ہو۔“ انہوں نے طنز کیا۔

”رخصت بھائی...“ میں نے احتجاج کیا۔ ”آپ تو جانتے ہیں کہ میں ایسے لوگوں کی جیبیں صاف کرتا ہوں جو دوسروں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔“

”تمہیں دوسروں کی جیبوں کا حال کیسے معلوم ہو جاتا ہے؟ تم قیاس کیسے لگا لیتے ہو کہ آنے والا کسی کی جیب پر ہاتھ صاف کر کے آ رہا ہے؟“

”یہ ان کے چروں پر لکھا ہوتا ہے۔ ویسے مجھ سے جیبوں کا حال پوشیدہ نہیں رہتا۔ جس طرح خدا کو دلوں کا حال معلوم ہوتا ہے، اسی طرح میں جیبوں کا حال معلوم کر لیتا ہوں۔ میں نے

چند اصول وضع کیے ہیں جن پر میں سختی سے کاربند ہوتا ہوں۔“

”تم نیک اور عظمیٰ آدمی ہو۔ میں تمہاری پاکیزہ دلی سے واقف ہوں، مگر جو داغ تمہاری پیشانی پر لگا ہے، تمہیں پسند ہے؟ دوسروں کے منہ سے لفظ پاکت مار، من کر تم کیسا محسوس کرتے

ہو؟“

”رخصت بھائی!“ میں نے ان کی بات فوراً کالی۔ ”میں پاکت مار نہیں، جیب تراش ہوں۔“

”ایک ہی بات ہوئی۔“ رخصت بھائی مسکرا دیے۔

اس نے نشہ ساداری کر دیا۔ سو کر اٹھا تو طبیعت بھاری تھی۔ اسے ہضم کرنے کے لیے صدر چلا گیا۔ شام کا وقت تھا۔ ایمپریس مارکیٹ کے بس شاپ پر... بس کے انتظار میں بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ ان میں لڑکیاں اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ جیسے ہی اوڈین سینما کا مینی شو پھوٹا اس جوم میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ پھر لائن بھی جانے والی بس آئی تو لوگوں نے اس پر ہلہ بول دیا۔ سب دیوانوں کی طرح بس میں سوار ہو رہے تھے میں بھی کسی نہ کسی طرح بس میں سوار ہو گیا۔ جب بس بھر گئی اور قحط دھرنے کی جگہ بھی نہ رہی تو وہ چل پڑی۔ میں بھری بس میں موٹا شکار تلاش کر رہا تھا۔ کسی ٹھکڑے شکار پر ہاتھ ڈالنے ہی سے شکار کا لطف آتا ہے۔ میری نظریں ایسے کسی شکار کو تلاش کر رہی تھیں کہ دفعتاً "ایک آواز گونجی "میرا بڑوہ... ہائے میرا بڑوہ... پاکت مار۔"

دوسرے ہی لمحے ملی جلی آوازوں کا شور اٹھا۔ "پکڑو... پکڑو... جانے نہ دینا... دیکھنا... جانے نہ پائے۔"

"کہاں ہے...؟ کدھر ہے...؟ کون ہے؟" بیک وقت کئی مسافروں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔

"ہو گا کہاں... وہ کسی بس شاپ پر اتر چکا ہو گا۔" ایک نے کہا۔

"میں نے تین آدمیوں کو گورا قبرستان اترتے ہوئے دیکھا تھا۔" ایک بوڑھے نے چیخ کر بتایا جو گیٹ کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"میں تو مر گیا... اب کیا کروں؟" جس شخص کی جیب کئی تھی وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ ایک بوڑھا تھا اس کے سر اور مونچھوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اپنی وضع قطع، بشرے اور لباس سے وہ ملازمت پیشہ لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے اور میرے درمیان چار پانچ مسافر حائل تھے۔ میں ان لوگوں کو چرتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ اس کا چہرہ متحیر ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس پر دورہ پڑنے والا ہو۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ "تمہارے بٹے میں کتنی رقم تھی؟"

"چھ سو روپے"

"چھ سو روپے!" قریب کھڑے ہوئے شخص نے حیرت سے کہا۔ "اتنی بڑی رقم تم نے حفاظت سے نہیں رکھی؟"

"بٹے میں نہ رکھتا تو اور کہاں رکھتا؟ وہ رقم میری نہیں تھی۔" بوڑھے نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"تمہاری نہیں تھی تو پھر کس کی تھی؟" میں نے متحجب ہو کر پوچھا۔

"بڑے صاحب نے اپنے ایک دوست کو پہنچانے کے لیے دی تھی۔ وہ ڈرگ کالونی میں رہتے ہیں۔ اب میں کیا کروں؟" وہ آدھ زاری کرنے لگا۔

"تھانے میں جا کر رہت کھوا دو" تہذیب سے کسی نے مشورہ دیا۔

"رہت کھوانے سے کیا ہو گا؟ رقم ملنے سے تو رہی۔" کسی دوسرے نے کہا۔ "ان جیب کتروں سے پولیس والوں کی ملی بھگت ہوتی ہے۔"

"سب پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے۔" رہت کھوانے کا مشورہ دینے والے نے کہا۔

"اب تک جیب کھٹے کے کتنے کیس پکڑے گئے ہیں؟" ایک اور مسافر نے تکرار کی۔

ایک مسافر نے چیخ کر کہا "کیا باتیں ہی کرتے رہو گے! میں کہتا ہوں بس رکوا کر سب کی تلاشی لو۔"

"بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ بد معاش کسی بس شاپ پر اتر گیا ہو گا۔ جیب کتروں بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ اپنا کام دکھانے کے بعد ایک منٹ بھی نہیں رکتے۔ ممکن ہے اب وہ کسی ہوٹل میں پہنچ کر گلچہرے اڑا رہا ہو۔"

مسافر تکرار کر رہے تھے اور بوڑھا آنسو بہا رہا تھا۔ سب اسے زبانی تسلیاں دے رہے تھے۔

میں نے بھری ہوئی بس کا جائزہ لیا کہ شاید اپنے علاوہ کوئی پاکت مار نظر آجائے۔ میں شہر کے بہت سے پاکت ماروں کو پہچانتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کوئی پاکت مار نظر آجائے تو اس سے بڑوہ لے کر واپس کر دوں گا۔ مگر مجھے ایسی کوئی مانوس شکل نظر نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ جس نے جیب کاٹی تھی وہ کسی بس شاپ پر اتر چکا تھا۔

"رو کیوں رہے ہو؟" ایک مسافر نے بوڑھے سے پوچھا۔

بوڑھے نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "روؤں نہیں تو کیا کروں۔ مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ چھ سو روپے تو چھ برس میں بھی ادا نہیں کر سکوں گا۔ پھر میرا مالک ایک سخت گیر آدمی ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا سمجھے گا اور کیا سزا دے گا۔"

"تو اب وہاں جا کر کیا کرو گے؟ بیس کہیں اتر جاؤ اور سارا قصہ جا کر مالک کو سناؤ۔ شاید اسے رحم آ ہی جائے۔" اسی مسافر نے مشورہ دیا۔

"میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ میرے مالک کا دوست میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ میں اسے سارا ماجرا سنا کر ہی واپس جاؤں گا۔"

میں نے دل میں سوچا کہ اس غریب بوڑھے کی مدد کرنا چاہیے۔ یہ غریب آدمی آخر اتنی بڑی رقم کیسے ادا کرے گا۔ مالک لوگ ویسے ہی غریب ملازموں کے بارے میں سخت اور شکنجی مزاج ہوتے ہیں۔ دفعتاً "میری نگاہ ایک شخص پر پڑی جو زسری سے سوار ہوا تھا۔ وہ بڑا اپ ٹوڈیٹ تھا۔ بہت چمکتا ہوا۔ آسودگی کی چھاپ اس کے چہرے پر بہت گہری تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بڑا سا کانڈی لفافہ تھا جس میں شہرت کا بکس تھا۔ گویا وہ خریداری کر کے بس میں سوار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی، جو زنانہ حصے میں نوار ہوئی تھی۔ وہ شخص لیڈر پارٹیشن کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

پہلے جیب کٹی ہے۔"

"کنڈیکٹر نے بس رکوا دی۔ ایک شخص نے چیخ کر کہا۔ "دیکھو کسی کو بس سے اترنے نہ دیتا۔"

"کنڈیکٹر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "میں پولیس والے کو بلا کر لاتا ہوں۔"

میں نے نادانستگی میں اس غریب بوڑھے کو ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ اس کی نمازیں بخشوا رہا تھا کہ روزے گلے پڑ گئے۔ بوڑھے کو خبر بھی نہیں تھی کہ وہ بوڑھے اس کی جیب میں ہے۔ جب اس کی جیب سے بوڑھے برآمد ہو گا تو اس کی کیا درگت بنے گی۔ لوگ تو ایسے موقعوں پر چوروں اور جیب کٹروں کو روٹی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے ہیں۔ اب اس غریب کا بھی یہی حشر ہونے والا تھا۔

میں غریب بوڑھے کی طرف سے فکر مند ہو گیا تھا۔ میں عجیب و غریب صورت حال سے دو چار تھا۔ اس وقت جوائنٹن کچھ ایسی تھی کہ اس کی جیب سے بوڑھے نکال کر فرش پر بھی نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس لیے کہ کوئی بھی میری یہ حرکت دیکھ سکتا تھا۔ بوڑھا خوش ہو رہا تھا کہ جیب کٹ کر اٹھا جائے گا تو اس کی رقم بھی اسے مل جائے گی۔ وہ اپنا غم بھول گیا تھا۔ بلکہ پر جوش نظر آ رہا تھا۔ رقم ملنے کی امید نے اس میں پھر سے توانائی پھونک دی تھی۔ وہ طیش میں بولا۔ "اگر وہ حرام زادہ میرے ہاتھ لگ گیا تو اس کا بھرکس نکال دوں گا۔"

پہلے تو میرے جی میں آیا کہ رضا کارانہ طور پر میں جرم کا اقبال کر کے اس بوڑھے کو بچا دوں۔ وہ خواہ مخواہ نا کردہ گناہ کی سزا کیوں بھگتے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس کے بوڑھاپے کا خیال کر کے لوگ ذرا ہاتھ پیر کم چلائیں گے۔ اس کے جیل جانے کی صورت میں اس کی ضمانت کرا سکتا ہوں۔ جب کہ میرے پکڑے جانے پر مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا جائے گا۔ پھر میری ضمانت کون لے گا۔ میں اپنے کسی شناسا کو جیل کے چکر نہیں لگوانا چاہتا تھا۔ خود اس بوڑھے شخص کے لیے سینکڑوں چکر لگا سکتا تھا۔

میں نے اس بوڑھے شخص سے پوچھا۔ "چاچا! تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں رہتے ہو؟"

"ابو میاں۔" اس نے جواب دیا۔ "نئی آبادی میں رہتا ہوں۔"

"کس کے پاس کام کرتے ہو؟"

"صدر میں دفتر ہے، اس میں ملازمت کرتا ہوں۔"

بس کنڈیکٹر جا کر ایک پولیس مین کو بلا لایا۔ وہ اب ہر مسافر کی تلاشی لے رہا تھا۔ وہ نوجوان جس کی جیب میں نے ہلکی کی تھی، پولیس والے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ جب کہ بوڑھا میرے ساتھ تھا۔ مجھ سے پہلے اسی کی تلاشی لی جانے والی تھی۔ ایک مسافر نے کہا۔ "بھئی آپ اس غریب کی تلاشی کیوں لے رہے ہیں۔ اس بے چارے کی جیب بھی اسی بس میں کٹ چکی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ پولیس والا بولا۔ "تم لیک طرف ہو جاؤ۔"

میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ مگر اس وقت سانس سینے میں اٹکنے لگی جب پارٹیشن کی

بس چل پڑی تو کنڈیکٹر نے اس سے نکٹ کے پیسے مانگے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس شخص کی جیب بھاری ہے۔ جب اس نے اپنی پتلون کی جیب سے بوڑھے نکال کر کھولا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس کے بوڑھے میں سو سو کے چھ سات نوٹوں کے علاوہ دس اور پانچ کے بھی کئی نوٹ تھے۔ اس نے پانچ کا ایک نوٹ نکال کر محمد علی سوسائٹی کے دو نکٹ لیے۔ کنڈیکٹر نے جو رقم واپس دی اسے پرس میں رکھ کر وہ کھڑکی سے بھاگتا ہوا منظر دیکھنے لگا۔ ایک آدھ بار اس کی آنکھیں اپنی بیوی سے بھی ٹکرائی تھیں۔۔۔ میں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے بس کا ایک جائزہ لیا۔ پھر کھسکا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ اس کے بعد میرے دائیں ہاتھ نے اپنے فن کا مظاہرہ اس تیزی اور پھرتی سے کیا کہ میں خود بھی اس حیرت انگیز مہارت پر عجب عجب کر اٹھا۔ ایک طرف تو میری آنکھیں کام دکھا رہی تھیں اور دوسری طرف لٹائیں مسافروں کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کسی کو مجھ پر شبہ تو نہیں ہوا۔ کام دکھانے کے بعد میں اگلے قدموں پیچھے ہٹا، پھر میں نے اس نوجوان کا بوڑھے غیر محسوس طریقے پر بوڑھے کی جیب میں کھسکا دیا۔ اس کا شانہ چھپتے پھپتاتے ہوئے کہا۔ "چاچا غم نہ کرو۔ خدا نے چاہا تو تمہاری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔"

"نہیں بیٹے، خدا غریبوں سے بہت ناراض رہتا ہے۔ وہ غریبوں کی نہیں، امیروں کی سنتا ہے۔" وہ سختی سے بولا۔

"ماویسی کی باتیں نہ کرو۔ دن پھرتے دیر نہیں لگتی۔" میں نے اسے امید بندھائی۔

ویسے میری نگاہ اس نوجوان پر لگی ہوئی تھی۔ موسم قدرے گرم تھا اور لوگ پسینہ بہا رہے تھے۔ اس نوجوان نے پیٹ پونچھنے کے لیے سائڈ پاکٹ سے رومال نکالا پھر اسے سائڈ پاکٹ میں رکھنے کی بجائے، ہپ پاکٹ کی طرف ہاتھ لے گیا۔ شاید بے خیالی میں اسی وقت اسے اپنی جیب ہلکی ہونے کا احساس ہوا۔ "میرا بوڑھے۔۔۔ میرا بوڑھے۔۔۔" وہ ہلکی کی سی تیزی سے اچھل کر گھوما۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور اس کی نظریں بس کے مسافروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جیسے وہ جیب کترے کو تلاش کر رہا ہو۔ "کہاں ہے وہ جیب کتر؟" وہ چیخا۔

"کتنی رقم تھی؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"آٹھ سو دس روپے۔" اس نے جواب دیا اور پھر اس نے چیخ کر کنڈیکٹر سے کہا۔ "بس

رکواؤ۔"

"بس رکوانا بے کار ہے۔" میں نے مردہ لہجے میں کہا۔ "جیب کتر تمہاری جیب صاف کر کے اتر گیا ہو گا۔"

"نہیں اترا ہو گا۔ چند منٹ پہلے تو بوڑھے میری جیب میں تھا۔" وہ سراسیمگی سے بولا۔ "اتنی جلدی پار کر کے وہ کیسے اتر سکتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بس روکو،" میں اترا ہو گا۔ "قریب کھڑے ایک مسافر نے تائید کی۔ "بس لال کوٹھی کے بعد کہیں پر نہیں رکی۔"

"یقیناً۔۔۔ وہ نہیں اترا ہو گا۔" کچھ لوگ چلانے لگے۔ "اس بوڑھے کی بھی تو کچھ دیر

کر کے پھر سے اس کی پٹائی کرنا چاہتے تھے۔

ایک ایک خیال میرے ذہن میں کوندا بن کر لپکا اور میں چیخ پڑا "ٹھہرو!" یہ کہہ کر میں مجھے کو چیرتا ہوا بوڑھے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بے چارہ ادھ موا ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے خون جاری تھی اور اس پر نزع کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا اور اس کے لیے اٹھ بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟" پاکت زدہ صاحب کو میری مداخلت ناگوار گزری تھی۔

"انسان ہوں" میں نے تڑ سے جواب دیا۔ "کیا ایسا نہیں ہوا ہو گا کہ جیب کترے بد معاش نے بڑھ اس بے چارے کی جیب میں ڈال دیا ہو؟" میں نے مجھے اور پولیس والے کی جانب پر امید نظروں سے دیکھا، جیسے انہیں میری بات کا یقین آجائے گا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا اس وقت اسے احساس نہیں ہوا ہو گا؟" ان صاحب نے دلیل پیش کی۔

"آپ نہیں جانتے یہ جیب کترے کتنے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے مشاق ہاتھ میں کسی چیز سے کی سی نرمی ہوتی ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں کسی بھی شخص کی جیب سے کوئی چیز نکال لیتے ہیں یا اس طرح رکھ دیتے ہیں کہ پتہ نہیں چلا۔" میں نے تہہ لبجے میں کہا۔

"تم تو اس طرح سے کہہ رہے ہو جیسے خود جیب کترے ہو۔" اس کے لبجے میں تمسخر تھا۔ اس بات پر کچھ لوگوں کے دانت نکل پڑے لیکن یہ جملہ مجھے ڈنک بن کر لگا۔ میں نے فوراً ہی سنبھل کر کہا "دراصل میں دو ایک بار ایسے تلخ تجربات سے گزر چکا ہوں۔ کیا آپ کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی نے آپ کا پرس اڑا لیا ہے؟" میں نے پیتر ابدلا۔

"نہیں تو...." وہ قدرے بوکھلا گیا۔

"جیب کترے اتنے احمق نہیں ہوتے کہ تلاشی کے موقع پر بڑھ اپنے پاس رکھیں اور جیل کی ہوا کھائیں۔"

"ہاں یہ ممکن ہے۔" مجھے میں سے ایک آواز نے میری تائید کی۔

"یہ غریب بوڑھا جیب کترا نہیں ہو سکتا۔ اسے چھوڑ دیا جائے۔" دوسری آواز ابھری۔

"ارے بیٹے!" ایک بارلش آدمی نے جو پاکت زدہ صاحب کی پشت پر کھڑے تھے، نرمی سے کہا "بڑھ مل گیا۔ رقم مل گئی۔ خدا کا شکر ادا کرو۔ اگر یہ بوڑھا واقعی جیب کترا ہے تو اس کے بڑھاپے پر ترس کھا کر اسے چھوڑ دو۔ معلوم نہیں اس نے کس مجبوری کے تحت ایسا کیا ہو گا۔"

بوڑھا جو اتنی دیر میں کسی قدر سنبھل چکا تھا۔ بدقت تمام کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں غریب ضرور ہوں، مگر جیب کترا نہیں ہوں۔ ملازمت کرتا ہوں، مجھے کسی کی جیب کانٹنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔" اس نے قدرے توقف کر کے ایک لمبا سانس لیا۔ "کچھ دیر پہلے اسی بس میں خود میری جیب کٹ چکی ہے۔ بھلا میں کسی دوسرے کی جیب کیسے کاٹ سکتا ہوں؟"

"تم رچے کہاں ہو؟"

دوسری جانب سے اس کی بیوی ہڈیانی انداز میں چیختی گئی۔ "نہیں... نہیں" اس کی بھی تلاشی لو۔ میں کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی۔"

میرے بس میں ہوتا تو جا کر اس خبیث کام نہ نوچ لیتا مگر بے بسی سے کسما کر رہ گیا۔ بالآخر وہ جانگسل لہر آپہنچا... جس کے انتظار میں پہلے ہی خون خشک ہو چکا تھا۔ پولیس والے نے تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ بڑھ اس بوڑھے کی جیب سے برآمد کر لیا۔ نوجوان اسے دیکھ کر بولا۔

"ہاں... ہاں... یہی ہے، یہ بڑھ میرا ہے... یہ دیکھئے اس میں میری تصویر رکھی ہے۔"

وہ درست کہہ رہا تھا، اوپری پلاسٹک کور میں اس کی تصویر رکھی تھی۔ بوڑھا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا مگر یہ سانچہ اس کے لیے جانکاف تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اور اس کا جسم کسی تنگی جیسے کی طرح غیر متحرک تھا۔ اطراف میں کھڑے ہوئے لوگ بھی سکتے کی سی حالت میں تھے۔ اس ایک لمحے کے لیے کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرنا چاہئے؟

"اپنے لئے کا ڈرامہ کر کے دوسروں کو لوٹا ہے...؟" ایک مسافر دھاڑا۔

"کیسے... بد ذات کچھ اپنی عمر کا تو خیال کیا ہوتا۔"

بوڑھا ششدر تھا۔ یقیناً یہ سب اس کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ اس کی گویائی سلب ہو گئی تھی۔ البتہ لا شعوری طور پر اس کے ہونٹ ضرور مل رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے حواس مجتمع کر پاتا اور لوگوں کے سامنے وضاحت پیش کرتا، نوجوان نے آگے بڑھ کر اس کے رخسار پر بھرپور تھپڑ رسید کر دیا، لوگ تو جیسے اس کے خطرے تھے۔ وہ اس پر پل پڑے، پولیس والا ہائیں ہائیں کرتا رہ گیا۔

... اور میں اپنا سریوں سہلانے لگا جیسے دماغ پر گری چڑھ گئی ہو۔

☆☆☆

وہ بوڑھا شخص ویسے ہی بے حد باتواں نظر آ رہا تھا اور اتنے بڑے مجھے کی پٹائی سننے کا کسی طرح بھی متحمل نہیں تھا۔ تاہم اس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے دفاع کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ مگر نثار خانے میں طوطی کی آواز بھلا کون سنتا ہے۔ لوگوں کو تو جیسے عرصہ دراز کے بعد ایک سنرا موقع ملا تھا جسے وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ بوڑھے کو لوگوں نے ایک لفظ بھی نہ بولنے دیا۔ چاروں طرف سے جوتے، تھپڑ اور گھونٹے برسے لگے تھے۔ ہر شخص حسب توفیق اس کی پٹائی کر رہا تھا جیسے وہ کوئی اہم فریضہ ادا کر رہا ہو۔ شیطان کو کنکریاں مار رہا ہو۔ میں خاموش تماشا کی بنا کھڑا رہا۔ اگر میں اس کا ساتھی بن کر مداخلت کرتا تو میری بھی ایسی زبردست پٹائی ہوتی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ بوڑھا ان شدید حملوں کی تاب نہ لاکا۔ وہ ڈگڈگاتا اور لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گر پڑا تھا۔ میں اس کی حالت کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا کیونکہ وہ لوگوں میں پوری طرح گمراہ ہوا تھا۔ میں مجمع سے الگ کھڑا تھا۔ بوڑھے کے گرتے ہی میں نے وہ تین نوجوانوں کو اس پر جھکتے دیکھا، غالباً وہ اسے کھڑا

میں بھی اس جھوم میں شامل ہو گیا، جو بس میں سوار ہو رہا تھا۔ وہیں کھڑے ہو کر میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا جس کی قمیص پر خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ وہ زمین پر غشی کی حالت میں پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔ پولیس والے نے ایک خالی رکشے والے کو جو اس کے سامنے سے گزر رہا تھا، اشارے سے بلایا۔ بس میں سوار ہونے کے بعد کیا ہوا مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ بس کچھ کچھ بھر گئی تھی۔ میں مسافروں کے بیچ میں پھنسا ہوا اپنے شکار پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں نے عمدہ کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر اس کا ہونہ پار کر کے رہوں گا۔ اتفاق سے اسے بس میں بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں ملی۔ وہ لیڈیز پارٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میرے لیے یہ سہرا موقع تھا۔ ایک ایک پل میرے لیے بے حد قیمتی تھا۔ میں تیزی سے مجھے کو چیرتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اس بھیڑ بھاڑ اور افراتفری سے میں نے ہمیشہ کی طرح فائدہ اٹھایا۔ پلک جھپکنے میں اس کا ہونہ میری جیب میں تھا۔ پھر میں بے حد غیر محسوس انداز میں دروازے کی جانب بڑھا۔ بس اشارت ہو رہی تھی۔ میں نے بس سے اترنے میں بڑی تیزی اور پھرتی دکھائی۔ دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ بس چل پڑی۔

بس سے اتر کر میں نے دیکھا پولیس والا اس بوڑھے کو رکشا میں قربانی کے کسی جانور کی طرح ڈال کر لے جا رہا تھا۔ یہ موقع نہیں تھا کہ میں بھی اس کے پیچھے تھانے جاؤں۔ اگر میں تھانے جاتا تو پولیس مجھے اس بوڑھے کا ساتھی سمجھ کر حوالات میں بند کر دیتی۔ پولیس کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ مجھے وہاں سے فوراً نو دو گیارہ ہونا تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ پاکٹ زدہ صاحب غیر شعوری طور پر اپنی اس جیب کو چھتیا کر دیکھیں گے جس میں ہونہ تھا۔ جب وہ دوبارہ اپنا ہونہ غائب پائے گا تو فوراً بس رکوا دے گا۔ پھر لوگ اسے میرے بارے میں بتائیں گے کہ جو شخص بس کے چلتے ہی گرمی اور جس کا ہمانہ کر کے کودا تھا، وہی جیب تراش تھا۔ ان صاحب کو مجھے بچانے میں دیر نہیں لگے گی۔ وہ میری تلاش میں نکل پڑیں گے۔

میں نے سامنے سے گزرتے ہوئے رکشا کو روکا، اس کی سیٹ پر خود کو گراتے ہوئے کہا۔
"الاعظم چلو۔"

رکشا کا رخ الاعظم اسکوائر کی طرف ہو رہا تھا۔ اس وقت میں نے بس کو بہت دور سڑک کے کنارے ٹھہرتے ہوئے دیکھا۔ وہ بس اسٹاپ نہیں تھا۔ میرے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں تصور میں پاکٹ زدہ صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ اب شاید انہیں یقین آ رہا ہو گا کہ ایک مشاق ہاتھ کا کمال کیا ہوتا ہے، ساتھ ہی اسے اس بوڑھے کی بے گناہی کا بھی یقین آ رہا ہو گا۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہا ہو گا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سوچا، کاش! میں بھی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی زردی دیکھ سکتا۔

گھر پہنچ کر میں نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر بڑے اطمینان سے چوکی پر بیٹھ کر ہونہ جیب سے نکالا اور اس کی زپ کھول کر اندر کی ساری چیزیں بستر پر الٹ دیں۔ کل رقم آٹھ سو روپے تھی۔ بونے میں ملاقاتی کارڈ، دو تین رسیدیں، اس شخص اور اس کی بیگم کی تصویریں تھیں۔ میں نے سب

"نئی آبادی میں رہتا ہوں۔ صاحب کی رقم پہنچانے ڈرگ روڈ جا رہا تھا۔"

"جھوٹ بولتے ہو۔" پاکٹ زدہ صاحب نے بھڑک کر پھر بوڑھے پر ہاتھ جھوڑ دیا۔ "یہ

کیوں نہیں کہتے کہ جیب کاٹنے کے لیے بس میں سفر کر رہے تھے۔"

"یہ لوگ بڑے مکار ہوتے ہیں۔" پولیس والے نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

مجھے ہر روز ان سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ان پر ترس نہیں کھانا چاہیے۔" پولیس والے نے اپنی

گھڑی دیکھی اور چونک پڑا، جیسے اسے اچانک ہی کچھ یاد آگیا ہو۔ اس نے پاکٹ زدہ صاحب کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کہیں تو اسے جھوڑ دیا جائے۔ یہ بہت بوڑھا ہے۔ اب مرے

ہوئے کو کیا مادیں۔"

"نہیں!" پاکٹ زدہ صاحب بل کھا کر بولے۔ "آپ قانون کے محافظ ہو کر ایک مجرم پر

ترس کھا رہے ہیں؟ جرم، جرم ہوتا ہے چاہے کوئی شخص عمر کے کسی حصے میں بھی۔ اس کا ارتکاب

کرے۔ یہ بد معاش رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ اسے تھانے لے جاؤ ورنہ ڈی ایس پی سے شکایت کر

دوں گا۔ وہ میرے پڑوس میں رہتے ہیں۔ جناب تنزیل الرحمن!"

پولیس والا ڈی ایس پی کا نام سنتے ہی گھبرا گیا اور گزبوا کر بولا۔ "نہ صاحب نہ! آپ ان

سے کچھ نہ کہتے گا۔ میں اس مردود کا ابھی بندوبست کر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے بوڑھے کی

گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ "چل بے بڑھے! تو نے آج میرے پروگرام کا ستیاناس کر دیا۔ اب میں

تیرا ستیاناس کروں گا۔" اس نے بڑھے کو زور سے دھکا دیا۔ بوڑھا اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار

نہ تھا۔ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، لڑکھاتا ہوا اچھے پر جاگرا۔ نتیجے میں بہت سے ایسے لوگ بھی

موجود تھے جو شاید اپنی جیبوں کا اندر نہ جیب کتروں کو دے چکے تھے ایسے دل جلوں کو اس بوڑھے

سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی۔ پھر کیا تھا، انہوں نے پولیس والے کی موجودگی ہی میں اسے روٹی کی

طرح دھک کر دکھ دیا۔ جب وہ لوہان ہو گیا اور غش کھا کر زمین پر گر پڑا تو مجھے کو جیسے اس پر

رحم آگیا۔ پھر وہ ایک ایک کر کے بس میں سوار ہو گئے۔ پاکٹ زدہ صاحب بس میں سوار ہونے کے

لیے مسافروں کے جھوم کو چیر کر پاگلوں کی طرح چڑھتا چاہ رہے تھے۔ ادھر ان کی بیگم لیڈیز

کپلہ ٹنٹ میں داخل ہو چکی تھیں۔ شوہر صاحب کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اس شخص کی بے رحمی پر مجھے غصہ آ رہا تھا۔ نفرت کا ایک آتش فشاں میرے سینے میں دھک

رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس سے کیسے انتقام لیا جاسکتا ہے۔ اس نے خواہ مخواہ ایک کمزور بوڑھے

کو قانون کے حوالے کیا، درگزر کر دیتا تو اس کا کیا بگڑتا۔ پولیس والا بھی تو اسے چھوڑنے کے لیے

تیار تھا۔ اچھے ہوئے خیالات کے باوجود سوچتے سوچتے ایک دم سے یہ خیال سا آیا کہ کیوں نہ میں

اس کی جیب کی صفائی کر دوں۔ یہ رقم بہت کام آسکتی ہے۔ اس بوڑھے کو رہائی دلانے میں مدد دے

سکتی ہے۔ اس طرح میں اس شخص کو سزا دیتا چاہتا تھا۔ غالباً اسی طرح میرے دل میں نفرت کی آگ

سرد پڑ سکتی تھی... مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ انسان اس قدر شقی القلب بھی ہو سکتا

حسین کما جاسکا تھا۔ اتنی حسین تھی کہ چند ثانوں تک میں اسے محبت سے نکارہ گیا۔
 ”یہ ابو میاں کا گھر ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”جی؟“ وہ استغماہ لہجے میں بولی۔ ”کون سے ابو میاں؟ ایک ابو میاں تو سامنے والے مکان میں رہتے ہیں۔“
 میں نے ابو میاں کا حلیہ بتا کر کہا۔ ”وہ والے ابو میاں۔“
 ”وہ میرے ابا ہیں،“ میں نے کہا۔ ”دفعہ گئے ہیں۔ کچھ دیر میں آتے ہوں گے۔“ وہ بولی۔ ”آپ کو ان سے کوئی کام ہے؟“
 ”گھر میں کوئی اور ہے؟“
 ”نہیں میں اکیلی ہوں۔“

”میرا مطلب ہے کہ ماں یا بھائی کوئی نہیں ہے؟ مجھے ان سے کام تھا۔“
 اس کے چہرے پر دھند سی چھا گئی۔ ”ماں اور بھائی تو کب کے چل بے۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ آپ انہیں کیوں پوچھ رہے ہیں۔؟“
 میں تذبذب میں پڑ گیا۔ ابو میاں کی لڑکی بہت حساس معلوم ہوتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اسے، اس کے باپ کی گرفتاری کی خبر کیسے سناؤں۔ دفعتاً مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے اس سے کہا ”میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں مجھے ابو میاں کے دفتر کا پتہ چاہیے۔“
 ”آپ کچھ دیر بعد آجائیں۔“ وہ پلکیں جھپکاکر مصومت سے بولی۔ ”بس وہ آتے ہی ہوں گے۔ آج انہیں معلوم نہیں کیوں دیر ہو گئی۔“
 ”تمہیں ان کے دفتر کا پتہ معلوم ہے؟“
 اس نے اپنا سر ہلایا۔ ”بیچم کارپوریشن، ایم اے جناح روڈ کپری سینما کے سامنے والی بلڈنگ میں تیسری منزل پر ہے۔“
 ”تم اپنے پردوس کی کسی عورت کو کچھ دیر کے لیے بلا سکتی ہو، جو تم سے بہت قریب ہو۔“
 ”کیوں؟“ اس کی سیاہ آنکھوں سے حیرت جھانکنے لگی۔
 ”ابو میاں کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔“
 ”کیا کہنا ہے؟“ وہ گھبرا سی گئی۔ ”جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو۔ کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟“
 اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔

”خیریت ہی ہے۔ بات کچھ ایسی ہے کہ میں کسی اور کی موجودگی میں کہنا چاہتا ہوں۔“
 برابر والے مکان سے پختہ عمر کی ایک عورت نکل آئی۔ وہ اپنے گھر کی کھڑکی میں کھڑی ہم دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے ابو میاں کی بیٹی کے پاس پہنچ کر مجھ پر ایک اچھتی سی نظر ڈالی، پھر اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”خبریں کیا بات ہے؟ یہ کس کو پوچھ رہے ہیں؟“
 ”چاچی! یہ ابا کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر مجھے نہیں بتا رہے ہیں۔“
 ”اچھا!“ عورت نے ایک ٹانے کے لیے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ اس نے موقع کی

سے پہلے نفرت سے ان تصویروں کے پرزے پرزے کر دیے۔
 رقم میں نے اندر کی جیب میں رکھ لی ہوئے سے برآمد ہونے والی دوسری چیزیں اور ہتھوڑوں کی نظریں بچا کر ایک گٹر میں ڈال دیا۔ اب میرے دل میں ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی۔ انتقام کی آگ آپ ہی آپ سرد ہو گئی۔ میں اس بوڑھے، ابو میاں کے بارے میں سوچ رہا تھا، جو غریب تھانے جا کر پولیس کے ظلم کا نشانہ بن رہا ہوگا۔ وہ ساری رات بھوک پیاس اور کرب سے تڑپتا رہے گا۔ اس پر کسی پولیس والے کو رحم نہیں آئے گا۔ لہذا مجھے تھانے جا کر کسی نہ کسی طرح اس بوڑھے کو قتل دے کر آنا ہوگا۔ پولیس والوں کی جیب گرم کر کے اس کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرنا ہوگا۔

تھانے جانے سے پہلے ہی میں نئی آبادی پہنچ گیا۔ اس لیے کہ میں اس کے گھر والوں کو اس کی گرفتاری کے بارے میں جانا چاہتا تھا تاکہ اس گھر کے کسی فرد کو لے کر تھانے پہنچوں۔ ابو میاں کی ڈھارس بندھ جاتی۔ اس کے بعد مجھے ابو میاں کے دفتر کا پتہ معلوم کرنا تھا اور اس کے مالک کو گرفتاری کی اطلاع دینا تھی۔ تاکہ وہ ابو میاں کی رہائی کی کوشش کر سکیں۔

نئی آبادی پہنچ کر میں عجیب سی الجھن میں پڑ گیا۔ اتنے بڑے علاقے میں ابو میاں کے مکان کا پتہ معلوم کرنا آسان نہیں تھا۔ میرے پاس مکان نمبر نہیں تھا۔ پھر یہ کہ میں نہیں جانتا تھا کہ ابو میاں کون ہیں، کیا ہیں اور کس دفتر میں کام کرتے ہیں۔ مجھے ان کے بیوی بچوں کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ کسی شخص کو نامکمل پتے کے ساتھ تلاش کرنے میں بے حد دشواری ہوتی ہے۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ میں نے ایک گلی میں فٹ بال کھیلتے ہوئے بچوں سے پوچھا۔ ”تم لوگ ابو میاں کو جانتے ہو؟“

”کون ابو میاں؟“ ان میں سے ایک لڑکا، جو تیز و طرار نظر آ رہا تھا اس نے پوچھا۔ ”میاں بچاسوں ابو میاں رہتے ہیں، ایک تو میرے گھر میں بھی ہیں۔“
 ”بچاس ابو میاں؟“ میں نے اپنا سر کھجایا۔ پھر اس لڑکے کو ابو میاں کے چہرے مرے اور وضع قطع کے بارے میں بتایا۔

وہ لڑکا چند لمحوں تک سوچتا رہا، پھر اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ ”اچھا! آپ میرے ساتھ آئیے۔“

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ٹنگ و تاریک اور گندی گلیوں سے گزرتا ہوا ایک مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ وہ ایک بو سیدہ اور ڈر با سا مکان تھا۔ وہ لڑکا مکان پر پہنچانے کے بعد میرا شکریہ وصول کر کے چلا گیا۔ میں اپنے دروازے پر وقفے وقفے سے دو تین بار ہلکی ہلکی دستک دی۔
 ”کون ہے؟“ ایک باریک اور مترنم سی آواز آئی، پھر دروازہ کھل گیا۔

چوکت سے ایک سراپا لگا دکھائی دیا۔ وہ سراپا سیاہ چوڑے کناروں کی گہرے نیلے رنگ کی ساڑی اور نیلے رنگ کے بلاؤز میں ملبوس تھا۔ گھنے چمکیلے لمبے سیاہ بال اس کے شانے پر بکھرے ہوئے تھے جیسے گٹھاؤں کے چھ ایک چاند دمک رہا ہو۔ وہ ایک نوجوان اور پرکشش لڑکی تھی۔ بلاشبہ اسے

میرے ابو شریف آدمی ہیں، جیب کترے نہیں ہیں۔“
میں نے ختم پر ایک اچھتی سی نظر ڈال کر کہا۔ ”تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔“
”کیوں؟ اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ ”میرے باپ کو قید کر دیا گیا ہے اور میں نہ جاؤں۔“

چاچی، جو بات کی تہ تک پہنچ گئیں تھیں ختم کے قریب ہو کر بولیں۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔“

پھر ختم کی سمجھ میں بھی آگیا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے۔ ”آپ کس کو ساتھ لے جائیں گے۔ یہاں تو کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جسے آپ کے ساتھ تھامے بھیجوں۔“
”آپ کے شوہر ہیں؟“ میں نے چاچی سے دریافت کیا۔

”وہ ایک ہفتے کے لیے کل ہی فیصل آباد گئے ہیں۔“
”ٹھیک ہے۔ میں خود ہی جا کر کوئی نہ کوئی کوشش کرتا ہوں۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔
پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دو ایک دن کی بات ہے۔ ابو میاں رہا ہو کر آجائیں گے۔“

جب میں دروازے کی طرف بڑھا تو ختم بولی۔ ”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟“
میں نے اپنا نام بتایا تو چاچی نے کہا ”بھیا یہ لوگ بڑے غریب ہیں۔ تم ان غریبوں کی مدد کرو گے تو ساری زندگی دعائیں پاؤ گے۔“
میں سر ہلا کر مکان سے باہر آگیا۔

رکشے کے ذریعے کپہری سینما پر اترا تو دن، شام کے دھندلکے میں ڈوب چکا تھا۔ ہر سمت سے اندھیرا شام کے دھندلوں کو لٹکنے کے لیے چھا رہا تھا۔ مجھے امید تو نہیں تھی کہ ابو میاں کے مالک سے ملاقات ہو گی، اس لیے کہ دفتر شام پانچ بجے سے بند ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی ایک مہووم سی امید لیے چلا آیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر دفتر بند ہوا تو چونکدار سے گھر کا پتہ دریافت کر کے مالک کے گھر پہنچ جاؤں گا۔ جب میں پیچم کارپوریشن کے دفتر کے دروازے پر پہنچا تو اتفاق سے دفتر کھلا ہوا نظر آیا۔ استقبالیہ کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ خالی پڑا تھا، دائیں جانب پیشے کا ایک دروازہ تھا۔ یہ دروازہ ایک بڑے ہال میں کھلتا تھا۔ میزوں اور کرسیاں خالی پڑیں تھیں۔ میزوں دو روہ ہال کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلی گئیں تھیں۔ میزوں کے درمیان ایک راہ داری سی بن گئی تھی جو ایک بڑے کمرے پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ اس کمرے کا دروازہ کسی قدر کھلا ہوا تھا اور اندر روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کپہری کے مالک کا کمرہ ہے۔ دفتر بے حد شاندار اور خوبصورت تھا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ جب میں نے دروازہ کھول کر ہال میں قدم رکھا تو آواز تک نہ ہوئی۔ اندر پہنچے ہی اس کمرے سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں اس کمرے سے فدرے فاصلے پر تھا کہ میرے کانوں میں ایک کرخت سی آواز گونجی۔ وہ ابو میاں کا نام لے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں ٹھٹھکیا، غور سے سننے لگا۔ وہ آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ ”جناب کام بخیر و خوبی ہو گیا۔ جی بڑا مشہور جیب کترا ہے۔ اس نے ابو میاں

نراکت کو سمجھ لیا تھا۔ وہ بے حد سمجھدار تھی۔ اس نے اندر جا کر کہا ”آپ اندر آجائیے۔“
گھر کے آگن میں داخل ہوتے ہوئے میں نے اس کا جائزہ لیا۔ آگن بہت چھوٹا تھا۔ نیم کا ایک درخت دیوار کے پاس تھا اور امروہ کا ایک درخت کمرے کے سامنے تھا۔ آگن میں ایک چھوٹی سی چوکی پڑی تھی۔ وہ صاف تھی، پھر بھی ختم نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک کپڑا اندر سے لا کر اسے صاف کیا۔ اس کی چاچی نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں جیسے ہی چوکی پر بیٹھا چاچی نے پوچھا۔ ”ہاں اب تاؤ کیا بات ہے؟“

میری نظر ختم کے چہرے پر پڑی۔ اس کے چہرے پر زردی سی چھاری تھی۔ وہ کچھ کچھ سمجھ گئی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں نے کھنکار کر گھلا صاف کیا اور بولا۔ ”ابو میاں کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔“

”کیا؟“ ختم اچھل پڑی۔ اس کا حسین چہرہ متغیر ہو گیا۔ چاچی بھی بری طرح چوکی تھیں۔
”مگر کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”کوئی ایک گھنٹہ پہلے پولیس نے انہیں جیب کاٹنے کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”ایں۔“ ختم اس طرح چوکی جیسے اس کے دل میں نشتر سا جھما ہو۔ ”یہ جھوٹ ہے۔ میرے ابا ایسے نہیں ہیں؟“ اس کی سرگیں آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے آگے بڑھ کر چاچی کا سارا لیا، جیسے اس کا سر چکرا رہا ہو۔ چاچی کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔

پھر میں نے کسی قدر تفصیل سے ان دونوں کو بس کا واقعہ سنایا۔ دانستہ طور پر اپنی ”نیکی“ کا ذکر نہیں کیا جس نے ابو میاں کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ پانی کا بھی ذکر نہیں کیا۔ ختم کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ چاچی نے جلدی سے ختم کو چوکی پر لا کر بٹھایا تو میں سرک کر کنارے ہو گیا۔ پھر چاچی پانی لانے کے لیے باورچی خانے میں گئی۔ ختم صدمے سے بڑھال ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ابو میاں آج نہیں توکل ضمانت پر رہا ہو کر آجائیں گے۔ میں اسی لیے آیا تھا۔“
چاچی پانی لے کر آگئیں۔ شاید انہوں نے میری بات سن لی تھی۔ انہوں نے ختم کے ہونٹوں سے گھاس لگاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم ابو میاں کو رہا کرانے جا رہے ہو؟“

”میں کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ابھی تو میں سیدھے ابو میاں کے بڑے صاحب کے پاس جا رہا ہوں ان سے بات کرتا ہوں، شاید وہ ابو میاں کی ضمانت لے لیں۔“
پانی پینے سے ختم کی حالت کسی قدر سنبھل گئی۔ اس نے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔ ”آپ یہاں کس لیے آئے تھے؟“

”اطلاع دینے، دفتر کا پتہ معلوم کرنے اور کسی کو ساتھ لے جا کر ابو میاں کی رہائی کے لیے کوشش کرنے۔“

”میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“ ختم تڑپ کر بولی۔ ”میں پولیس والوں کو بتاؤں گی کہ

کی جیب بڑی ہوشیاری سے کات لی مگر جناب ہمارا منصوبہ چوہٹ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

”وہ کیسے؟“ ایک بار غب آواز نے حیرت سے پوچھا۔

”ہم ابو میاں کو بڑا شریف اور سیدھا آدمی سمجھتے تھے مگر وہ تو بڑا کانیاں نکلا۔ ایک نمبری جیب کترا۔ جب اس نے دیکھا کہ جیب کٹ گئی ہے تو اس نے بس سے اترنے کی بجائے کسی اور کی جیب پر ہاتھ صاف کر دیا۔ اس میں آٹھ سو کی رقم تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس کی جیب کٹی تھی اسے موقع پر ہی معلوم ہو گیا۔ اس نے بس رکوا کر اور پولیس کو بلا کر تلاشی لی تو بڑا ابو میاں کی جیب سے برآمد ہوا۔ اگر ابو میاں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو پھر ہم اسے چوری کے الزام میں گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جاتا۔“

”یہ کمائی تو بڑی دل چسپ ہے مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جب تلاشی لی جا رہی تھی تو اس نے وہ بڑا جیب سے نکال کر کیوں نہیں پھینک دیا۔ وہ جیب کترا اور کانیاں ہوتا تو ایسی حاققت نہ کرنا کہ بڑا ابو اپنی جیب میں رکھ کر تلاشی دے دیتا۔“

”ابو میاں یہ سمجھا ہو گا کہ اس کی جیب کچھ دیر پہلے کاٹی گئی ہے لہذا اس کی تلاشی نہیں لی جائے گی۔“ وہ شخص اپنی بھونڈی آواز میں وضاحت کر رہا تھا۔ ”لوگ اس کے بڑھاپے پر ترس کھا کر پولیس والے سے کہہ رہے تھے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ پولیس والا بھی تیار ہو گیا تھا۔ وہ شخص اڑ گیا جس کی جیب کٹی تھی۔ اس نے ڈی ایس پی سے شکایت کرنے کی دھمکی دی، تب کہیں پولیس والے نے لے جا کر اسے حوالات میں بند کر دیا۔“

”تمہیں ابو میاں نے بچان تو نہیں لیا تھا؟“

”نہیں جناب۔ میں نے اپنا حلیہ کچھ اس طرح بدلا ہوا تھا کہ وہ تو کیا اس کے فرشتے بھی مجھے نہیں بچان سکتے تھے۔“

”کمائی تو بڑی سنسنی خیز ہو گئی۔ چلو ایک کام تو بخیر و خوبی انجام کو پہنچا۔ اب دوسرا مرحلہ رہ جاتا ہے۔“

”جناب آپ اس کی فکر نہ کریں۔ خبیم تو بڑی سیدھی سادی اور معصوم سی لڑکی ہے۔ میں کل ہی جا کر اسے اس کے باپ کی گرفتاری کی خبر سنا رہا ہوں۔ تھانے میں طلبی کے بہانے سے محمد علی موسائی کے بچکے میں لے کر پہنچ جاؤں گا۔“

”وہ چلی آئے گی تمہارے ساتھ؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی چلا آئے؟“

”کیوں نہیں آئے گی جناب وہ مجھے پہچانتی ہے مگر میں اسے اپنے ساتھ لے کر نہیں نکلوں گا بلکہ اسے کسی بہانے سے پلازہ سینما پر بلاؤں گا پھر وہاں سے کار میں لے کر بچکے پر پہنچ جاؤں گا۔“

”وہ کس لیے؟“

”وہ مکروہ سی نمبی کے ساتھ بولا۔“ اس لیے کہ اس طرح خبیم کی گمشدگی کا الزام مجھ پر نہ آ جائے۔ میں احتیاطاً کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا۔ اسی میں آپ کے اور میرے لیے بہتری

ہے۔“

”تم جو چاہو کرو شاہ جہاں! یہ تھلی ہمارے ہاتھ لگتی چاہئے۔ اس لڑکی کی بدولت ہم خبیم کارپوریشن کے لیے کتنے بڑے ٹھیکے حاصل کر سکتے ہیں یہ تو تم بھی جانتے ہو۔ وہ جس انجینئر، جنرل مینجر اور اعلیٰ عہدیداروں کے ہاں خبیم کی طرح گرتی رہے گی، ہمارے ہاں دولت بھی اسی طرح برستی رہے گی۔ اسے کل سمجھا دینا کہ حالات کا ساتھ دو گی تو نہ صرف تمہارا باپ رہا ہو جائے گا بلکہ دولت بھی تمہارے قدم چومے گی۔ اگر تم نے ہٹ دھرمی سے کام لیا تو اس کا نتیجہ تمہارے حق میں اچھا نہیں نکلے گا۔“

”جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہو گا جناب خبیم خلاف توقع جلد ہی راہ راست پر آ جائے گی۔“

”مگر دیکھو۔ میرا نام نہیں آئے گا۔ ہر کام بڑی احتیاط سے ہونا چاہئے۔ میں بس پردہ ہی رہنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے جناب! اب ابو میاں کے لیے کیا حکم ہے؟“

”تم پولیس سنیشن جا کر ہڈی ڈال آنا۔ ہر تھانے میں ایسے آدمی ضرور ہوتے ہیں جنہیں خریدا جاسکتا ہے۔ ان سے کہہ دینا کہ ابو میاں کی کسی قیمت پر ضمانت نہ ہو، تاوقتیکہ ہم نہ چاہیں... کتنی رقم کی ضرورت ہو گی؟“

”دس ہزار“

”دس ہزار؟ یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ کالی بھیڑوں کو ایک معمولی کیس کے لیے اتنی بڑی رقم نذر کرو گے؟“

”صاحب تھانہ بھی تو بہت بڑا ہے۔ یہ لوگ آدمی دیکھ کر بات کرتے ہیں۔ قدم قدم پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔“

”میرے پاس بڑے نوٹ ہیں پانچ پانچ سو کے“

”کوئی بات نہیں جناب۔ میں کسی پٹرول پمپ سے کھلوالوں گا۔“

میز کی دراز کھولنے کی آواز آئی تو میں نے وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ ہال سے نکل کر ابھی چند قدم کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ میں نے ایک باوردی ملازم کو دیکھا جس کی وردی پر خبیم کارپوریشن کڑھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کسی ہوٹل کے لٹچ بکس تھے۔ وہ بڑے صاحب کے لیے کھانا لے گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی نے میرا بڑا ساتھ دیا تھا۔

میں شاہ جہاں کے انتظار میں راہ داری میں ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا کہ وہ دفتر سے نکلے تو اس کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکے۔ میں اس کیمنے کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔ شاہ جہاں اور اس کے پاس کی گفتگو نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اونچے لوگ اتنے گھٹیا، اتنے گرے ہوئے اور اس قدر ذلیل ہو سکتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ بڑے لوگ اسی طرح روز بروز دولت مند ہوتے جاتے ہیں۔ ابو میاں کا پاس ایک غریب اور شریف باپ کی بیٹی کی عزت داؤ پر لگا

کر اپنے لیے دولت کا انبار لگانا چاہتا ہے مگر میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ میں ان لوگوں کے مقابلے میں بہت چھوٹا اور کمزور ہوں مگر ان کے گھناؤنے عزائم کو پورا نہیں ہونے دوں گا۔ وہ ختم کے خواب دیکھتے ہی رہ جاتیں گے اور میں ان ناگوں کا سر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پھل دوں گا۔

اس وقت چتر دفترا بند ہو چکے تھے۔ راہ داری سنان پڑی تھی، گھرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور میرا دماغ الٹ پھیر میں مصروف تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس غیبت شاہ جہاں کو تھانے جانے سے کیسے اور کیوں کر روکوں۔ ایک معمولی سا واقعہ اب ایک سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ بے چارے ابو میاں سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انہیں شکار بنایا گیا ہے تاکہ ان کی بیٹی کو چارے کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ میں راہ داری میں کھڑا تھا کہ ایک منصوبہ میرے ذہن میں پرورش پانے لگا۔ شاہ جہاں کا انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ میں اس منصوبے کی جزئیات پر غور کرنے میں مصروف تھا۔

کوئی چندرہ میں منٹ بعد شاہ جہاں دفتر سے نکلا تو مجھے، اسے پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ کسی گینڈے سے مشابہ تھا جس پیشانی پر سینگ نکلنے کی کسر رہ گئی تھی۔ نفیس لباس میں وہ بڑا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس کے چمک زدہ چہرے پر کینگی اور خباثت برس رہی تھی۔ بادی النظر وہ شیطان دکھائی دیتا تھا۔ دفتر سے نکل کر وہ دائیں جانب والے زینے کی طرف جا رہا تھا۔ میں بائیں جانب کے زینے کے پاس کھڑا تھا۔ اسے دائیں جانب کے زینے کی طرف جانے دیکھا تو میرے جہم میں جیسے بجلی سی بھڑکنی۔ میں پھرتی سے نیچے اترا، پھر دائیں جانب کے زینے کی طرف لپکا۔ وہ پہلی منزل کے زینے پر قدم رکھنے ہی والا تھا کہ میں اس کے قریب جا پہنچا۔ وہ بہت خوش خوش نظر آ رہا تھا۔ میں تیزی سے دوسری منزل کے زینے کی سیڑھیاں چڑھنے کے بجائے اس طرح اس سے ٹکرایا جیسے جلدی میں اس پر نظر نہ پڑی ہو۔ ہم دونوں آپس میں ٹکرائے اور سیڑھیوں پر گر پڑے۔ میں نے تو خود کو جلدی سے سنبھال لیا مگر وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ نتیجتاً سیڑھیوں سے پھسلے لگا تو میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سارا دے کر کھڑا کر دیا۔ اسے اپنے کپڑوں کی بڑی فکر تھی وہ اپنے کپڑے بھاڑنے لگا تو میں نے معذرت کی۔ ”میں معافی چاہتا ہوں جناب۔“

وہ مجھ پر قہر آلود نگاہ ڈال کر برس پڑا۔ ”گدھے کے بچے، اندھے ہو کیا؟“

”جناب، شہر کے اس علاقے میں گدھے کہاں ہوتے کپڑوں کا ستیا ناس کر دیا۔“

”جناب میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔“

”دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔“ اس کا غصہ اپنے عروج پر تھا۔

”بہتر ہے جناب۔“ میں نے مسکینی سے کہا۔

وہ غصے سے بڑبڑاتا تیزی سے نیچے چلا گیا۔ میں بھی چند لمحوں بعد عمارت سے باہر آگیا۔ میں نے شاہ جہاں کو شاندار ٹیوٹا کار میں جاتے دیکھا، جسے وہ خود چلا کر گلی سے نکال کر مین روڈ کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس کے پاس شاندار قسم کی کار، ٹھٹ باٹ اور رعونت دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے پاس کا دست راست ہے بلکہ بڑی حد تک راز داں، اسی لیے اسے یہ مراعات حاصل ہیں۔

میں یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ وہ الٹیں تھانے پہنچنے کے بعد جب پولیس والوں کے سامنے جیب میں ہاتھ ڈالے گا تو اس کا کیا حال ہو گا؟ اس کا بونہ تو میری جیب میں ختم چکا تھا۔ بونے کی گندگی پر بدحواس ہو کر وہ اپنے پاس کے پاس جائے گا اور اس کا پاس جب اس پر اپنا غصہ اتارے گا تو اس کی حالت قابل دید ہوگی۔

اس وقت میرا تھانے جانا مناسب نہیں تھا۔ شاہ جہاں سے وہاں نہ بھیڑ ہو سکتی تھی۔ وہ مجھ پر جیب تراشی کا الزام لگاتا تو میری جیب سے رقم برآمد کر لی جاتی، نتیجتاً میں بیل کی ہوا کھاتا۔ میں سیدھا اپنے گھر پہنچا شاہ جہاں کا بونہ چری تھا، اور تھا بھی خوب صورت، بڑا سا۔ بونے میں کچھ کاغذات تھے۔ مجھے ان کاغذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر بھی میں نے احتیاطاً انہیں ایک لفافے میں بند کر کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ بونے کی رقم کا جائزہ لیا تو اس میں سے بارہ ہزار کی رقم ملی۔ پانچ پانچ سو کے بیس نوٹ تھے اس کے علاوہ سو اور پچاس پچاس کے نوٹ تھے۔ میں نے اپنی جیب میں تین سو روپے رکھ لیے۔ باقی رقم بونے میں رکھ کر اسے ایک خفیہ جگہ پر رکھ دیا۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ کسی کے فرشتے بھی اس کا پتہ نہیں چلا سکتے تھے۔ اس کام سے فلدغ ہو کر میں نے سوچا کہ اب مجھے ختم کے ہاں جانا چاہیے۔ چاچی کی موجودگی میں اسے اعتماد میں لے کر صورت حال سے آگاہ کرنا ہو گا۔ ختم کو اب کسی اور شہر میں جا کر کچھ عرصے کے لیے روپوش رہنا ہو گا ورنہ وہ ان شیطانوں کے ہاتھوں سے نہ بچ سکے گی۔

میں رکشالے کر ابو میاں کے گھر پہنچا تو دروازے پر لگے ہوئے بڑے سے تالے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے گھبرا کر سوچا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ شاہ جہاں تھانے جانے کی بجائے سیدھا یہاں آگیا ہو اور ختم کو فریب دے کر کسی بہانے سے اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ اس میں کل تک انتظار کی تاب نہ رہی ہو۔ پھر خیال آیا کہ ختم چاچی کے ہاں بھی تو ہو سکتی ہے۔ ایک بے سارا لڑکی اپنے باپ کی غیر موجودگی میں تنہا گھر میں کیسے رات گزار سکتی ہے۔ میں نے بے تابی سے چاچی کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا۔ چاچی کا متوحش چہرہ دکھائی دیا۔ وہ قدرے مضطرب بھی تھیں۔ جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی۔ ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ ایک طرف ہٹ کر اندر آنے کا راستہ دیتی ہوئی بولی۔ ”بھیا! تم بہت اچھے وقت پر آئے ہو۔ میں تو ہمارے آنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔“

”خیریت تو ہے؟“ میں نے اندر داخل ہو کر ایک پلازانہ نگاہ ڈالی۔ ختم کو تلاش کرنا چاہا مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی، البتہ چاچی کے بچے دکھائی دیے۔

”خیریت ہی تو نہیں بھیا۔“ وہ اداس لمبے میں بولیں اور مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ میں گھبرا سا گیا۔ ایک خیال آکر ہونے کے جھوٹے کی طرح گزر گیا۔ کہیں پولیس والے کسی بہانے سے ختم کو تو نہیں لے گئے۔

وہ پولیس اسٹیشن گئی ہے۔“

”پولیس اسٹیشن!“ میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ایک لمحے کو یہ محسوس ہوا تھا جیسے بجلی کا جھکا

”ویر نہ کرو، جلدی سے جاؤ۔“ چاچی نے ملتھیانہ لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں سے سیدھا پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔ خدا کرے ختم واپس آجائے، اگر وہ واپس آگئی تو اسے کسی اور جگہ چھپا کر رکھنا۔ وہ یہاں رہے گی تو کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی ہوتی رہے گی۔“

میں تھانے تو جا رہا تھا مگر دل میں یہ سوچ سوچ کر ڈر رہا تھا کہ شاہ جہاں نے وہاں مجھے دیکھ کر پہچان لیا اور واویلا مچا دیا کہ میں نے جیب تراشی کی ہے تو میں کیا کروں گا۔ پولیس والوں کو تو کوئی ہمانہ ہی چاہیے۔ وہ ایسا سنرا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے..... ان کے نزدیک تو شاہ جہاں مستحبر ہو گا اس لیے کہ وہ گاڑی والا ہے۔ جیل جانے اور اپنی کھال ادھڑوانے کے علاوہ مجھے رہ رہ کر ختم کا خیال آ رہا تھا۔ اگر مجھے حالات میں دھکیل دیا جاتا تو میں اسے کیسے رہا کر سکتا تھا؟ اسے کچھ ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کرتا، اس لیے کہ یہ سب کچھ میری ہی وجہ سے ہو رہا تھا۔

جب میں نے تھانے کے سامنے رکشا رکوایا تو وہاں کئی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ان گاڑیوں میں شاہ جہاں کی گاڑی نہیں تھی۔ ایک موہوم سی امید پیدا ہوئی کہ شاہ جہاں تھانے نہیں پہنچا ہو گا، ممکن ہے وہ اپنا بڑا غائب دیکھ کر اپنے پاس کے پاس رقم کا بندوبست کرنے گیا ہو۔ راستے میں اسے بڑے نوٹوں کا کھلا کروانا تھا۔ جب اس نے کسی پٹرول پمپ پر گاڑی روک کر جیب میں ہاتھ ڈالا تو گائب اسے معلوم ہوا ہو گا کہ اس کا بڑا غائب ہے۔

میں نے تھانے کی عمارت میں قدم رکھا تو برآمد سے میں مجھے ختم کھڑی نظر آئی جو ایک پولیس والے سے بات کر رہی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ نیلے بارڈر والی سفید ساڑی اور سفید بلاؤز میں لمبوس تھی اور اس کی پشت پر سیاہ بال بادلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا، اور تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ اچانک اس نے پلٹ کر دیکھا تو میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ ختم نہیں کوئی اور تھی۔

میری ساری خوشی جیسے خاک میں مل گئی۔ میں برآمدہ عبور کر کے ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوا جہاں ایک میز پر خزانہ قسم کا سب انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کمرے میں چند ایک پولیس والے بھی موجود تھے۔ میں نے اسے مودبانہ انداز سے سلام کیا تو اس نے جواب دینے کی بجائے مجھے نیچے سے اوپر دیکھا، پھر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ”کون ہو تم؟“

”جی..... چچا!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”چچا!“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”خوب، بہت خوب، پھر تو جیتجا بھی ہاتھ کی صفائی دکھاتا ہو گا؟“

”نہیں جناب! میں الاعظم اسکاڑ کے کونسلر رشید صاحب کے ہاں ملازم ہوں۔“ میں نے معلوم دروغ گوئی سے کام لیا۔ ”میرے چچا اب میاں تیم کارپوریشن میں ملازم ہیں۔“

”پھر بھی تمہارا چچا جیب کاٹا پھرتا ہے، اسے شرم نہیں آتی۔“

”یہ بات نہیں ہے جناب۔“ میں نے حوصلہ کر کے کہا۔ ”اسے کسی جیب کترے نے پھنسا

لگا ہو۔“ وہ کس لیے؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنے باپ کو رہا کروانے کے لیے۔“ چاچی کہنے لگیں۔ ”تمہارے جاتے ہی وہ بے چین سی ادھر ادھر غمگینی رہی۔ تھانے جانے کے لیے بے تاب ہوتی رہی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ عورت ذات کا جانا وہاں ٹھیک نہیں۔ پولیس اسٹیشن کا ماحول اچھا نہیں ہوتا اور تمہارے جانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا مگر میں نے انکار کر دیا۔“ وہ سانس لینے کے لیے رک گئیں۔

میں نے کہا ”آپ بھی چلی جاتیں، آپ نے انکار کیوں کر دیا؟“

”چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر کیسے چلی جاتی؟ میرا سب سے چھوٹا بچہ دوسرے کمرے میں پڑا بخار سے ٹھنک رہا ہے۔ پھر میں تھانے جا کر کیا کرتی؟ میرا پولیس والوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا اور ان سے گفتگو کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔“

چاچی کی بات اپنی جگہ پر درست تھی۔ پھر ان کی مجبوریاں بھی تھیں۔ اب مجھے ختم کی جلدی بازی اور حماقت پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ میں نے بے بسی سے ہونٹ چبائے تو چاچی نے گہرا کے پوچھا۔ ”بھیا، خیرت تو ہے نا؟ کیا تم بڑے صاحب کے پاس گئے تھے؟“

”ہاں گیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ پھر انہیں مختصراً شاہ جہاں اور اس کے پاس کی گھناؤنی سازش کے بارے میں بتایا۔

”اے! یہ کیا کہہ رہے ہو بھیا!“ انہیں جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ”کیا دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے شکلی سے جواب دیا۔ ”اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا، پھر ختم جیسی لڑکیوں کو تو ان گنت مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

”مگر بھیا، یہ اونچے لوگ اس بچاری کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟“

”ختم کو بچاری کہہ کر اس کی قدر و قیمت مت گھٹائیے۔ وہ کسی تراشیدہ ہیرے کی مانند ہے۔ یو پاریوں کو معلوم ہے کہ وہ اس کے عوض کیا کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔“

”تو پھر بھیا تم جلدی سے پولیس اسٹیشن جا کر ختم کو لے آؤ۔“

”لے آؤں گے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟“

”جی ٹوٹی“ ادھ گھنٹہ ہوا ہو گا۔ شاید وہ ابھی ہی پہنچی ہو، تم سمجھا بھجا کر اسے لے آؤ۔“

”یہ“ اور غصہ ہو گیا۔ ”میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔“ شکار خود جال میں پھنس گیا۔

”کیا مطلب؟“ وہ میرا دمہ بکھنے سے قاصر رہیں۔

”شاہ جہاں بھی تو وہیں گیا ہے تاکہ پولیس والوں کو کھلا پلا کر یہ تاکید کر دے کہ اب میاں کو

اس وقت تک ضمانت پر رہا نہیں کیا جائے، جب تک وہ ہدایت نہ کریں۔“

”وہ کس لیے؟“

”تاکہ اس بے سارا لڑکی کی مجبوریاں سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔“

دیا ہے۔

”بکواس بند کرو۔“ سب انپکڑ کو جلال آگیا۔ ”زیادہ شرافت مت دکھاؤ۔ ہم تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ کس لیے آئے ہو؟“

”ذرا خبر لینے اور چائے پانی کا انتظام کرنے۔“ میں نے چالپوسی سے کہا۔

”اس کی کیا خبر خبر لو گے۔ وہ تو مرنے جا رہا ہے۔“ سب انپکڑ نے بے رحمی سے کہا اور ایک سپاہی کو بلا کر حکم دیا۔ ”اسے حوالات میں لے جا کر اس کے پچا سے ملا دو۔ دس منٹ سے زیادہ بات نہ کرنے دیتا۔“

میں نے کمرے سے نکل کر راہ داری میں چلتے ہوئے سپاہی کے ہاتھ میں دس کا ایک نوٹ دیا دیا۔ پھر اس سے پوچھا۔ ”کوئی لڑکی ابو میاں سے ملنے آئی تھی؟“

”نہیں.....“ اس نے لمبی میں سر ہلایا۔ ”تم پہلے ملاقاتی ہو۔“

”کوئی لڑکی نہیں آئی؟“ میں چلتے چلتے رک گیا۔ ”شاید تمہاری غیر موجودگی میں آئی ہو؟“

”میں دو بجے سے ڈیوٹی پر ہوں اور ایک منٹ کے لیے بھی ادھر ادھر نہیں گیا۔“ اس نے حتیٰ لے میں کہا۔

”اچھا!“ میرا دماغ چکر اسا گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شبنم کہاں چلی گئی۔ کس ایسا تو نہیں وہ کسی اور تھانے پر چلی گئی ہو۔ میں نے چلتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا شاہ جہاں نامی کوئی آدمی نیلے رنگ کی ٹیوٹا کرولا میں بیاں آیا تھا؟“ پھر میں نے شاہ جہاں کا حلیہ بھی تفصیل سے بتا دیا۔

سپاہی نے وہ حلیہ غور سے سنا، چند لمبے ذہن پر زور دیتا رہا۔ پھر چونک پڑا۔ ”تم نے کچھ دیر قبل جس لڑکی کے بارے میں پوچھا تھا، کیا وہ لڑکی بہت ہی حسین ہے؟“

”ہاں.....“ میں نے سر ہلایا۔ دل اس وقت عجیب انداز سے دھڑکنے لگا تھا۔

”مجھے یاد آیا کہ تقریباً“ آدھا گھنٹہ پہلے میں بڑے صاحب کے لیے پان سگرت لینے جا رہا تھا تو وہ لڑکی نظر آئی تھی۔ اس نے سیاہ بارڈر والی نیلے رنگ کی ساڑی اور نیلے ہی رنگ کا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ میں نے ایسی حسین لڑکی بہت کم دیکھی ہیں۔“

”ہاں ہاں وہی۔“ میں خوشی سے تقریباً ”جج پڑا۔“ کہاں ہے وہ؟

”وہ نیلے رنگ کی کار میں بیٹھ کر اسی شخص کے ساتھ چلی گئی، جس کا حلیہ تم نے ابھی بتایا تھا۔“

”نہیں.....“ میری ساری خوشی کا فور ہو گئی۔ ”کیا وہ دونوں پولیس اسٹیشن میں نہیں آئے تھے؟“

”نہیں!“ سپاہی نے کہا۔ ”جیسے ہی لڑکی کا رکشا رکا، ویسے ہی ایک نیلے رنگ کی کار رکشا کے پاس آکر رکی۔ لڑکی کی نظر جیسے ہی اس کار والے پر پڑی، وہ اس کے پاس گئی۔ چند لمبے ان دونوں میں سرگوشیاں ہوتی رہیں، پھر لڑکی اس کی کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔“

میں ایک لمحے کے لیے ہکا بکا ہو گیا۔ آخر شاہ جہاں نے شبنم کو بڑی خوب صورتی سے اغوا

کر ہی لیا تھا۔ سپاہی نے میری کیفیت دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ وہ لڑکی کون تھی۔ اس کا اس آدمی سے کیا تعلق ہے؟“

”کوئی تعلق نہیں..... وہ لڑکی ابو میاں کی دور کی رشتہ دار ہے۔“

حوالات میں جا کر ابو میاں سے بات کرنے کے لیے مجھے میں تین روپے مزید خرچ کرنا پڑے۔ ابو میاں پر غشی کی سی حالت طاری تھی۔ وہ فرش پر بے جان پڑے تھے۔ میں نے سپاہی کو دس کا ایک اور نوٹ دیا تو وہ ایک کپڑا اور پانی کا گلاس لے آیا۔ میں نے کپڑا گھسیٹ کر ابو میاں کے زخم صاف کیے تو انہیں کسی قدر ہوش آگیا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں پھر میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا، بس میں تم بھی سفر کر رہے تھے نا؟“

میں صرف گردن ہلا کر رہ گیا۔ کیسے بتاؤں کہ انہیں جو سزا مل رہی ہے، اس کا ذمہ دار میں ہوں، میں ان کا مجرم ہوں۔ بہر حال یہ ان باتوں کا وقت نہیں تھا۔ وہاں سے جلد از جلد نکل کر شبنم کی تلاش میں جانا چاہتا تھا۔ میں نے ابو میاں کو تسلی و تشفی دی۔ ان کے ساتھ اور بھی قیدی تھے۔ سب کی نظرس بچا کر میں نے ان کی جیب میں تین روپے رکھ دیے۔ پھر چالیس روپے کا چائے ناشتا منگوایا جو ابو میاں اور قیدیوں کے لیے تھا۔ پولیس والوں نے اس میں بھی حصہ لگانا چاہا تو میں نے انہیں ناشتے کے لیے تین روپے دے دیے۔ اس طرح ابو میاں اور قیدیوں کو ناشتا کرنا اور چائے پینا نصیب ہوا۔

تھانے سے نکل کر میں جی کے ہاں پہنچا۔ جی کا اصل نام جعفر تھا مگر اس نے اپنا نام جی رکھ لیا تھا۔ وہ نہ صرف میرے بارے میں جانتا تھا بلکہ میرا احترام بھی کرتا تھا۔ وہ اپنے گھر پر نہیں تھا۔ اس کے بھائی نے ایک دوست سے معلوم کر کے بتایا کہ وہ محمد علی سوسائٹی کے کسی بنگلے میں جا کھیل رہا ہو گا۔ اس کے دوست کو جوئے کا اڈا معلوم تھا۔ میں اسے لے کر وہاں جا پہنچا۔ وہاں جوئے مٹے ساتھ شراب کا دور بھی چل رہا تھا۔ جی ایک کونے میں بیٹھا کھیل رہا تھا، مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ میں نے اسے الگ لے جا کر شاہ جہاں کے بارے میں پوچھا تو اس کا چہرہ متحیر ہو گیا۔ ”کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟“

”خیریت ہی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے تمہیں ابو میاں کی جیب کاٹنے کا کیا نذرانہ دیا تھا؟“

”پانچ سو روپے!“ جی بولا۔ ”جو رقم میں نے اس بوڑھے کی جیب سے نکالی تھی وہی میری ہو گئی۔“

”مگر میں نے تو تمہیں بس میں نہیں دیکھا؟“

”میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ اس لیے جلدی سے اس بوڑھے کی جیب کاٹ کر اتر گیا۔“

”کیا تمہیں شاہ جہاں کا گھر معلوم ہے؟“

”اس کا گھر سوسائٹی میں ہے۔ لال رنگ کا چھوٹا سا بنگلا ہے۔ اس گلی سے دائیں جانب

تیسری گلی میں..... میں کچھ دیر پہلے اسی کے پاس سے آ رہا ہوں۔“

نظر آ رہی تھی۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور دبے قدموں اندر داخل ہو گیا۔ میں تصور میں شاہ جہاں کو نشے میں دھت دیکھ رہا تھا۔ شبنم خواب گاہ کے ایک گوشے میں کھڑی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح نظر آ رہی تھی۔

میں برآمدے میں قدم رکھ رہا تھا تو مجھے اپنے دھڑکتے دل کی صدا صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہاں گہرا سناٹا تھا۔ سامنے والے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا اور اس سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں نے چند ثانیے رک کر سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اندر داخل ہونا چاہیے؟ کسی نوکر کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ ایسے موقع پر شاہ جہاں نے اسے کہیں بھیج دیا ہو گا۔ گویا میرے لیے میدان صاف تھا۔ میں شش و پنج میں مبتلا تھا کہ میرے کانوں میں دفعتاً "کسی مرد کے کراہنے کی آواز گونجی۔ میں حیرت سے اچھل پڑا۔ یہ کون کراہ رہا ہے؟ کہیں یہ میری ساعت کا فتور تو نہیں ہے؟ فضا پر پھر سناٹا محیط ہو گیا۔ میں چند ثانیے سانسیں روکے کھڑا رہا۔ اس کے بعد میں نے دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے خفیف سا اندر کو دھکیلا۔ اندر مدھم روشنی تھی اس لیے فوری طور پر کچھ دکھائی نہ دیا۔ دفعتاً پھر ایک کراہ بلند ہوئی۔ میں نے احتیاطاً چاقو کھول کر ہاتھ میں لے لیا۔ دروازہ کھول کر میں اندر گیا تو قالین پر شاہ جہاں خون میں لت پت پڑا کراہ رہا تھا۔ "پانی..... پانی....." اس نے نحیف سی آواز میں کہا۔

میں ٹھک کر رہ گیا۔ میرا جسم سنسنایا تھا۔ شاہ جہاں کے سینے سے خون ابل کر قالین پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے سینے میں دو تین سوراخ نظر آ رہے تھے۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں جلا تھا۔ موت اسے ترسا رہی تھی۔ زندگی جیسے آس بندھا رہی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا انجام اس قدر عبرت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہنگامے میں شاہ جہاں اور وحشت ناک سنائے کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ خیال آیا کہ اسے پانی پلا دینا چاہیے۔ میں اس کے لیے پانی لینے کے ارادے سے اندازے سے ہی پکن کی طرف جا رہا تھا کہ شاہ جہاں کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ مرتے وقت اسے پانی کے چند گھونٹ بھی نصیب نہ ہو سکے۔

میں دانت شاہ جہاں کی لاش کے قریب نہیں گیا۔ البتہ شبنم کی تلاش میں گھر کا کونا کونا چھان مارا..... مگر اس کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں نے وہاں کھڑے رہ کر وقت ضائع نہیں کیا اور ہنگامے سے باہر آ گیا۔ اب میں مین روڈ کی طرف جا رہا تھا اور شاہ جہاں کے قتل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا شاہ جہاں کو شبنم نے قتل کیا ہو گا۔ ایک نازک سی لڑکی اپنی عزت بچانے کے لیے شاہ جہاں جیسے مرد کو قتل بھی کر سکتی ہے۔ اگر شبنم نے ہی شاہ جہاں کو قتل کیا ہے تو اسے کمر فریب سے کام لیتا پڑا ہو گا۔ شاید اس نے کمر فریب سے ہی پتول بھی حاصل کیا ہو گا؟ یا پھر اس نے شاہ جہاں کے نشے سے فائدہ اٹھایا ہو گا۔ شبنم کی قسمت اچھی تھی کہ حالات و اتفاقات نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ورنہ وہ شاہ جہاں کے چگل سے بچ نہیں سکتی تھی۔ اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے اس لمحے سے تو فائدہ اٹھالیا تھا مگر اس کے لیے اسے اپنے ہاتھ خون سے رنگنا پڑے تھے۔ میرے نزدیک اس کا یہ جرم قابل معافی تھا کیونکہ کوئی بے بس عورت خود کو بچانے کے لیے آخری اقدام بھی کر سکتی

"تم اس کے پاس گئے تھے؟ کیوں؟"

"شراب کی بوتل دینے.... وہ اعلا ولایتی شراب پیتا ہے جسے میں امریکی سفارت خانے سے چرا کر اس کے ہاتھ بیچتا ہوں۔ وہ اس بوتل کی منہ مانگی قیمت دیتا ہے۔ بڑا ادبش اور کمینہ خصلت ہے۔ معلوم نہیں کہاں سے ایک شریف اور بے حد حسین لڑکی کو بھلا پسلا کر لایا ہے۔ کیا بتاؤں۔ مجھے تو ناش کے پتوں میں بھی اس کی تصویر نظر آ رہی ہے۔" جی نے کہا۔ "آپ اس کا پتا کیوں معلوم کر رہے ہیں؟ کوئی کام ہے؟" اس نے قدرے توقف سے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ "اس سے ایک پرانا حساب بے باق کرنا ہے۔ جلدی سے اس کے گھر کا نمبر بتاؤ۔"

جی نے گھر کا نمبر بتانے کے بعد کہا۔ "اگر آپ حکم دیں تو پہنچاؤں۔"

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں..... لیکن کیا تم ایک اچھے سے چاقو کا بندوبست کر سکتے ہو؟"

جی نے اپنی جیب سے ایک لمبے پھل والا تیز دھار چاقو نکال کر میری طرف بڑھایا۔ "کیا یہ شاہ جہاں کے سلسلے میں آلہ قتل ثابت ہو گا؟"

"نہیں۔" میں نے اسے جواب دیا۔ "مجھے صرف اپنا دفاع کرنا ہے۔ اس معصوم لڑکی کو اس کے بچے سے نکالنا ہے۔ وہ اس لڑکی کو بے آبرو کرنا چاہتا ہے۔"

"تو میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اگر اس نیک کام میں میرے تعاون کی ضرورت ہو تو میں بھی چلوں۔"

"جی! میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔" یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ کبھی شریف عورتوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ اگر وہ لڑکی پاکباز ہے تو میں نہیں چاہتا کہ اس پر کوئی آنچ آئے..... کون چاہتا ہے۔ کہ صاف و شفاف آئینہ دھندلا جائے یا اس میں بال پڑ جائے؟"

"تو پھر ایک وعدہ کرو دوست۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر بڑی گرم جوشی سے دیا۔ "شاہ جہاں کے ہنگامے میں جو واقعہ پیش آئے گا، اس کی اخبارات میں بازگشت ہو تو اپنی زبان بند رکھنا۔ میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔"

مجھے نہیں معلوم تھا جی کے اندر اتنا بڑا انسان چھپا ہوا ہے۔ میں اس سے رخصت ہو کر شاہ جہاں کے ہنگامے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ہنگامہ تلاش کرنے میں مجھے کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نہ ہی کسی سے پتہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی۔ میں اس ہنگامے پر پہنچا تو رات کے دس بجے رہے تھے۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ وہاں دو روپہ بنگلوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ کسی ہنگامے کے برآمدے میں روشنی تھی کسی میں اندھیرا..... کہیں کتے بھونک رہے تھے، کہیں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاہ جہاں کے ہنگامے کا گیت کھلا ہوا تھا۔ پورچ میں اسکی نوپو ناموجود تھی۔ اندر ایک کمرے میں روشنی

لے گا۔

”تم ہمارے لیے دولت سے زیادہ قیمتی ہو۔ تم نے ہماری تنظیم کے بہت سے کارکنوں کو جیل کی ہوا کھلائی ہے۔ ہمیں تم سے انتقام لینا ہے۔“

”جو بھی ملک دشمن عناصر کا ساتھ دے گا، اس کا یہی حشر ہو گا۔ اگر تمہیں انتقام لینا ہے تو ملک دشمنوں سے لو۔ مجھ سے کیوں لیتے ہو؟“

”ہم تمہارا اس سے بھی برا حشر کریں گے۔ ایسا حشر کہ تمہارے ساتھیوں کو سبق مل جائے گا۔“ دوسرے بد معاش نے سفاکی سے کہا۔ ”تم انسان نہیں لیرے اور بد معاش ہو، قاتل ہو۔“

”مکن ساتھیوں کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

”تم ہمیں باتوں میں الجھا رہے ہو مگر یاد رکھو۔ کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ یہاں کا ہر شخص ہمارے ساتھ ہے۔“

”مجھے خدا کی ذات پر پورا پورا بھروسہ ہے، وہ یقیناً میری مدد کرے گا۔ تم لوگ میرا بال بچا بھی نہیں کر سکتے۔“

”بکواس بند کرو اور کار میں بیٹھو، ورنہ یہیں تمہارے پیچھے میں گولی اتار دوں گا۔“ پہلے بد معاش نے ریوالور کی لہلی پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ یہ احقانہ خیال ذہن سے نکال دو۔“

”تم مجھے گولی نہیں مار سکتے۔“ اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگر بہت ہے تو چلاؤ گولی۔“

دوسرے بد معاش نے احقانہ انداز میں پوچھا۔ ”تمہیں گولی مارنا کون سا مشکل کام ہے۔“

”مشکل ہے دوست کیونکہ تم لوگ مجھ سے کچھ اگھوانا چاہتے ہو۔ اگر گولی مار دیتا ہوتا تو کب کا گولی مار کے ہلاک کر دیتے۔“

”اچھا چلو۔ کار میں بیٹھو!“ دوسرے بد معاش نے اسے دھکا دیا۔ وہ شخص اپنی جگہ اس قدر مضبوطی سے کھڑا تھا کہ اس کا جسم صرف ہل کر رہ گیا مگر قدم نہیں اٹھاسکے۔ اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر میری طرف دیکھا۔ دوسرے بد معاش کی پشت میری جانب تھی۔ اگر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے کھڑا ہوتا تو میں اس کی نظروں میں آجاتا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شخص میری مدد کا طالب ہے۔

یہ بد معاش کسی سیاسی جماعت کے کارکن تھے اور اس شخص کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ یہ شخص کون تھا اس کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کوئی اہم سرکاری ہستی ہے۔ فوجی افسر بھی ہو سکتا تھا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ عام طور پر فوجی افسر شہری آبادی میں نہیں رہتے ہر کیف، وہ جو کوئی بھی تھا، وطن پرست تھا اور اس وقت ملک دشمنوں میں گمراہ ہوا تھا۔

میرا ہاتھ جیب میں گیا اور واپس آیا تو اس میں چاقو دبا ہوا تھا۔ میں نے اسے ایک جھٹکے

ہے۔

میں بہت خوش تھا کہ ایک کمزور اور نازک سی لڑکی نے عزم و حوصلے سے کام لے کر ایک ناگ کا سر کھل دیا ہے۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ جائے واردات پر نہ تو کوئی بوتل نظر آئی تھی اور نہ ہی پستول دکھائی دیا تھا۔ میں جنیم کی تلاش میں شاہ جہاں کے کمرے میں بھی گیا تھا۔ وہاں بھی بوتل یا گلاس نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے، شاہ جہاں نے بوتل کسیں چھپا کر رکھ دی ہو مگر آلہ قتل کہاں گیا؟..... کیا اسے جنیم ساتھ لے گئی؟ مگر جنیم اسے کیوں ساتھ لے جانے لگی۔ عموماً جو لوگ پہلی بار قتل کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ اس قدر دہشت زدہ ہو جاتے ہیں کہ اپنے حواس میں نہیں رہتے اور وہ آلہ قتل جائے واردات پر ہی پھینک کر فرار ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے، جنیم بد حواسی میں یا کسی اور خیال کے تحت پستول اپنے ساتھ لے گئی ہو۔ اگر اس نے ایسا کیا ہے تو ایک طرح سے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔

سوسائٹی کی یہ گلی قدرے تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہاں اسٹریٹ لائٹس کا انتظام بے حد ناقص تھا جو بلب فیوز ہو گئے تھے، انہیں بدلنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ میں سڑک کے کنارے کھڑی ایک کار کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ایک دم سے کھٹکا ہوا۔ میں اچھل کر رہ گیا۔ میں نے آواز کی سمت میں دیکھا۔ چند گز کے فاصلے پر جو بنگلا تھا، اس میں سے ریوالوروں سے مسلح دو آدمی ایک شخص کو زرنے میں لیے باہر آرہے تھے جھگڑے کے باہر ایک سفید مزدور کھڑی تھی۔ جو شخص ان کے زرنے میں تھا، وہ سرخ و سفید، وجہ، صحت مند اور کئی فوجی آفسر کی مانند بلند قامت تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خاصا پر سکون ہے۔ اس کے حواس پوری طرح قابض تھے۔ میں جلدی سے کار کی آڑ میں ہو گیا۔ ان بد معاشوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اس شخص کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی تھی تاہم وہ بدستور پر سکون رہا۔ اس نے مجھے مدد کے لیے پکارنے کی کوشش نہیں کی۔ سفید مزدور کے پاس پیچ کر ایک بد معاش نے جیب سے چابی نکال کر کار کا پچھلا دروازہ کھولا جبکہ دوسرا بد معاش اس شخص کو ریوالور کی زد میں لیے کھڑا رہا جیسے ہی پچھلی نشست کا دروازہ کھلا، دوسرے بد معاش نے اس شخص کو کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس شخص نے کار میں داخل ہونے کی بجائے دروازے کے پاس رک کر کہا۔ ”سنو! تمہیں جس قدر رقم چاہیے، وہ میں تمہیں دے سکتا ہوں۔“

”ہمیں رقم کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے۔“ دوسرا بد معاش غرایا۔ ”ہم یہاں دولت حاصل کرنے نہیں آئے ہیں۔“

”مجھے اپنے ساتھ لے جا کر کیا کرو گے؟“ اس شخص نے پوچھا۔ ”اس نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔“

پہلا بد معاش ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا، اس نے کرخٹ لہجے میں کہا۔ ”ہم کیا کریں گے یہ تو ہمارا پاس ہی بتائے گا۔ تمہیں ہمارے نفع یا نقصان کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

تمہارا پاس رقم مانگے گا..... صرف دولت..... جبکہ مجھے یہ غمال بتا کر تمہیں کچھ بھی نہیں

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”بعض اوقات قدرت بھی عجیب و غریب کرشمے دکھاتی ہے۔“

”اچھا اب مجھے اجازت دیں۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا نام تو مجھے معلوم ہو گیا تھا مگر تفصیل تعارف نہیں ہو سکا تھا..... اس کی بارعب شخصیت سے میں اتنا متاثر ہوا کہ اس سے کچھ پوچھ نہ سکا۔ اس نے اپنی جیب سے بڑا نکال کر میری جانب پانچ پانچ سو کے دو نوٹ بڑھائے تو میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”میری طرف سے ایک حقیر سا نذرانہ!“

”کیا آپ میری اس نیکی کو ضائع اور میرے جذبے کو پامال کرنا چاہتے ہیں؟“

”نہیں دوست! یہ بات نہیں۔ میں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں چکا رہا ہوں بلکہ اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔“

”یہ رقم لے کر مجھے دکھ ہو گا۔“

اس نے رقم اپنے بٹوے میں رکھ لی۔ ”تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے میری دلی خواہش ہے کہ میں بھی تمہارے کام آؤں۔ جب بھی میری ضرورت پڑے میرے پاس آسکتے ہو۔ میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔ اچھا دوست خدا حافظ۔ میں اپنے دشمنوں سے منٹ لوں۔ اور ہاں تم اپنا چاقو چھوڑ جانا تاکہ پولیس کو دکھا سکوں اور تفصیل بتا سکوں۔ اب تمہیں تو اس کی ضرورت نہیں ہوگی؟“

”نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ویسے کیا مجھے پولیس کی آمد تک ٹھہرنا پڑے گا۔“

”نہیں“ اس کی ضرورت نہیں۔ میں اس معاملے کو از خود سنبھال لوں گا۔ اچھا خدا حافظ۔ کبھی کبھی ملتے رہنا دوست۔“

”خدا حافظ۔“ میں نے کہا اور وہاں سے چلا آیا۔

جس وقت میں گھر جا رہا تھا رات کے بارہ بج چکے تھے۔ شرسنان ہو چکا تھا۔ گاڑیوں اور رکشاؤں کی آمد و رفت کسی کسی سڑک پر نہ ہونے کے برابر تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ چابی کے گھر جا کر خنیم کے بارے میں پوچھوں مگر یہ مناسب نہیں معلوم ہوا۔ وقت کافی ہو چکا تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ خنیم نے خوفزدہ ہو کر اپنے کسی رشتے دار کے ہاں پناہ لے لی ہو۔

جب رکشالیق آباد ڈاک خانے سے گزر رہا تھا مجھے مریاں ہو ٹل کھلا نظر آیا۔ اسے کھلا دیکھ کر ایک دم سے میری بھوک چمک اٹھی۔ رکشا روکا کر میں ہو ٹل میں داخل ہوا۔ ہو ٹل بند ہونے والا تھا پھر بھی مجھے کھانا فراہم کر دیا گیا۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ ہو ٹل سے نکل کر شٹل ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر پہنچ کر بستر پر لیٹا تو جسم تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ آج میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے تھے۔ انتہائی سنگین، عجیب و غریب اور سنسنی خیز تھے جیسے جہیز بانڈ کا کردار ادا کیا ہو۔ مار دھاڑ اور اٹھا خ سے بھرپور، مگر میں جہیز بانڈ کی طرح عورتوں کے معاملے میں خوش نصیب نہیں تھا۔ ان

سے کھول لیا۔ پہلا بد معاش اسٹیرنگ سے اٹھ کر اپنے ساتھی کی مدد کے لیے اڑا تاکہ اس شخص کو کار میں دھکیل سکے۔ میں نے چاقو کا چھل ہاتھ میں پکڑ لیا اور دوسرے بد معاش کی پشت کا نشانہ لے کر پھینکا۔ یہ چاقو شاہ جہاں کے لیے تھا لیکن اب اس بد معاش کی زندگی کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ چاقو سنسناتا ہوا گیا۔ اسی لمحے دوسرا بد معاش کسی وجہ سے ایک طرف ہٹا تو وہ چاقو اس کی پشت میں پیوست ہونے کی بجائے اس کے دائیں بازو میں جا کر پیوست ہو گیا۔ دوسرے بد معاش نے ایک دل خراش چیخ ماری۔ اس کے ہاتھ سے دیوالہور چھوٹ کر سڑک پر گر پڑا۔ دوسرا بد معاش اس ناگمانی حملے سے بدحواس ہو گیا میں نے اسے سنبھالنے کا موقع نہیں دیا اور چوٹن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی پشت پر ایک ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ قلا بازی کھاتا ہوا کئی فٹ دور جاگرا۔ میں نے تیزی سے ریوالور اٹھا لیا۔ اس شخص نے پہلے بد معاش کو قابو کیا ہوا تھا جو اب خوف سے لرز رہا تھا۔ میں لپک کر دوسرے بد معاش کے پاس پہنچا۔ اس کے بازو سے چاقو نکل کر پاس ہی پڑا ہوا تھا۔ اس کے بازو سے خون ابل رہا تھا۔ اس کا بازو اور زمین خون سے تر ہو گئی تھی۔ وہ مارے تکلیف کے ترپ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو میں نے آگے بڑھ کر اس کے سینے پر اپنا پیر رکھ دیا۔

”شکریہ میرے دوست! بہت بہت شکریہ۔ تم نے مجھ پر ہی نہیں اپنے ملک پر بھی احسان کیا ہے۔“ اس نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”چلو ان دونوں کو اندر لے چلیں۔ شور شرابے سے کہیں پڑوسی نہ جاگ جائیں۔“

وہ ایک وسیع و عریض بنگلے میں رہتا تھا۔ اندر جا کر معلوم ہوا کہ ان بد معاشوں نے گھر کے ملازموں کی مشکلیں کس کر ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ میں نے ان کے منہ سے کپڑا نکال کر ان کی بندشیں کھول دیں۔ پھر دونوں بد معاشوں کو باندھ کر زخمی بد معاش کی مرہم پٹی کر دی۔ اس دوران میں بنگلے کے کینین نے پولیس کو فون کر دیا۔ جب وہ ضروری کارروائی سے فارغ ہو گیا تو اس نے مجھے نشست گاہ میں لے جا کر کہا۔ ”میرا نام سرور ہے۔ میں اپنے وطن کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔ تم کون ہو؟“

”میں بھی ایک خادم ہی ہوں لیکن خدمت کا انداز ذرا مختلف ہے۔ میرا نام سکندر ہے۔“

”بہت خوب!“ اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ ”اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ کس چیز نے تمہیں میری مدد پر اکسایا تھا؟“

”وطن سے محبت نے۔“ میں نے جواب دیا۔

”مگر تم اپنی جیب میں چاقو لیے کیوں پھرتے ہو؟“

میں نے فوری طور پر اس کا جواب دینے سے گریز کیا۔ پھر میں نے تذبذب سے کہا۔ ”یہ چاقو جس شیطان صفت شخص کے لیے میں نے ایک دوست سے آج ہی لیا تھا اس سے قدرت نے انتقام لے لیا۔ شاید قدرت کو آپ کی مدد کرنا مقصود تھی اسی لیے اس نے چاقو کو مدد کا ذریعہ بنایا۔“

گنت عیبادوں کی بجائے میرے تصور میں تو صرف خنیم ہی ہوئی تھی۔ اس کا سراپا جیسے بجلی بن کر میرے دل پر گرا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ چپکے سے میرے من کے کسی گوشے میں آٹھنسی ہے اور میرے من میں اس کے وجود کی ملک پھیل رہی ہے۔ وہ سرگوشیاں کر رہی ہے۔ "سکندر! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو نا؟ جب ہی تو تم میرے لیے اتنے پریشان ہو رہے ہو۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نیند آنکھوں سے ٹوسوں دور ہو چکی تھی۔ جیسے خنیم میرے سامنے کھڑی مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ اس کے لیے کا ترنم فضا میں جلتنگ پیدا کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی کمرے میں بکھر گئی ہو۔ میں نے کمرے میں اسے اس طرح تلاش کیا جیسے وہ واقعی کسی کونے میں کھڑی ہو۔ مگر وہ تھی کہاں؟ اگر تھی تو میرے من میں اور اسکی خوشبو سے میرا وجود منک رہا تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ کبھی کسی کے خیال نے مجھے سونے نہ دیا ہو۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی تھی میں کسی کے خیال میں پاگل نہیں ہوا تھا، جاگ نہیں تھا، آخر شماری نہیں کی تھی۔ مگر خنیم تو مجھے سونے نہیں دے رہی تھی۔ میرے وجود پر کسی بدلی کی طرح چھا گئی تھی۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "اے بت ملازب تو مجھے سونے دے۔ تیری جستجو میں تو میں بے حال ہو چکا ہوں۔ نیند کی دیوی مجھ سے روٹھ گئی ہے۔" بڑی منتوں اور خوشامدوں کے بعد اس نے سونے دیا۔ صبح بیدار ہوا تو دس بج رہے تھے۔ بیدار ہوتے ہی میرے ذہن کے درپے میں خنیم آکھڑی ہوئی۔ اس کا خیال آتے ہی گھٹیل بجلی کی تیزی سے اٹھا۔ شیو کیا، نمایاں اور ڈاک خانے پہنچ کر مریاں ہو گئی میں قہر پر اٹھے اور اندوں کا ناشتہ کیا پھر رکشالے کر نئی آبادی پہنچا۔

خنیم کے گھر پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں نے چابی کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا تو چابی کا زرد چہرہ نمودار ہوا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جیسے وہ ساری رات ایک ہل کے لیے بھی نہ سوئی ہوں۔ پریشانی سے ساری رات آنکھوں میں کالی ہو۔ میں سمجھ گیا کہ وہ خنیم کی وجہ سے پریشان ہیں۔ خنیم نے ایک شخص کو قتل کر کے اس کے ہاں پناہ لی ہوئی ہے۔ وہ شاید اسی لیے خوف زدہ ہو رہی ہوں کہ پولیس ایک قاتل کو پناہ دینے کے جرم میں کہیں انہیں گرفتار نہ کر لے۔

مجھے دیکھ کر چابی کی وحشت زدہ آنکھوں میں چمک سی لڑائی۔ انہوں نے مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ جیسے ہی میں نے کمرے میں قدم رکھا چابی نے دروازہ بند کر کے پوچھا۔ "خنیم کہاں ہے۔"

"خنیم کہاں ہے؟" میں اچھل پڑا۔ "کیا وہ یہاں نہیں آئی؟"

"نہیں!" وہ تشویش سے بولیں۔ "میں ساری رات اس کے انتظار میں جاگتی رہی۔ ایک ہل کے لیے بھی میری آنکھ نہیں گئی۔ میں تھرا ابھی انتظار کرتی رہی۔ تم بھی تو نہیں آئے، خنیم کے بارے میں بتانے کے لیے۔"

"پھر وہ کہاں گئی؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
"کیا وہ پولیس اسٹیشن پر نہیں تھی؟" انہوں نے سرسیمیگی سے پوچھا۔
"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں پولیس اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ وہاں نہیں آئی۔ ایک سپاہی نے مجھے بتایا کہ پولیس اسٹیشن کے باہر ایک کار والے نے خنیم کو اپنی کار میں بٹھا کر....."
"پھر تو وہ شاہ جہاں ہی ہو گا۔" چابی نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "وی اسے اپنے ساتھ لے گیا ہو گا۔"

میں چابی کو خنیم کے قاتل ہونے کے بارے میں فوری نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "وہ شاہ جہاں ہی تھا جو خنیم کو اپنے ساتھ گھر لے گیا تھا۔ جب میں ایک دوست سے شاہ جہاں کے گھر کا پتہ دریافت کر کے شاہ جہاں کے ہاں پہنچا تو وہاں خنیم نہیں تھی۔"
"خنیم وہاں نہیں تھی؟" ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "تو کیا شاہ جہاں وہاں موجود تھا؟"

"ہاں! موجود تو تھا۔" میں نے مختصر "کہا۔"

"اس نے خنیم کے بارے میں کیا بتایا؟"

"وہ کچھ بتانے کے قابل نہیں رہا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"کسی نے گولی مار کر اس کا سینہ چھلنی کر دیا تھا۔"

"کیا؟" چابی کا لہجہ کانپنے لگا۔ "شاہ جہاں کا قتل ہو گیا؟ اسے کس نے قتل کیا؟"

"میرا خیال ہے کہ خنیم نے شاہ جہاں کو قتل کیا ہے کیونکہ....."

وہ تیزی سے میری بات کاٹ کر بولیں۔ "خنیم نے! نہیں۔ وہ قتل نہیں کر سکتی وہ تو ایسی کمزور دل کی ہے کہ ایک مرغی تک ذبح نہیں کر سکتی۔"

"یہ صحیح ہے۔" میں نے ان کی تائید کی۔ "لیکن جب کوئی عورت اپنی عزت پر آج آتے دیکھتی ہے تو وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ ایک نہیں دس مردوں کو بھی قتل کر سکتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بھیا! مگر اس کے پاس پستول کہاں سے آیا ہو گا؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا ہوں اور نہ ہی جان کر کچھ کرنا ہے۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ خنیم وہاں سے بھاگ کر کہاں گئی اور کہاں چھپی ہوئی ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ اس شرمیں اس کے کون کون رشتے دار ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟"

"اس کے تمام رشتے دار اور عزیز حیدر آباد میں ہیں۔ یہاں اس کا کوئی نہیں ہے۔" وہ تشویش سے بولیں۔ "میں نے اسے ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھا۔ ہر وقت اس کا خیال رکھتی ہوں۔ ابو میاں نے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ میں ہر لمحے اس کا خیال رکھوں اس لیے کہ وہ سارا دن اکیلی رہتی ہے۔"

کا کیا حشر ہو گا؟

”خدا پر بھروسہ رکھیے اور دعا کیجیے۔“ میں نے تسلی دی۔ ”میں ابھی جا کر دو ایک پولیس اسٹیشنوں پر معلوم کر کے آتا ہوں۔ شاید کچھ خبر مل جائے۔ مجھے جیسے ہی اس کے بارے میں کوئی اطلاع ملے گی، میں آپ کو آگاہ کر دوں گا۔ اچھا! اب میں چلتا ہوں۔“

”نہیں بھیا ابھی نہیں۔ چائے پی کر جانا۔ چابی پولیس ”تم کل سے باپ بیٹی کے لیے فکر مند ہو رہے ہو۔ تمہاری کوئی خاطر نہ ہو سکی۔ میرے شوہر ہوتے تو وہ تمہارا ہاتھ ضروری بناتے۔ ذرا دیر ٹھہرو۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتا ہوں۔“

”چائے تو پھر کسی اور وقت آکر پی لوں گا۔ پریشانی میں کوئی چیز اچھی نہیں لگتی“

”تم چائے پی لو گے تو اسی بہانے میں بھی پی لوں گی۔ میں نے رات سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“ وہ بولیں۔

پھر وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر آگن کی طرف چلی گئیں۔ شاید اس طرف باورچی خانہ تھا۔ چائے کی مجھے بڑی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ میں نے بہت جلدی ناشتا کیا تھا۔ خبثت کی خیریت معلوم کرنے اور اسے دیکھنے کی اتنی بے صبری تھی کہ چائے نہیں پی تھی۔ چابی جلد ہی دو کپ چائے بنا کر لے آئیں۔ وہ اب بھی بڑی اداس اور مغموم سی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے چائے حلق سے اتاری اور انہیں تسلی و تسفی دے کر گھر پہنچا۔ میرے پاس جو رقم بچی تھی وہ ناکافی تھی۔ معلوم نہیں آگے چل کر کیا حالات پیش آئیں۔ معلومات حاصل کرنے کے لیے رقم بھی خرچ کرنا پڑتی ہے۔ پولیس اسٹیشنوں پر بھی شاید کچھ رقم خرچ کرنا پڑے۔ اگر کسی پولیس اسٹیشن پر خبثت مل جاتی تو پیسہ پالی کی طرح بہانا پڑتا۔ میں نے وہ پونلی نکالی جس میں شاہ جہاں کی رقم، بڑھ اور کاغذات تھے۔

ان کاغذات میں ایک پتلی سی نوٹ بک بھی تھی، جس میں چار پانچ صفحات تھے... میں نے غیر ارادی طور پر اس نوٹ بک کو اٹھا کر کھولا تو اس میں انگریزی اور اردو میں چند نام و پتے لکھے ہوئے تھے۔ ایک صفحے پر کچھ لوگوں کے صرف نام اور ٹیلی فون نمبر درج تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر نوٹ بک جیب میں رکھ لی۔ تقریباً ایک ہزار کی رقم بھی لے لی۔ یہ مال شاہ جہاں کا تھا۔ مال مفت کا تھا۔ اس لیے کہ دس ہزار کی رقم ابو میاں کو بھی دینا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ دس ہزار کی یہ رقم شاہ جہاں کا مالک، ابو میاں کے کیس پر خرچ کر رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا... کہ یہ رقم ابو میاں کی ذات کو فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچانے پر خرچ کی جاتا تھی۔

میں اس خیال سے سیدھا جی کے ہاں پہنچا کہ وہ شاہ جہاں سے واقف ہے تو اس کے مالک سے بھی واقف ہو گا۔ جی سوسائٹی، گلشن اقبال اور لیاقت آباد کے بد معاشوں کو جانتا تھا اور پھر ان پولیس والوں سے اس کے تعلقات بھی تھے جو اس سے جھوٹے وصول کرتے تھے۔ جی سو رہا تھا۔ اس کے بھائی نے بتایا کہ وہ صبح چھ بجے گھر آکر سویا ہے۔ میرے کہنے پر اسے جگایا گیا۔ اس نے اپنے بھائی کو چائے لانے کے بہانے باہر بھیج دیا تو میں نے پوچھا۔ ”کتنی رقم جیتی؟“

”پھر وہ کہاں گئی ہوگی۔“ میں خود کلامی کے اندر میں بڑبڑایا۔ ”کہیں اس نے خود کو پولیس کے حوالے تو نہیں کر دیا؟“

”تم نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟“ چابی کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ”ممکن ہے‘ اخبار میں شاہ جہاں کے قتل اور خبثت کی گرفتاری کی خبر ہو۔“

”اخبار تو میں نے نہیں دیکھا سیدھا آپ کے پاس چلا آیا۔“

”اچھا بیٹھو۔ میں اخبار لے کر آتی ہوں۔ میں نے بھی آج کا اخبار نہیں دیکھا۔“

چابی ساتھ والے کمرے میں چلی گئیں اور وہاں سے اخبار لے آئیں۔ میں نے خبروں والا صفحہ دیکھا۔ اس میں شاہ جہاں کے قتل کی خبر نہیں تھی۔ میں نے کوئی دو تین بار اخبار الٹا پلٹا۔ قتل اور ذکیت کی چھوٹی بڑی خبریں چھپی ہوئی تھیں۔ چابی نے بھی اخبار کا کونا کونا چھان مارا مگر اس میں شاہ جہاں کے قتل یا خبثت کی گرفتاری کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خبثت پولیس اسٹیشن بھی نہیں گئی۔

”شاہ جہاں کے قتل کی خبر کیوں نہیں چھپی؟“ چابی نے اخبار تہ کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”شاید پولیس کو قتل کی اطلاع نہیں ملی ہوگی۔ اگر ملی ہوگی تو بہت تاخیر سے۔“

”تو پھر خبثت کے بارے میں خبر کیوں نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ پولیس اس کے قتل کو راز رکھنا چاہتی ہو۔“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”شاہ جہاں کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے اور نہ خبثت کسی وزیر کی بیٹی ہے۔ پھر ایسے جرائم پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کہیں خبثت کسی اور مصیبت میں تو نہیں پھنس گئی؟“

”ایسا تو نہیں کہ اسے راستے میں اغوا کر لیا گیا ہو۔“

”اغوا!“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”خبثت کو کس نے اغوا کیا ہو گا؟“

”کسی بد معاش نے؟“ چابی بولی۔ ”خبثت جب شاہ جہاں کے ہاں سے آ رہی ہوگی، ممکن ہے اس پر کسی بد معاش کی نظر پڑ گئی ہو... سسنان راہوں میں بے سارا لڑکیوں پر تو فوری نگاہ پڑتی ہے۔“

”ہاں۔ اس کا امکان ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا ”اسے خائف دیکھ کر کسی آوارہ گرد نے سارا دینے کی پیشکش کی ہو اور ہٹلا پھلکا کر کہیں لے گیا ہو۔“

”اگر ایسا ہوا تو میں ابو میاں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔“ چابی سک پڑیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ غلطی خبثت کی ہے۔ نہ گھر سے جاتی اور نہ ہم سب پریشانی میں مبتلا ہوتے۔“

”اب میں کیا کروں بھیا؟ وہ ساڑی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔ ”خدا معلوم اس

”خشم کی ذرا سی غلطی کی اسے کتنی بڑی سزا مل رہی ہے۔ وہ ایک چھوٹے شیطان کے ہاتھوں سے نکل کر ایک بڑے شیطان کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔“

”اب آپ کیا قدم اٹھانا چاہتے ہیں؟ کیا خشم کو محی الدین کے ہاتھ سے چھڑانا چاہتے ہیں؟“

”ہاں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”خشم کو اس خبیث کے ہاتھوں سے چھڑا لوں گا تو سمجھو کہ میں نے کفارہ ادا کر دیا۔“

”جی کا چھوٹا بھائی ایک رے میں چائے اور پر ٹکلف ناشتے لے کر اندر داخل ہوا تو جی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ جب اس کا بھائی تپائی پر رے رکھ کر چلا گیا تو اس نے تپائی میری طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ”محی الدین جیسے لوگوں سے ٹکر لینا آسان نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ نہ صرف دولت مند ہیں بلکہ بارسوخ بھی ہیں۔ دولت کی وجہ سے شرفا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اگر ہم اس کے ہاتھ لگ گئے تو وہ ہمیں زندہ دفن کر دے گا۔“

”کچھ بھی ہو دوست! میں خشم کی رہائی کے لیے جا رہا ہوں۔ اسے ہر قیمت پر واپس لے کر آؤں گا۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔“

”تم! میں نے حیرت سے کہا۔ ”نہیں جی نہیں۔ تم کس لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔ میری بات اور ہے۔“

”مجھے وہ منظر یاد آ رہا ہے جب میں نے خشم کو دیکھا تھا۔“ جی کہنے لگا۔ ”وہ کسی چڑیا کی طرح سہمی ہوئی سی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں التجائیں تھیں مگر اس لیے مجھ پر ان التجاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے خشم کو کسی اور انداز سے دیکھا تھا لیکن جب میں صبح گھر واپس آ رہا تھا تب بے اختیار اس کا خیال آیا پھر میری نظروں میں اس کا مغموم چہرہ ابھر آیا۔ تب مجھے پچھتاوا سا ہوا کہ میں نے خشم کو اس بد معاش کے ہاتھوں سے کیوں نہیں چھڑایا؟ زندگی میں ایک نیکی کا موقع آیا تھا اسے بھی میں نے کھو دیا، اب پھر موقع مل رہا ہے تو میں اس نیکی کو کیوں ضائع کر دوں؟“

میں جی کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ میں نے بادل خواستہ فیصلہ کیا کہ جی کو بھی ساتھ لے لوں۔ ایک سے دو بھلے۔ جی ساتھ رہے گا تو اس کا سارا رہے گا۔ میں نے جی سے پوچھا۔ ”ہمیں ہتھیار وغیرہ کی ضرورت پڑے گی۔ کیا تم اس کا بندوبست کر سکتے ہو؟“

”ہمیں ہتھیار کی نہیں حوصلے کی ضرورت ہے۔“ جی مکرایا۔ ”جس قسم کا ہتھیار کہیں گے اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ آپ بھی تو جانتے ہیں کہ ہتھیار کہاں سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ میرے خیال میں دو پستول کافی ہوں گے۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”مگر دونوں پستول سائبر والے ہوں تو بہتر ہے۔“

میں نے اور جی نے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ محی الدین کے ہاں رات کے وقت آپریشن

”تین ہزار! وہ مکر کے بولا۔ ”آپ کے آنے سے پہلے تو میں بار رہا تھا۔ آپ کے آنے کے بعد میری قسمت جاگ اٹھی۔“

”میں تمہیں پھر ایک زحمت دینے آیا ہوں۔“

”ایک بار نہیں ہزار بار زحمت دیں۔ میں حاضر ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”ہاں تو کیا ہوا؟ کیا آپ اس لڑکی کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے؟“

میں نے اسے کسی قدر تفصیل سے سارا واقعہ سنا کر اپنا مدعا بیان کیا۔ ”اسی سلسلے میں مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”شاہ جہاں کو قتل کر دیا اور اب تک شاید پولیس کو خبر نہیں ہو سکی مگر میں بتا سکتا ہوں کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔“

”کس نے قتل کیا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”محی الدین نے۔“

”محی الدین کون ہے؟“

”شاہ جہاں کا باس اور پیغم کار پوریشن کا مالک۔“

”مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ شاہ جہاں کو محی الدین نے قتل کیا ہے؟“

”میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا تھا کہ جس وقت میں شاہ جہاں کو شراب کی بوتل دے کر بنگلے میں داخل ہو رہا تھا تو محی الدین کی مرشد شاہ جہاں کے بنگلے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نیم تاریکی کی وجہ سے یہ نہیں دیکھ سکا کہ اس کار میں کتنے آدمی ہیں، میرا قیاس ہے کہ وہ اکیلا ہی ہو گا۔“

”محی الدین، شاہ جہاں کو کیوں قتل کرنے لگا۔ وہ تو اس کا خاص آدمی تھا۔“

”خشم کی وجہ سے؟“

”خشم کی وجہ سے، کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں، وہ لڑکی کچھ اتنی حسین ہے کہ ہر شخص اس سے قریب ہونا چاہتا ہے۔ اسے اپنے دل میں قید کر لینا چاہتا ہے۔ اسے دیکھ کر خود میرا بھی بی جی چاہنے لگا تھا۔“ جی نے وضاحت کی۔

”مگر شاہ جہاں کو اسی لیے ٹھکانے لگایا گیا ہو کہ وہ بددیانتی کا مرتکب ہو رہا تھا۔“

”کیسی بددیانتی؟“

”محی الدین نے خشم کو اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے اغوا کر لیا تھا۔ شاہ جہاں نے سوچا ہو گا کہ کیوں نہ میں پہلے اپنی محنت وصول کر لوں۔ محی الدین بڑا سنگ دل ہے وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات پسند نہیں کرتا... اسے شاہ جہاں کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی ہو گی اس لیے اسے ٹھکانے لگا دیا۔“

”محی الدین کہاں رہتا ہے؟“

”ڈنٹیس میں، پارک کے مین گیٹ کے سامنے جو گلابی رنگ کی کوٹھی ہے وہ اسی میں رہتا

داخل ہو کر پورچ کی طرف بڑھا جہاں محی الدین کی مرشدیز کھڑی تھی۔ اس نے جیب سے چاقو نکال کر ایک ٹائر پچھر کر دیا۔ یہ منصوبے کا پہلا مرحلہ تھا جو کامیابی سے انجام پانگیا۔ جی پلٹ کر میرے پاس آیا۔ اب یہ معلوم کرنا تھا کہ شبنم اس کو بھی میں موجود ہے یا نہیں۔ اگر وہ نہ ہوتی تو ہماری بھاگ دوڑ رانگاں جاتی۔

ہم قدم چھونک چھونک کر آگے بڑھے۔ میں دائیں جانب گیا جبکہ وہ بائیں جانب۔ میں ٹھیک اس جگہ پہنچ کر رکھا تھا جہاں پائپ لائنیں اوپر تک چلی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک پائپ کھڑکی کے قریب سے بھی گزرتا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا اور ایک پائپ کے ذریعے اوپر چڑھتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ ایک پیر منڈیر پر رکھنے کے بعد میں نے کھڑکی کی چوکھٹ پکڑی۔ نجانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ شبنم اسی کمرے میں قید ہے۔ اس کمرے پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں چند لمحوں تک کان لگائے رہا۔ کوئی آہٹ تک سنائی نہیں دی۔ میں نے کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے کا کونا پکڑ کے ذرا سا ہٹایا۔ وہ ایک آرامتہ و پرستہ خواب گاہ تھی۔ اس خواب گاہ کے وسط میں کرسی پر کوئی غم و یاس کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ شبنم! میرے دل کے گوشوں سے ایک صدا گونجی۔ اس کمرے کا دروازہ مغلقل تھا۔۔۔ میں شبنم کو آواز دینے ہی والا تھا کہ کمرے کی دوسری جانب سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر باہر سے دروازہ کھولا گیا۔ میں نے پردہ برابر کر دیا۔ کمرے میں آنے والے نے شبنم سے پوچھا۔ ”کو تو تھمارے لیے کھانا لے آؤں؟“ آواز مردانہ تھی۔

”مجھے کھانا نہیں تھوڑا سا زہر لا کر دے دو یا پھر تم نے شاہ جہاں کو جس طرح ختم کیا تھا“ مجھے بھی ختم کر دو۔“

”میں نے اسے اس لیے ختم کر دیا کہ وہ نمک حرام لکھا۔ وہ تمہیں تباہ و برباد کرنا چاہتا تھا۔“

”تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہو؟“

”میں تمہیں رانی بنانا چاہتا ہوں۔ تم رانی بن جاؤ گی اور لوگوں پر حکمرانی کرو گی تو دولہے کی بارش شروع ہو جائے گی“

”دل پر حکمرانی کرنے سے دولت کا کیا تعلق؟“ شبنم نے معصومیت سے پوچھا۔

”یہ تمہیں بعد میں معلوم ہو جائے گا۔ تم پارس پھر ہو۔ میں اس پتھر سے دنیا کی ساری دولت کھینچ لوں گا۔“

”تم شاہ جہاں سے بھی بڑے خبیث ہو۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم نے میرے حصوں کے لیے کیا منصوبہ بنایا تھا۔ میرے باپ کو جیب کاٹنے کے الزام میں پھنسا دیا تاکہ مجھے اغوا کر کے اپنے گھناؤنے مقاصد حاصل کر سکے۔ میں مر جاؤں گی مگر تمہارے اشاروں پر نہیں چلوں گی۔“

”تم ایک ذہین اور حسین لڑکی ہو۔ پڑھی لکھی بھی ہو۔ جذباتی بننے کی بجائے عقل سے کام لو۔ اپنی قدر و قیمت کا اندازہ کرو۔“ وہ ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔ ”تمہارا باپ تمہاری شادی زیادہ سے

کرنا تھا پہلے تو ہم نے بازار جا کر پاناکا دکان سے کیوس کے جوتے خریدے۔ پھر سراب گوٹھ پہنچ کر گلاب خان سے دو پستول سائیکلر سمیت ایک روز کے لیے کرائے پر لیے۔ ان دونوں پستولوں کو لوڈ کر لیا۔ شام سے پہلے ہم ڈیفنس پہنچ گئے۔ میں جی کو اپنے ساتھ مناف میاں کے ہاں لے گیا۔ آج وہاں جوئے کی محفل نہیں تھی۔ مناف میاں گھر پر تھے۔ جی وہاں نہیں نکلا اور تھوڑی دیر بعد اپنے چند دوستوں سے ملنے چلا گیا۔ پھر رات نو بجے آیا تو کسی اندرونی جذبے سے اس کا چہرہ دکھ رہا تھا۔ میں اور مناف میاں کھانے پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے اپنا آپریشن مناف میاں سے پوشیدہ رکھا۔

جی نے مناف میاں کے سامنے کوئی بات نہیں کی۔ جب ہم کھانا کھا کر مناف میاں سے مل کر گھر جانے کے بہانے لگے تو جی نے چلتے چلتے راستے میں مجھ سے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے حالات ہمارا ساتھ دیں گے۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ”کوئی خاص خبر لائے ہو کیا؟“

”ہاں!“ جی نے سر ہلایا۔ ”اس کو بھی میں محی الدین اپنے دو تین ملازمین کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی دو بیویاں ہیں۔ ایک لاہور میں ہے جو کسی ٹیکسٹائل کے جنرل مینجر کی بیٹی ہے دوسری بیوی حیدر آباد میں رہتی ہے۔ وہ یہاں چونکہ تنہا ہے اس لیے کچھ پر اسرار سرگرمیوں میں ملوث ہے۔“

”کیا یہ بات تمہارے دوستوں نے بتائی ہے؟“

”ہاں۔“ جی بولا۔ ”اس کی سرگرمیاں کچھ ایسی ہیں کہ آج تک پولیس ہاتھ نہیں ڈال سکی۔“

”شبنم کیا اسی کے بنگلے پر ہے؟“

”میں نے اس کے بارے میں کسی سے نہیں پوچھا۔ اخفائے راز کا ڈر تھا۔“ وہ بولا۔

”یہ آپ کہیں تو میں اپنے چند دوستوں کو بھی ساتھ لے لوں؟“

”نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں... ہم دونوں ہی کافی ہوں گے۔“ میں نے تین سے کہا۔

”رات پونے بارہ بجے ہم محی الدین کی کوٹھی کے عقب میں تھے۔ امریکی طرز پر بنی ہوئی

اس کوٹھی کے احاطے کی دیواریں پانچ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ کوٹھی کے احاطے میں کسی بھی سمت سے داخل ہوا جا سکتا تھا۔ جی گردو پیش کا جائزہ لے رہا تھا اور میں کوٹھی کا... کوٹھی کا

زیریں حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ البتہ اس کے وسیع و عریض برآمدے میں ایک بلب روشن تھا۔

بالائی حصے کے دو تین کمروں میں روشنی نظر آرہی تھی۔ ایک کمرہ جو کونے پر تھا جہاں سے ڈرچ

اور پائپ لائنیں جاری تھیں۔ اس کمرے کی کھڑکی میں گرل تھی۔ وہ کسی قدر تیز روشنی میں نمایا

ہوا تھا۔ وہاں سے روشنی پردے سے چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ کھڑکی کے پتے کھلے ہوئے تھے۔

جی نے مجھے وہاں رکھنے کا اشارہ کیا اور جی کی طرح دبے قدموں کوٹھی کے احاطے میں

”مجھے معاف کر دیں سکندر صاحب!“ اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر خجالت ابھر آئی۔

”تم تھانے میں جانے کی بجائے شاہ جہاں سے متاثر ہو کر باہر ہی سے اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس جلد بازی کی تمہیں کتنی بڑی سزا مل رہی ہے۔“

”شاہ جہاں کا کیا حشر ہوا؟ آپ کو معلوم ہے؟“

”مجھے معلوم ہے۔ میں تمہاری تلاش میں وہاں پہنچا تو مجھے دیر ہو چکی تھی۔ محی الدین‘ شاہ جہاں کو قتل کر کے تمہیں لے جا چکا تھا۔“

”تو آپ کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے؟“ اس نے متعجب ہو کر پوچھا۔

”ہاں۔“ میں سر ہلا کر رہ گیا۔

”آپ یہاں کس لیے آئے ہیں؟ آپ نہیں جانتے کہ یہ لوگ کتنے درندے ہیں۔ یہ آپ کو مار ڈالیں گے۔ فوراً جا کر پولیس کو اطلاع دے دیں۔ میں پولیس کو بتانا چاہتی ہوں کہ محی الدین نے کس طرح شاہ جہاں کو قتل کیا ہے؟“

”ممکن ہے، پولیس میری بات پر یقین نہ کرے اور ہماری مدد کو نہ آئے۔ اس پر بھروسہ کرنا حماقت ہوگی۔ محی الدین بہت با اثر ہے۔ اونچے لوگوں سے اس کے روابط ہیں۔ میں اس کے مقابلے میں گناہ اور چھوٹا سی مگر میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔“

”یہ لوگ کچھ دیر میں مجھے یہاں سے بہادر آباد لے جائیں گے۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کے خیال میں یہ جگہ غیر محفوظ ہے۔“

”میں اور میرا دوست جی تمہیں ان درندوں سے چھڑانے آئے ہیں۔ میرا دوست ہی ہے جو شاہ جہاں کے ہاں شراب پلائی کرتا تھا۔ اگر ہم دونوں بد قسمتی سے پکڑے گئے تو تم ہماری طرف سے انجان بن جانا۔ اس لیے کہ ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ یہاں ذکیٹی کی نیت سے آئے ہیں۔“

”خدا نہ کرے کہ آپ پکڑے جائیں۔“ وہ تڑپ کر بولی۔

”اپنی حفاظت کے لیے یہ پستول رکھ لو۔“ میں نے جیب سے پستول نکال کر اس کی طرف بڑھایا مگر وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ ہلکی سی آواز ہوئی۔ وہ گھبرا کر بولی۔ ”مجھے پستول کی ضرورت نہیں۔ اسے چلانا بھی تو نہیں آتا۔ اسے آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر تیزی سے پھسلتا ہوا نیچے آیا۔ پستول اٹھا کر میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی آ تو نہیں رہا؟ جب اطمینان ہو گیا تو کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑی مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھتی ہوئی ہاتھ ہلاتی تھی میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔

اس کے بعد میں تیزی سے اس سمت میں بڑھ گیا جہاں مجھے کوئی خبر نہیں تھی کہ جی اس وقت کہاں ہو گا اور کیا کر رہا ہو گا۔ میں گھوم کر برآمدے کے پاس پہنچا تو وہاں جی کھڑا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر اپنے

زیادہ کسی کلرک یا بینک کے کسی معمولی سے افسر سے کہہ دے گا۔ وہ تمہیں کیا دے گا، بھوک، افلاس، بیماریاں اور درجن بھر بچے۔ تم شادی کے چھ سات برس بعد ہی اپنا حسن اور اپنی کشش کھود دو گی۔ بچوں کی وجہ سے پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملے گا۔ میری راہ اختیار کرنے سے تم ایک مہارانی کی طرح زندگی گزارو گی۔ تمہارے پاس کوٹھی ہو گی، بنگلا ہو گا۔ کاریں، جواہرات، دنیا کے اعلا اور قیمتی لمبوسات، زندگی اتنی خوابناک ہو گی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“

”کبھی تم نے حلال کمائی کا لطف اٹھایا ہے؟“

”اجتھانہ باتیں مت کرو۔“

”تم میرا کیا بگاڑ لو گے؟“ شبنم نے بے خوفی سے کہا۔

”اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تم دو تین دن میں سن لو گی کہ تمہارا باپ حوالات سے فرار ہوتے ہوئے پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔ پھر میں تمہارے چہرے پر تیزاب پھینک دوں گا تاکہ تم اپنا بد نما چہرہ لے کر کراچی کی گلیوں میں بھیک مانگتی پھرو۔ میں محی الدین ہوں، جس لڑکی کو چاہے بھکارن بنا دوں جسے چاہے مہارانی۔ میرا فیصلہ کسی چٹان کی طرح اٹل ہوتا ہے۔“ اس نے

دہشت ناک لمحے میں کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ پھر اس نے بڑی زور سے دروازہ بند کیا۔ اس کے قدموں کی چاپ گونجتی ہوئی معدوم ہو گئی۔ پھر وہی سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں شبنم کی سسکیاں گونجنے لگیں تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دل میں کڑیاں چبھ رہی ہوں۔ میں نے پردہ ایک طرف ہٹایا۔ شبنم دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اسے

آواز دی۔ ”شبنم... شبنم...“

”گریہ و زاری کی بنا پر وہ میری آواز نہیں سن سکی۔ دوسری بار میں نے اسے تیز آواز میں پکارا تو وہ چونک اٹھی۔ شاید اس نے میری آواز پہچان لی تھی مگر اس طرح پلکیں جھپک رہی تھی جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا ہو۔“

اس نے گردن گھما کر جائزہ لیا تو اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ لپک کر میری طرف آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے سے حزن و ملال کے بادل پھٹ گئے اور مسرت و انبساط کی ایک ہلکی سی لہر نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ وہ کھڑکی کی گرل پکڑے مجھے دیکھ رہی تھی۔ انداز میں والمانہ بن تھا۔ ”سکندر صاحب آپ؟“ اس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

یہ میری اس سے دوسری ملاقات تھی۔ یہ ملاقات کچھ اس انداز میں ہوئی تھی کہ مجھے قسمت کی ستم ظریفی پر ہنسی آگئی وہ گرل تھامے کھڑی تھی اور میں بلندی پر منگا ہوا تھا۔

ویسے وہ جس والمانہ انداز میں دوڑ کر کھڑکی سے آگئی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے دل میں بھی میری محبت کی شمع روشن ہے۔ اس کے چہرے کی ضیاء پاشی چلتی کھارہی تھی کہ وہ میری آمد کی ہنسنے لگی۔ اس کی آنکھیں مجھے ہی تلاش کر رہی تھیں۔

”شبنم تم نے بہت بے مہربانی سے کام لیا۔ اگر تم اس معاملے میں غلط نہ کرتیں تو ایسی مصیبت میں گرفتار نہ ہوتیں۔“

”شبنم تم نے بہت بے مہربانی سے کام لیا۔ اگر تم اس معاملے میں غلط نہ کرتیں تو ایسی مصیبت میں گرفتار نہ ہوتیں۔“

کس پر فائر کرے۔ وہ جو اس بابت ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ میری چلائی ہوئی گولی اس کے دائیں بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ وہ اچھل پڑا مگر اس نے ریوالتور نہیں پھینکا۔ سر اسیمکگی میں اس نے جی پر فائر جھونک دیا۔ میں نے اس پر دوسرا فائر کیا تو گولی اس کے ریوالتور پر لگی۔ ریوالتور اس کے ہاتھ سے جھوٹ کر قاتلین پر گر گیا اور وہ خود قلا بازی کھا کر صوفے پر گرا۔ ہم دونوں نے لپک لپک ریوالتور اٹھا لیے جی نے اس درندے سے کہا۔ ”اب بتاؤ! تمہارے بیٹے میں کتنی گولیاں اتاری جائیں؟“

وہ جواب کیا دیتا۔ درذکی شدت سے بلبل رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ اس کی ٹانگ سے خون نکل کر اس کی کریم کمر کی چٹون میں جذب ہو رہا تھا۔ دوسرے کا ہاتھ زخمی ہوا تھا۔ وہ بائیں ہاتھ سے دایاں ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ لولہمان ہو رہے تھے۔ البتہ تیسرا ہمیں خوفزدہ انداز میں دیکھ رہا تھا اور فرار کی راہیں ڈھونڈ رہا تھا۔

ہم اپنے آئندہ اقدام کی منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ میرے اور جی کے سر پر سے گولیاں سنسناتی گزریں اور سامنے والی دیوار میں پیوست ہو گئیں۔ پھر ایک غراہٹ سنائی دی۔ ”پستول پھینک دو نہیں تو تمہاری کھوپڑیوں میں سوراخ ہو جائیں گے۔“

میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی زینے پر کھڑا ہے۔ ہماری فوج عارضی ثابت ہوئی تھی۔ میرے ذہن سے یہ نکل گیا تھا کہ اوپر محی الدین موجود ہے۔ وہ فائرنگ کی آواز سن کر نیچے آسکتا ہے۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ میں جی کو بھی نہیں بتا سکا تھا کہ سب سے بڑا شیطان اوپر ہے۔ البتہ اسے اشارے کنایے سے شبنم کی موجودگی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اگر جی کو محی الدین کے بارے میں معلوم ہو تا تو وہ یقیناً ”اسے قابو میں کرنے کے لیے بھی کوئی منصوبہ بندی کر لیتا لیکن اس وقت وہ بے بس تھا۔“

میں نے اور جی نے اپنے اپنے پستول اور وہ ریوالتور جو اپنے قبضے میں کیے تھے انہیں پھینکنے میں تامل کیا تو ایک اور فائر ہوا جس سے قریبی میز پر رکھا ہوا گلدان چکنا چور ہو گیا پھر آواز آئی۔ ”اسی طرح تمہاری کھوپڑیوں میں بھی سوراخ ہو سکتے ہیں۔“

ہم نے گھبرا کر پستول اور ریوالتور پھینک دیے پھر آواز کی طرف گھوسے۔ زینے پر نیل سوٹ والا ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوفناک قسم کا ریوالتور چمک رہا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ محی الدین تھا۔

محی الدین وجہ تھا۔ رنگت نکھری ہوئی، بلند قامت، صحت مند اور چاق و چوبند... میرا خیال تھا کہ اتنے دلکش صرف فلمی ہیرو ہی ہوتے ہیں۔ وہ ہماری طرف سے ہوشیار تھا۔ اس کی انگلی ٹرانسگر پر جی ہوئی تھی جیسے ہمارے حرکت کرتے ہی وہ فائر کر بیٹھے گا۔ اس نے زینے طے کر کے نیچے آتے ہوئے اپنے اس گرگے کو حکم دیا جو زخمی نہیں تھا۔ ”ٹوٹی، پولیس کو فون کرو اور کہو کہ یہاں دوسٹ ڈاکو گھس آئے ہیں اور انہوں نے ہمارے تین آدمیوں کو زخمی کر دیا... مگر نہیں پہلے شیدے کو فون کرو۔ وہ گلشن والے ٹھکانے پر ہو گا۔ اس سے کہو کہ بلبل کو ہمارے آباد والے مکان میں لے جائے۔“

بیچے آنے کے لیے کہا۔ سامنے ایک کمرہ تھا جس میں روشنی ہو رہی تھی اور دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ جی دبے پاؤں دروازے کے پاس پہنچا، پھر اندر جھانکنے لگا اور جیب سے پستول نکال کر مجھے اشارہ کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ ایک وسیع و عریض اور خوبصورت نشست گاہ تھی۔ اس کی آرائش و زیبائش اس انداز میں کی گئی تھی کہ ہم دونوں چند لمحوں کے لیے اس کے حرم میں کھو کر رہ گئے۔ بڑا خواب ناک ماحول تھا لیکن کمرے کے گمرے سانے نے میری چھٹی حس کو بیدار کر دیا۔ مجھے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی جیسے کوئی ہمیں دیکھ رہا ہو، ہماری حرکت و سکنت پر اس کی نظریں جی ہوئی ہوں۔ میں نے گرد و پیش پر ایک نظر ڈالی مگر مجھے کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔

میں نے جی کو اوپر چلنے کا اشارہ کیا۔ شبنم پہلی منزل پر قید تھی۔ محی الدین بھی اوپر تھا۔ اس کے ساتھی بھی وہیں ہو سکتے تھے۔ ہم محتاط انداز میں اس زینے کی طرف بڑھے جو دائیں جانب تھا۔ اس قدر محتاط ہونے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ نشست گاہ کے فرش اور زینے پر قاتلین بچھا ہوا تھا۔ ہم زینے کے پاس پہنچے ہی تھے کہ ایک کرجٹ آواز سانے کو چیرتی ہوئی ہماری سماعت سے نکرائی۔ ”کون ہے؟ ٹھہرو۔“

آواز عقب سے آئی تھی۔ میرے جسم میں ایک سرد لر دوڑ گئی۔ پاؤں جیسے ٹھنڈ ہو گئے۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ تین تھے اور ریوالتوروں سے مسلح تھے۔ ان کے چروں سے درندگی جھلک رہی تھی۔ ان میں سے ایک اس طرح چونکا جیسے ہمیں پہچانتا ہو۔ اس نے تھکمانہ لہجے میں کہا۔ ”اپنے پستول فرش پر پھینک دو۔“

”وہ تینوں ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ ہم بھی ان کی جانب بڑھے۔ جس نے ہمیں حکم دیا تھا، وہ جی سے استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”سور کے بیچے! یہ تم ہو۔ جیب کاٹتے کاٹتے اب ڈاکے بھی ڈالنے لگے۔“

”اگر میں سور ہوں تو پھر تم کیا ہو؟“ جی نے پوچھا۔ ”ماسور؟“

یہ سنتے ہی اس درندے کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی برسنے لگیں۔

”اگر تمہارے دل میں کوئی حسرت ہے تو ضرور پوری کرو“

میں سمجھ گیا کہ جی اسے باتوں میں الجھا رہا ہے تاکہ موقع سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ میں نے لمحاتی وقفے سے فائدہ اٹھا کر سرعت سے فائر جھونک دیے۔ پہلا نشانہ خطا ہو گیا دوسری گولی ایک بد معاش کے ہاتھ پر لگی تو اس کا پستول جھوٹ کر قاتلین پر گر پڑا۔ اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ اس کی انگلیوں سے خون کی موٹی موٹی بوندیں نچنے لگیں۔ اس کا چہرہ تشبیہ سے گزر گیا۔ جی نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے دشمن پر فائر کیا تو گولی اس کی ٹانگ میں لگی۔ اس نے بھی جولاہا جی پر فائر کیا لیکن جی کی گولی اس کی ٹانگ پر لگ چکی تھی۔ اس نے دل خراش چیخ مارتے ہوئے جی پر فائر کیا تھا۔ گولی لگنے سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، اس لیے اس کا نشانہ خطا گیا۔ جی کی زندگی تھیں کہ وہ بچ گیا۔ گولی سنسناتی ہوئی اس کے سر سے گزر گئی۔ تیسرے بد معاش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

گی۔ پھر وہ جی کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے میری کھال ادھیڑ دے گی۔ میں نے تہہ کر لیا کہ جان دے دوں گا مگر جی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ذرا اس بات کا تھا کہ محی الدین کا ایک ساتھی جی سے واقف تھا۔ شاید وہ جی کا ٹھکانا بھی جانتا ہو۔ میں انہیں سوچوں میں غرق تھا کہ محی الدین کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”ٹوٹی“ اسٹور روم سے رسی لا کر اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔“

تھوڑی دیر بعد میرے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے۔ محی الدین کا گر کا شیدا بھی آگیا۔ وہ بھی چہرے سرے سے اچھا آدمی نہیں لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور مونچھیں بڑی بڑی... اس نے اپنے دائیں کلمے میں پان دبا رکھا تھا۔ جسم پر ڈھیلے ڈھالے کپڑے تھے اور گلے میں رنگین رومال بھول رہا تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سگریٹ کا ایک طویل کش کھینچا اور محی الدین کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”وہ سنری چڑیا کہاں ہے صاحب؟“

”اوپر کمرے میں۔“ محی الدین بولا۔ ”اسے بہادر آباد والے ٹھکانے پر شفٹ کر دو۔ مگر ہوشیاری سے، کوئی ہنگامہ نہ ہونے پائے۔“

”بے فکر رہو صاحب۔“ شیدے نے اپنے غلیظ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم لوگ کو ایسا کام کرنے کا بہت تجربہ ہے۔ ہم اس کو ایسا پیک کرے گا کہ وہ سانس لینا بھی بھول جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، اب چلے جاؤ تاکہ میں پولیس کو بلا سکوں۔ اس خبیث کا معاملہ نسا کر ان لوگوں کو اسپتال بھیجا ہے۔“

میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اس لیے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شیدا، جینم کو وہاں سے کب اور کیسے لے گیا۔ میں تو بس اتنا ہی جانتا تھا کہ میرے لیے اب فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اچھا ہوا کہ جی فرار ہو گیا۔ میں پہلی بار پولیس کے جتنے چڑھ رہا تھا۔ میرا کیا حشر ہونے والا تھا، وہ میں ہی جانتا تھا۔ کوئی چندہ میں منٹ بعد پولیس آگئی۔ تقریباً پورا تھا نہ ہی چلا آیا تھا۔ سب انسپکٹر اور ایس ایچ او بھی تھے۔ انہوں نے محی الدین سے خوب گرجوشی سے ہاتھ ملایا۔ پھر ان کے درمیان جس طرح گفتگو ہوئی، اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان لوگوں کے آپس میں نہایت گہرے تعلقات ہیں۔

محی الدین اور اس کے زخمی گروں نے اس واقعے کو بے حد عجیب بنا کر پیش کیا۔ میں اس دوران خاموش ہی رہا۔ میری بد قسمتی تھی کہ جینم وہاں نہیں تھی۔ وہ موجود ہوتی تو میں پولیس کو محی الدین کا اصل چہرہ دکھا دیتا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جینم کو بہادر آباد میں کس جگہ بھنک لیا گیا ہے ورنہ پولیس کو آگاہ کر دیتا۔

پولیس نے بیانات قلم بند کر کے دونوں پستول قبضے میں لے لیے۔ مجھ سے بیان لینے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ محی الدین کے ہاں سے نکلے ہوئے سب انسپکٹر نے کہا۔ ”تھانے پہنچ کر اس واقعے کی خبر دے دیتا ہوں تاکہ کل کے اخبارات میں ڈیکٹی کی خبر موجود ہو۔“

میں نے اندازہ لگایا کہ بلبل سے اس کی مراد جینم ہے۔

جب محی الدین اپنے گروں سے مخاطب تھا تو اس وقت میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جی کو اشارہ کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے۔ جی نے انکار کر دیا۔ وہ مجھے اس مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ ایسی حماقت نہ کرے۔ جی کو فرار ہونے کا موقع دینے کے لیے میرے ذہن میں ایک تدبیر آگئی۔ جیسے ہی وہ بد معاش ہمارے قریب آکر ہتھیار اٹھانے کے لیے جھکا، میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھا نتیجتاً قاتلین پر لڑھک گیا۔ میں اس سے گتھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ محی الدین مجھے سے دباؤ اسے چھوڑ دو ورنہ گولی مار دوں گا۔ یہ خالی خولی دھمکی تھی۔ اس کا گولی چلانا آسان نہیں تھا کیونکہ ہم دونوں گتھ گتھا ہو کر فلا بازیاں کھا رہے تھے۔ جی نے اس لمحے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اسے فرار ہوتے دیکھ کر وہ جیتا ہی رہ گیا۔ میں یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ جی کس طرح سے باہر کے دروازے کی طرف لپکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک گولی چلی، فضا میں ایک دھماکا ہوا۔ گولی جی کی بجائے دروازے پر پڑی اور دروازے کا وہ حصہ ادھر گر گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ جی بچ نکلے میں کامیاب ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد محی الدین ہم دونوں کے سروں پر آکھڑا ہوا۔ میں نے اس بد معاش کو جلد ہی قابو کر لیا۔ محی الدین نے ریوالور کی نال میری پیشانی پر رکھ کر سخت لمبے میں کہا۔ ”سیدھی طرح سے کھڑے ہو جاؤ نہیں تو تمہارا بھیجا سلامت نہیں رہے گا۔“

میں نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی اور اس بد معاش سے الگ ہو گیا۔

محی الدین نے ریوالور سے اشارہ کر کے کہا۔ ”چلو دیوار کی طرف۔“ جب میں دیوار کے قریب پہنچا تو اس نے کہا۔ ”دیوار کی طرف منہ کرلو۔“

میں دیوار کی طرف منہ کیے کھڑا رہا اور محی الدین مجھے کور کیے رہا۔ اس کے اشارے پر قاتلین صاف کر دیا گیا اور وہاں سے ریوالور اٹھا لیے گئے۔ اس کے گروں میں سے ایک نے تہہ سے کوفون کر کے بلایا پھر قریبی پولیس اسٹیشن کو رنگ کیا۔ محی الدین کی ہدایت کے مطابق انہیں یہ بیان دینا تھا کہ ایک مسلح ڈاکو نے آکر بنگلے پر اودھم مچایا مگر اس پر قابو پایا گیا۔ اس ڈاکو یعنی مجھے قابو کرنے میں دو افراد زخمی ہو گئے۔ دوسرے افراد نیتے تھے۔

”اگر اس نے ہمارے ریوالوروں کا تذکرہ کیا تو...؟“ ایک ساتھی نے اس سے کہا۔

”فکر نہ کرو۔“ تھانے کا تمام اسٹاف میری عزت کرتا ہے۔ میں اکثر ان کی فرمائش پوری کرتا رہتا ہوں۔ آج میں ان سے یہ فرمائش کروں گا کہ اس ڈاکو اور اس کے ساتھی کو گرفتار کر کے دونوں کی ایسی خاطر مدارات کی جائے کہ ساری زندگی یاد رکھیں۔“

”میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس کس قدر بے رحمانہ انداز سے مجرموں پر تشدد کرتی ہے۔ جب وہ ابو میاں جیسے شخص پر ترس نہیں کھا سکتی تو مجھ پر کیا کھائے

دوسری جانب سے کون بول رہا ہے اور میرے معاملات سے یکایک ہی کسی کو اتنی دلچسپی کیسے پیدا ہو گئی؟ بالاخر اس پیکیجز صفت تھانیدار نے کہا۔ ”اوکے سر“ میں اسے چھوڑے دیتا ہوں مگر کوئی بات ہو تو آپ سنبھالیے گا۔ بہتر ہے... میں اخبارات میں تردید بھی شائع کرادوں گا۔“

اس نے ریسپور، کریڈل پر رکھا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم نے اپنے بارے میں پہلے کیوں نہیں بتا دیا تھا؟ تمہیں اتنی پریشانی نہ اٹھانا پڑتی۔“

”میں نے تو بہت کچھ بتانے کی کوشش کی مگر تم لوگوں نے سنا ہی نہیں۔“

”اچھا چلو۔ ناشتا وغیرہ کرو۔ اور اپنا حلیہ درست کرو۔“ اس نے ایک سپاہی کو ناشتالانے کا حکم دیا... اور دوسرے کو اشارہ کیا کہ وہ میری حالت درست کرے۔

انہوں نے ایک کوٹھری میں لے جا کر میری اچھی طرح سے مالش کی پھر مضروب حصوں پر دوا لگا دی۔ دوا تیز اور سریع الاثر تھی۔ مجھے پندرہ بیس منٹ میں ہی آرام آگیا۔

اس تائید غیبی پر میں بے حد حیران تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے کس نے فون کیا تھا۔ وہ یقیناً ”کوئی با اثر آدمی تھا کہ تھانے دار کا رویہ یکدم ہی بدل گیا۔ اتنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ اخبارات میں میرے متعلق جو کچھ شائع ہوا ہے، یہ اسی کا رد عمل ہے۔ وہ شخص جس نے میری رہائی کے لیے فون کیا ہے، اس کے کسی شناسا کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہے کیونکہ شہر کا کوئی با اثر شخص میرے حلقہ احباب میں شامل نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کسی غلط فہمی کا ہی نتیجہ ہے۔

وہاں سے رخصت کرتے وقت تھانے دار نے مجھ سے اپنے ہیمنہ رویے کی معافی تو نہیں مانگی البتہ اس کے انداز میں پیشانی ضرور تھی۔ اس نے میری رقم اور نوٹ بک بھی واپس کر دی۔ یہی نہیں بلکہ میرے لیے ایک ٹیکسی بھی منگوا دی۔

میں تھانے سے گھر جاتے ہوئے تذبذب اور الجھن کا شکار تھا۔ معلوم نہیں، وہ کون تھا جس کی بنا پر مجھے رہا کیا گیا تھا۔ میرے جسم سے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا مگر غیر متوقع رہائی نے درد کا احساس تقریباً ختم کر دیا تھا۔ مجھے نیند بھی آرہی تھی۔ ان مردودوں نے مجھے رات بھر خوب مارا پٹا تھا۔ بے ہوش ہو جاتا تھا تو ہوش میں لا کر میری خاطر کی جاتی تھی۔ میں گھر جا کر سونا چاہتا تھا۔ راستے میں مجھے جی کا خیال آیا مگر اس وقت اس کے ہاں جانا مناسب نہیں تھا۔ وہ گھر پر نہیں مل سکتا تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ گرفتاری کے ڈر سے کہیں روپوش ہو گیا ہو گا یا شہر سے باہر چلا گیا ہو گا۔

میں نے ایک ہسپتال سے اخبار خرید کر صفحہ اول پر نظر ڈالی تو شاہ جہاں کے قتل اور محی الدین کے ہاں ذکیٹی کی خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ چھپی ہوئی تھیں۔ شاہ جہاں کے قتل کے سلسلے میں لکھا ہوا تھا کہ اسے نامعلوم قاتل نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ذکیٹی کی خبر میں میرا نام لکھا ہوا تھا اور جی کے فرار ہونے کی خبر بھی تھی۔ اگلے روز ذکیٹی کی خبر کے سلسلے میں کیا تردید آنے والی تھی، مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔

”خبر آپ کی مرضی کے مطابق ہوگی۔“ ایس ایچ او بولا۔ ”پرسوں اس کی تصویر بھی چھپ جائے گی۔“

تھانے پہنچ کر میرا رسمی بیان لینے کے بعد مجھ سے جی کے بارے میں پوچھا گیا۔ میں نے لاطعلقی کا اظہار کیا اور اپنے جرم کا اقرار کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ میں نے یہ کہانی گھڑی کہ میرا ایک دوست محی الدین کے ہاں ملازم ہے۔ میں محی الدین کے آدمیوں سے جو اکھیل رہا تھا کہ جھگڑا ہو گیا اور پستول نکل آئے، میرا دوست پستول دیکھ کر بھاگ گیا لیکن محی الدین نے مجھے پکڑ لیا تاکہ اپنے ساتھیوں کو بچا سکے۔ یہ پستول میرے نہیں ہیں۔

میرے اس بیان پر حوالات میں میرا جو حشر ہوا اسے میں ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا۔ مجھے اذیتیں دی گئیں کہ میں ذکیٹی کا اقرار کروں مگر میں مسلسل انکار کرتا رہا اور پٹتا رہا۔ علی الصبح میں بے ہوش ہو گیا۔ دو تین گھنٹے بعد ہوش آیا تو مجھے ایس ایچ او کے کمرے میں لے جا کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جسم کہاں کہاں سے مضروب ہے، اس کا مجھے اندازہ نہ ہو سکا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے تمام جسم ایک بڑا سا پھوڑا ہے جو ہر طرف سے دکھ رہا ہے۔ میری ایک آنکھ سوچ گئی تھی اور بالائی ہونٹ پھول کر دائیں جانب لٹک گیا تھا۔ ایس ایچ او نے فرعونیت سے کہا۔ ”غبیٹ عقل آئی کہ نہیں؟“

”میں اپنے بیان پر اب بھی قائم ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ میں اسے شاہ جہاں کے قتل، ختمیہ کے اغوا اور ابو میاں کے بارے میں بتا دوں۔ پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے شاہ جہاں کے قتل کے الزام میں بھی دھر لیا جائے۔

”معلوم ہوتا ہے، تمہاری خاطر تواضع صحیح طریقے سے نہیں ہوئی۔“ ایس ایچ او سر ہلا کر بولا۔ ”بہر حال، میں دیکھتا ہوں کہ تم کب تک زبان نہیں کھولتے۔“

معلوم نہیں وہ اور کیا کچھ کہنا چاہتا تھا اور میری زبان کھلوانے کے لیے اس نے کیا منصوبہ بنا رکھا تھا کہ اچانک ہی ٹیلی فون کی تھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسپور اٹھا کر ”ہیلو“ کہا پھر اس طرح سے چونکا ہو گیا جیسے اس نے ڈپٹی کمشنر کی آواز سن لی ہو۔ ”ہیس سر۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس نے اپنا نام سکندر بتایا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے... اچھی طرح سے چھترائی کی گئی ہے مگر اس نے ابھی تک زبان نہیں کھولی... جی؟ حلیہ...؟“ وہ چونک کر بولا۔ پھر میرا حلیہ دہرانے لگا۔ اس کے بعد بولا۔ ”اس پر متعدد الزامات ہیں۔ بغیر لاسٹنس کا اسلحہ، تین آدمیوں کو جان سے مارنے کی کوشش اور ذکیٹی کی واردت... جی، اس نے کچھ چاہا تو نہیں مگر محی الدین کی کوٹھی پر...“ وہ اچانک ہی خاموش ہو گیا جیسے دوسری طرف سے بولنے والے نے قطع کلامی کی ہو۔ ممکن ہے، اسے جھاڑ پلائی گئی ہو۔ اس لیے کہ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ ”مگر جناب کراچی میں ایک سکندر تو نہیں ہے۔ کہیں آپ کو غلط فہمی نہ ہوئی ہو۔ میں...“ وہ خاموش ہو کر پھر سننے لگا اور ہاں ہوں کرنے لگا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے حیرت ہوئی کہ

راستے میں رک کر میں نے ایک میڈیکل اسٹور سے خواب آور گولیاں لیں، گھر آکر انہیں طلق سے اتار کر پھر بستر سنبھال لیا۔ اس کے بعد میں دوسرے روز ہی کی خبر لایا۔ اس دوران میں کئی بار میری آنکھ اٹھ اٹھی مگر نیند کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ بستر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ خواب آور دوا کا بھی اثر تھا جس نے مجھ پر گہری نیند طاری کر دی تھی البتہ میں صبح بیدار ہوا تو خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔

میں چاچی کے ہاں پہنچا تو انہیں بہت اداس پایا۔ وہ میرے بارے میں خبر پڑھ کر ناامید ہو چکی تھیں۔ مجھے دیکھا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے انہیں تفصیل سے سارا واقعہ سنایا۔ وہ میری سنسنی خیز کہانی سن کر کچھ دیر سوچتی رہیں پھر بولیں۔ ”تم نے ایس ایچ او کو محی الدین کے بارے میں تو بتا دیا ہوتا؟“

”میرے پاس ثبوت کہاں تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پولیس ثبوت مانگتی ہے۔ بغیر ثبوت کے وہ ہم جیسوں کو دھر تو لیتی ہے مگر بڑے آدمیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی پھر مجھے بمبار آباد کا وہ مکان بھی تو نہیں معلوم جہاں خبثم کو لے جا کر قید کیا گیا ہے۔“

”تو پھر اب تم خبثم کو کیسے تلاش کرو گے؟“

”میں فی الحال جی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ اگر وہ مل گیا تو اس کی مدد سے خبثم کا کھوج لگاؤں گا۔“

”ذرا پولیس اسٹیشن جا کر ابو میاں کی خبر تو لے لو۔“ چاچی نے کہا۔

میں پولیس اسٹیشن گیا۔ ایک سپاہی مجھے میں نے پہلے روز میں روپے دیے تھے، مجھے الگ لے جا کر پوچھنے لگا۔ ”یہ ابو میاں کون ہے، کیا چکر ہے؟“

”کیسا چکر؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”کل محی الدین کا ایک آدمی آیا تھا، بڑے صاحب کی جیب گرم کرنے کے ابو میاں کا کیس نہ تو ابھی عدالت میں پیش کیا جائے اور نہ ہی اس کی ضمانت منظور ہونے دی جائے۔ اب تو آپ کو بھی اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ صاحب کا حکم ہے کہ اگر کوئی ابو میاں کے بارے میں دریافت کرنے آئے تو لاعلمی ظاہر کر دینا۔ اب تم ملنا تو درکنار اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکو گے۔“

میں نے سو کا ایک نوٹ اس کی مٹھی میں دبا کر پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”جلیل احمد۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا جلیل بھائی!“ میں نے کہا۔ ”ابو میاں کے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔ میں جب بھی آؤں گا تمہیں چائے پانی دے جاؤں گا۔“

”اس کے ناشتے وغیرہ کے لیے تو پیسے دیتے جاؤ!“ اس نے نوٹ جیب میں ٹھونسنے ہوئے کہا۔

”یہ سو کا نوٹ تو دیا ہے۔ اس میں سے بچاس تم رکھ لینا اور بچاس ابو میاں پر خرچ کر

دینا۔“

”یہ تو ہمارا چائے پانی ہوا۔“ وہ ہنس پڑا۔

”ایں!“ اس کی بے شری پر مجھے حیرت ہوئی اور قدرے غصہ بھی آیا۔ ”تمہاری تنخواہ چند سو روپے ہے اور تم چائے پانی کے لیے سو روپے رکھ رہے ہو۔ سو روپے لے کر تو بڑے صاحب بھی میرا کام کر دیں گے... لاؤ... نوٹ واپس کرو۔ میں تمہارے صاحب سے ہی معاملہ کر لیتا ہوں۔“

وہ میرے تیزو تند لہجے سے گھبرا گیا، کھیانے پن سے بولا۔ ”ماراض کیوں ہوتے ہو۔ میں اسی میں سے بچاس اس پر خرچ کر دوں گا۔“

”دیکھو بے ایمانی مت کرنا۔ ایک اور سپاہی میرا دوست ہے۔ میں تمہیں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ اس کے ذریعے معلوم ہو جائے گا کہ تم نے ابو میاں کا خیال رکھا یا نہیں۔ ناشتا چائے پانی دیا یا نہیں۔ اگر تم نے رقم ہڑپ کر لی تو بڑے صاحب سے شکایت کر دوں گا اور انہیں سب کچھ بتا دوں گا۔“

میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ وہ گھبرا گیا اور بولا۔ ”صاحب آپ اطمینان رکھیں۔ میں وہی کروں گا جو آپ کہہ رہے ہیں۔“

میں جی کے ہاں پہنچا تو اس کے چھوٹے بھائی نے بتایا کہ وہ حیدر آباد میں ایک دوست کے ہاں روپوش ہے۔ میں نے جی کے دوست کا پتہ لیا اور سوچا کہ مجھے حیدر آباد جا کر جی سے مل لینا چاہیے اور اسے صورت حال بتا کر واپس لے آنا چاہیے۔

میں لیاقت آباد جا کر حیدر آباد بس اسٹاپ پہنچا۔ وہاں میں نے ایک بننے کی جیب صاف کر لی۔

سہ پہر کے وقت میں حیدر آباد بس اسٹاپ پہنچا۔ وہاں میں نے ایک بننے کی جیب صاف کر لی جو اپنے ملازموں پر برہم ہو رہا تھا۔

رکشنے میں بھی کے دوست کے ہاں جاتے ہوئے بننے کا پھولا ہوا بوہ کھول کر دیکھا تو میرا رواں رواں خوشی سے جھوم گیا۔ پانچ پانچ سو اور ایک ایک سو کے نوٹوں کے ساتھ دس پانچ اور ایک ایک کے نوٹ مسکرا مسکرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہ میرے ہاتھ میں پہنچ کر نہال ہو رہے ہوں۔ ان کی تعداد بتا رہی تھی کہ میں نے خوب بھگوانا ہاتھ مارا ہے۔

میں نے بوہ جیب میں رکھ لیا۔ حیدر آباد چھوٹا مگر پر سکون سا شہر ہے۔ شام ہو رہی تھی۔ دھندلے پھیل رہے تھے۔ حیدر آباد کا حسن کسی نوجوان دوشیزہ کی طرح نکھر رہا تھا۔ جس وقت رکشا نہر بھلی پر سے گزر رہا تھا، میں نے نوٹ نکال کر بوہ نہر میں اچھال دیا۔ یہ سب کچھ چند ثانیے میں ہوا تھا۔ رکشنے والے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا ہو گا۔ بوہ سے نجات پانا بہر حال ضروری تھا کیونکہ کسی وقت بھی میری جیکینک ہو سکتی تھی اور بوہ برآمد ہونے پر پولیس سے پچھا چڑانا ممکن نہ ہوتا۔

رکشنے والے نے مجھے ٹھیک مطلوبہ گھر کے سامنے اتار دیا۔ جی کے دوست کا گھر لطیف آباد

”آپ نے یہاں آکر میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا۔“ جی تنکھ کے جذبات سے مغلوب ہو کر بولا۔

”کیا میں تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے تو میرے لیے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی۔“

امداد حسین اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ باتیں کریں۔ میں کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ وہ چلا گیا تو جی نے سرگوشی کی۔ ”ہم آج ہی بلکہ ابھی کراچی جانے کے بہانے کسی ہوٹل میں جا کر ٹھہر جاتے ہیں۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

”امداد آج کل مالی طور پر بہت پریشان ہیں۔ پھر ایک سوڈ خور کے مقروض بھی ہیں۔ ان کے چھ عدد بچے اور تین بہنیں ہیں جن کی وہ اب تک شادی نہیں کر سکے ہیں۔ میں جب سے آیا ہوں، روٹی چٹنی پر گزارا ہو رہا ہے۔ یہاں آتے ہوئے بد قسمتی سے میری جیب خالی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں کافی رقم لے آیا ہوں کچھ دیر کے لیے باہر چل سکتے ہو؟“

”چلو۔“ جی فوراً تیار ہو گیا۔

جی، امداد حسین کو آواز دے کر بلانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے روک دیا۔ برابر والے کمرے سے امداد حسین کی بیوی کی آواز آ رہی تھی۔ ”تمہارے دوست اور ان کے دوست یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ آنا ختم ہو گیا ہے۔ کس کس سے قرض مانگ کر لاؤں، کون دے گا، پہلے ہی محلے میں دو سو روپے قرض کے دینا ہیں۔ چھ سال سے زیور گروی پڑا ہے۔ اب تو وہ زیور بھی زندگی بھر نہیں چھوٹے گا... اپنے دوستوں سے کون... وہ کسی ہوٹل میں جا کر چھپ جائیں۔“

”آہستہ بولو۔“ امداد حسین نے کہا۔ ”دونوں کل تک چلے جائیں گے، بارہ گھنٹے کی تو بات ہے۔“

جی نے میرے اشارے پر امداد حسین کو آواز دی۔ امداد حسین آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”جتنی دیر میں کھانا تیار ہو گا، اتنی دیر میں ہم ایک دوست سے مل کر آتے ہیں۔“

باہر آکر ہم نے ایک رکشا روکا۔ میں نے جی کو راستے میں جیب تراشی والا واقعہ سنایا۔ پھر میں نے اپنی جیب سے ایک ہزار روپے نکال کر جی کو دیے۔ جی انکار کرتا رہا مگر اصرار پر اسے رقم لینا پڑی۔

ایک گھنٹے بعد ہم امداد حسین کے ہاں واپس گئے تو ہمارے ساتھ وافر مقدار میں روز مرہ کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ آٹا، دال چاول اور گوشت، انڈے وغیرہ۔

”یہ کیا ہے؟“ امداد حسین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”کچھ نہیں امداد بھائی!“ میں نے اس کا شانہ چھتھایا۔ ”آپ جی کی طرح مجھے بھی اپنا دوست سمجھیں۔ دوستی کے ناتے ہم آپ کے کام نہیں آئیں گے تو اور کون آئے گا؟“

”مگر...“ امداد حسین نے کچھ کہنا چاہا لیکن شدت جذبات سے ان کی آواز مغلوب ہو گئی۔

کے ایک پر سکون گوشے میں تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی بہت سے بچوں کا شور مچا دیا۔ وہ آدمی تنکھ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی منجمد آنکھوں سے کرب جھلک رہا تھا۔ وہ نوجوان تھا مگر نوجوانوں جیسا نہیں لگتا تھا۔

”آپ امداد حسین ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں...!“ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

میں نے رکشا والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے پوچھا۔ ”جی ہے؟“

”کون جی؟“ وہ اچھل سا پڑا۔

”آپ کا دوست جی کراچی سے آیا ہے اور آپ کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔“

اس نے مجھے مشکوک نظروں سے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ پھر سراسیمگی سے دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کوئی جی وی نہیں ہے۔“

میں نے چہرہ بڑھا کر دروازے میں پھنسا دیا۔ اس لیے وہ بند نہ ہو سکا۔ میں نے اپنا بیت سے کہا۔ ”امداد بھائی! گھبراہٹے نہیں! میں جی کا دوست سکندر ہوں۔ کراچی سے آیا ہوں۔ اس کے بھائی ظفر نے مجھے آپ کا پتہ دیا ہے۔“

”سکندر!“ وہ حیرت سے بولا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار دبا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس نے میری گرفتاری کی خبر پڑھ لی ہو گی۔ اس سے اسے یقین نہیں آ رہا ہو گا کہ میں سکندر ہی ہوں۔ میں نے دروازے پر سے آواز لگائی۔ ”جی... جی... جی...“

دوسرے ہی لمحے جی اندر سے نکل آیا۔ اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو... پھر فرط مسرت سے لپٹ گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کے گھمٹا ہوا اندر لے گیا۔ امداد حسین کے چہرے بچے بھی کمرے میں آگئے تھے۔ برابر والے کمرے سے بہت سی آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ جی خوشی سے پھولا نہیں سا رہا تھا۔ اس کا حال عجب ہو رہا تھا۔ ”سکندر بھائی! کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟“ وہ ہانپ کر بولا۔

”خواب تم نہیں بلکہ میں دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ پھر میں نے امداد حسین کی موجودگی میں ہی تمام کہانی سنادی۔

”میری کہانی سن کر جی بولا۔ ”سکندر بھائی! یہ تو معجزہ ہو گیا۔“

”اس معجزے کو پورے چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ یہ معجزہ ہو یا کسی غلط فہمی کا نتیجہ...“

حالات میرے حق میں ہی جا رہے ہیں۔“

”میرا خیال ہے آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔“ امداد حسین نے کہا۔ ”جس شخص نے آپ کو غلط فہمی میں رہائی دلوائی ہے، وہ غلط فہمی دور ہونے پر بھی اپنی بات کا بھرم رکھے گا۔ اب آپ دونوں بے فکر ہو جائیں۔ جی کے پریشانی کے دن بھی آج سے ختم ہو گئے۔“

”چاقو سے ایک نئے آدمی پر حملہ کر رہے ہو۔ شرم نہیں آتی۔“ فشی جی طعنہ زنی پر اتر آئے۔

جی نے چاقو میرے ہاتھ میں تھما دیا اور حریف کو لٹکانے لگا۔ ”آؤ میں خالی ہاتھوں سے بھی تمہاری پڈیوں کا سرمہ بنا سکتا ہوں۔“

فشی جی کا ساتھی خوف زدہ ہو کر جی کو دیکھ رہا تھا۔ جی کے تیوروں نے اسے بوکھلادیا تھا۔ دونوں بد معاش در حقیقت ہمارے مقابلے کے نہیں تھے۔ میں اور جی مل کر ایسے دس بد معاشوں سے بیک وقت نمٹ سکتے تھے۔ جی نے اسے سکتے کے عالم میں کھڑے دیکھ کر فشی جی سے کہا۔ ”اپنے لے پلک فرزند سے کوکو آگے بڑھے۔ اب یہ دم دبا کر کیوں کھڑا ہے۔“

یہ جملہ جلتی پر تیل کا کام کر گیا۔ فشی جی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ نفرت اور غصے سے بولے۔ ”جانتے ہو ہم کس کے آدمی ہیں۔“

”یقیناً“ وہ بھی تم جیسا ہی کوئی سورا ہو گا۔“ جی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”اگر وہ ذرا بھی عقل مند ہو تا تو تم جیسے نمک حراموں کو کبھی نہ پالتا۔ تم سے تو اس کے کتے بہتر ہوں گے۔“

”کیا سکتے ہو۔“ فشی جی نے لال پیلے ہو کر زمین پر پیر چٹا۔ ”ہم سینٹھ فٹرو کے آدمی ہیں۔“

”یہ کون گدھا ہے؟“ جی نے امداد حسین کی طرف رخ کر کے پوچھا۔

”تم نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔ وہ تم جیسوں کو گدھا بنا کر رینگنے پر مجبور کر سکتا ہے۔“

فشی جی کی حالت کی حالت غیر ہونے لگی۔

”جانتے ہو یہ کون ہیں؟“ جی نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”آپ ملٹری انٹیلی جینس میں کیپٹن ہیں۔ چھاؤنی میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ امداد حسین کے کلاس فیلو ہیں کو تو یہ ابھی تمہارے سینٹھ کو اور تم سب کو گدھا بنا کر کسی سرکاری اصطبل میں بھجوا دیں۔“

جی نے یہ بات کچھ ایسے لیے میں اور اس انداز سے کہی تھی کہ فشی جی کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اس کی بات کو بچ ہی سمجھتے تھے۔ یکایک وہ میری طرف پلٹ کے دونوں ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانے لگے۔ ”صاحب! ہمیں معاف کر دیں بھول ہو گئی ہم سے۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔ معاف کر دیا لیکن تم لوگ فوراً میری نظروں کے سامنے سے دفعہ ہو جاؤ۔۔۔ اور سنو!“ میں نے کسی فوجی افسر جیسے تھکانے والے میں کہا۔ ”صبح چھاؤنی جانے سے پہلے ہم سینٹھ صاحب کے پاس آ رہے ہیں۔ اس کی رقم ادا کر کے زیورات حلے جانیں گے اور کرایہ بھی ادا کر دیں گے۔ اس سے کتنا سارا حساب تیار کر کے رکھے۔“

فشی جی اور ان کا ساتھی اپنے زخمی ساتھی کو اٹھا کر لے گئے جو زمین پر پڑا ترپ رہا تھا۔

اس دوران میں وہاں خاصی بھیڑ ہو چکی تھی۔ رکشا والے اور دوسرے لوگ بڑی حیرت اور خوشی کے جذبات سے مغلوب ہو کر یہ سنسنی خیز تماشا دیکھ رہے تھے۔ دراصل وہ تینوں ہی ان سب کے لیے نا پسندیدہ افراد تھے۔ ان میں سے ایک نے ہم سے کہا۔ ”اچھا سبق دیا آپ لوگوں نے انہیں۔۔۔“

اب یہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔“

”اب غیریت کی کوئی بات نہ کرنا ورنہ ہمیں بہت دکھ ہو گا۔“

”خدا آپ کا بھلا کرے۔ آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

سامان اتارا جا رہا تھا کہ تین آدمی آگئے۔ ان کے چروں سے درشتی ٹپک رہی تھی اور آنکھیں سفاکی کا پتہ دیتی تھیں۔ ان ہی میں ایک بوڑھا بھی شامل تھا۔ اس نے امداد حسین سے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اتنا سامان؟ کیا کسی دکان پر ڈاکا مارا ہے؟“

”فشی جی!“ امداد حسین غصے سے کھول کر رہ گیا۔

”تین مہینے سے گھر کا کرایہ نہیں دیا۔ سود بھی پورا نہیں دے رہے ہو۔ راشن وغیرہ کے لیے اتنی رقم کہاں سے آگئی؟“ پھر اس نے مکروہ لہجے میں کہا۔ ”روپیہ کمانے کے ہزار ڈھنگ ہیں۔“

اس نے اپنے گھر کی عزت داؤ پر۔۔۔“

اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ جی نے بڑھ کر اس کے جڑے پر ایک ایسا زبردست مکا رسید کیا کہ وہ قلابازی کھا کر چاروں شانے چت گرا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بننے لگا تھا۔ اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر دوسرا آدمی دانت پیٹتا ہوا جی کی طرف پلکا۔ وہ جیسے ہی میرے قریب سے گزرا، میں نے اسے سرعت سے اڑنگا مارا۔ وہ جی پر جھپٹنا چاہ رہا تھا مگر اڑنگا لگنے سے اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور دھڑام سے منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے اٹھنے کی مہلت نہیں دی بلکہ آگے بڑھ کر اس کی پیلیوں میں اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ درد کی شدت سے بلبلاتا تھا۔

اس دوران میں زخمی ساتھی اٹھ بیٹھا۔ ہاتھوں سے نچکنے والے خون نے اس کا گریبان تر کر دیا تھا۔ اپنا خون دیکھ کر اس کی آنکھیں میں بھی خون اتر آیا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جی پر حملہ کرنے کے لیے غراتا ہوا آگے بڑھا مگر چند قدم چل کر ٹھک گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کی جھلک دکھائی دی۔ کیونکہ جی نے پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا تھا۔ اس کا پھل ہلکی روشنی میں بھی چمک رہا تھا۔ ”ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے، کیونکہ؟“ جی نے دانت پیس کر کہا۔

اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو دیکھ کر فشی جی کی بھی گھمگی بندھ گئی۔ ”یہ... یہ کیا ہے؟“ وہ ہکلائے۔ ”بند کرو یہ لٹڑے بازی۔“

جی نے انہیں ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دوسروں کی بہنوں کو اپنی ماں بہنوں کی طرح کیوں سمجھتا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”نہیں، جی نہیں۔“ امداد حسین نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔ ”ان سے مت الجھو۔ یہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔“

”میں اس کی زبان کاٹ کر پھینک دوں گا تاکہ یہ آئندہ کسی شریف گھر کی بو بیٹیوں کے بارے میں کوئی نازیبا تبصرہ نہ کر سکے۔“ جی آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

”انہیں ایک بار سبق مل گیا تو اسے ساری زندگی یاد رکھیں گے۔“ میں نے امداد حسین کو سمجھایا۔ ”دو دود ہاتھ ہو لینے دو ان بد معاشوں سے۔“

کے نیچے، جی اور ایک لڑکی بیٹھی تھی، وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ ملٹی چاندنی میں مجھے اس لڑکی کی صرف پشت ہی دکھائی دی۔ معلوم نہیں وہ کون تھی۔ میں دیر تک خاموش کھڑا نہیں دیکھتا رہا۔ جی نے تنہائی اور رات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا میں واپس چلا آیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور ان کے درمیان پاکیزہ جذبات پروان چڑھ رہے ہیں۔ جی ایک گھٹنے بعد واپس آکر لیٹا تو میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”کیا نام ہے، ہماری ہونے والی بھانجی کا؟“

جی پر جیسے گرا سناٹا چھا گیا، پھر اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”شمر!“
صبح پر تکلف ناشتے کے بعد جب ہم سیٹھ غزو کے ہاں پہنچے تو میں ایک لمحے کے لیے گھبرا سا گیا۔ یہ وہی سیٹھ تھا جس کی میں نے بس اسٹاپ پر جبب کائی تھی۔ اچھا ہوا کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ فشی نے پہلے ہی میرا تائیدانہ تعارف بحیثیت ملٹری انٹیلی جنس آفیسر کرا دیا تھا لہذا سیٹھ کی حالت ویسے ہی خراب ہو رہی تھی۔ اس نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی پھر زیورات اور کرائے کی رسیدیں ہمارے حوالے کر دیں۔ میں نے زیورات کی رقم ادا کی اور جب سود ادا کرنے لگا تو اس نے سود لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے ایک سال کا کرایہ ایڈوانس ادا کیا اور اس کی رسید لے کر امداد حسین کو دے دی۔

گھر واپس آکر جی نے اپنا بیگ اٹھایا تو میں نے اسے بے حد اداس محسوس کیا۔ میں اس کی اداسی کی وجہ سمجھ رہا تھا، کیونکہ میں خود بھی تو محبت سے آشنا ہو چکا تھا۔ میرے دل کے نرم گوشوں میں بھی تو کسی کی یاد چٹکیاں لینے لگی تھی۔ میں نے امداد حسین سے کہا۔ ”تمہاری بہنیں میری بہنوں کی طرح ہیں۔ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ کیا میں بھائی بن کر ان کے سروں پر ہاتھ رکھ سکتا ہوں؟“
”کیوں نہیں۔“ امداد حسین خوش ہو کر بولا اور اپنی بہنوں کو پکارنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد امداد حسین کی تینوں بہنیں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے... وہ لجائی ہوئی کھڑی تھیں۔ ان کی تھر تھرائی پلکیں اوپر اٹھیں تو وہ کن آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگتیں۔ وہ زیادہ خوبصورت تو نہیں تھیں لیکن ان کے چہروں سے پتہ چلتا تھا کہ سونے جیسے دلوں کی مالک ہیں۔ میں ان تینوں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ ان میں شمر کون ہے؟ پھر شمر کو پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہوئی۔ اس کا چہرہ جیج جیج کر اپنی شناخت کر رہا تھا۔ شمر وہی تھی جس کے چہرے پر بلا کا کرب اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ جی سے جدائی کے احساس نے اسے غمگین کر دیا تھا۔ اس کے دل کا درد اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔ میں نے پہلے شمر کی دونوں بہنوں کے سروں پر محبت سے ہاتھ رکھا۔ پھر شمر کے روبرو جا کر کھڑا ہوا اور اس کے سر پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے وہ مجھ سے زیادہ عزیز رہی ہو۔ میں نے بڑی محبت اور اپنائیت سے ’آہستہ سے پکارا۔“
”شمر!“

اس نے چونک کر سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں شدید حیرانی تھی۔ پھر وہ اداس ہو گئی۔ میں اس کی حالت دیکھ کر تڑپ سا گیا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ محبت کے ماروں کا کیا حال

تمام سامان اتارا جا چکا تھا۔ میں نے رکشا والوں کو دگنا کرایہ ادا کر کے رخصت کر دیا۔ میں اندر گیا تو امداد حسین نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ واقعی صبح جا کر زیورات چھڑا لائیں گے؟ اور کرایہ بھی ادا کر دیں گے؟“
”ہاں! کیوں؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”مجھے زیادہ زیر بار نہ کریں۔ یہ احسان کیا کم ہے؟ آپ دو تین مہینے کا راشن لے آئے ہیں اور...“

”دیکھو دوست!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ میرا اپنا گھر ہے۔ میں اسے اپنا ہی گھر سمجھ رہا ہوں کیونکہ اس دنیا میں میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ اب آپ میرے معاملے میں ایک لفظ بھی نہیں بولیں گے، اور ہاں جلدی سے کھانا تیار کر دلائیں بہت بھوک لگ رہی ہے۔“

کوئی دو گھنٹے بعد دسترخوان بچھا تو اس پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ امداد حسین کی بیوی اور جواں سال بہنوں نے مل کر تھوڑے سے وقت میں بہت سے خوش ذائقہ پکوان تیار کر دیئے تھے۔ ہر پکوان بے حد لذیذ اور خوش ذائقہ تھا۔ مجھے یوں بھی ہر ذرا اچھی لگ رہی تھی کیونکہ برسوں بعد گھر کا کھانا نصیب ہوا تھا۔ امداد حسین کے تمام بچے ہمارے ساتھ کھانے میں شریک تھے۔ وہ نذیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ امداد حسین نے انہیں ڈانٹا اور منع کیا لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ انہیں نہ روکے، بچے ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ بچوں نے نجانے کب سے اچھا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس لیے ان کا یہ نذید اپنی فطری تھا۔

میں نے جس سیٹھ کی جیب کائی تھی، اس کے بٹے میں بارہ ہزار دس روپے تھے۔ اسی میں سے دو ہزار گھر کے سودا سلف پر خرچ ہوئے تھے۔ ایک ہزار جی کو دینے کے بعد اب میرے پاس نو ہزار روپے باقی تھے۔ صبح اس میں سے پانچ چھ ہزار روپے مزید خرچ ہو سکتے تھے۔ تاہم میں رقم کے سلسلے میں بے حد مطمئن تھا۔

کھانے سے فراغت پا کر ہم تینوں گھر سے باہر بیٹھے، رات دو بجے تک باتیں کرتے رہے۔ امداد حسین کو نیند آرہی تھی۔ جی کے لیے پستر لگا دیا گیا تھا۔ امداد حسین چلا گیا تو میں اور جی اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، زیرو کال بلب بھی بجھا دیا گیا کیونکہ روشنی میں مجھے نیند نہیں آتی... لیکن تاریکی کے باوجود آج رات نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میرے تصور میں جینم کا چہرہ اور سراپا بار بار ابھرتا... اس کا خیال مجھے سونے نہیں دے رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ نجانے کہاں اور کس حال میں ہو گی؟ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہو گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا گیا ہو؟ یہ سوچ کر میرا جہم کانپ کانپ گیا۔

نصف گھنٹے بعد میرے کمرے کا وہ دروازہ جو بیرونی رخ کھلتا تھا، آہستہ سے کھلا تو باہر پھیلی ہوئی چاندنی میں مجھے جی نظر آیا۔ وہ دبے پاؤں باہر جا رہا تھا۔ چوروں کے انداز سے... اس نے باہر نکل کر دروازہ بھیڑ دیا تو کمرے میں پھر اندھیرا چھا گیا۔ جی کہاں گیا؟ میں نے سوچا۔ میں کچھ کچھ سمجھنے لگا تو میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھ دیر بعد میں بھی کمرے سے نکل آیا۔ باہر درختوں

تھے کہ وہاں ختم ہے یا نہیں... بھر ختم کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر پولیس کو اطلاع دینا چاہتے تھے۔ ختم قتل کی یقینی گواہ تھی۔ جی نے محی الدین کی کار کو شاہ جہاں کے بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا تھا اس لیے وہ بھی بطور گواہ پیش ہو سکتا تھا۔

وہ کشادہ بنگلا ایک سنسان گلی میں واقع تھا۔ احاطے میں تین چار کاریں کھڑی تھیں، ان میں محی الدین کی کار بھی تھی۔ کئی کمرے روشن تھے۔ برآمدے میں بھی روشنی نظر آرہی تھی۔ بنگلے کے عقبی حصے میں جانے کے لیے ہمیں ساتھ والے بنگلے کے لان اور بھاڑیوں کو روندنا پڑا۔ عقبی حصے میں پہنچے تو اسے تاریک پایا مگر وہ زیادہ دیر تک تاریک نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ اس وقت چاند بادلوں میں چھپا ہوا تھا اور وہ چند لمحوں میں بادلوں کی اوٹ سے نکلنے ہی والا تھا۔ ہمیں ایک کمرے کی کھڑکی کھلی نظر آئی۔ اس کی روشنی باہر آرہی تھی۔ اب دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہذا میں اور جی کھڑکی کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔

قدرت ہم پر مریبان تھی۔ اسی لمحے ختم کمرے میں داخل ہوتی نظر آئی۔ وہ تنہا اندر آئی تھی لیکن اس کے فوراً ہی بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت بھی کمرے میں آگئی۔ میں حیرت سے ختم کو دیکھتا رہ گیا کیونکہ وہ اس وقت عروسی لباس میں تھی۔ سولہ سگار کیے ہوئے وہ ایک ایسی لڑکی لگ رہی تھی، چند لمحے بعد جس کی بارات آنے والی ہو۔ سنگھار نے اسے اس قدر پرکشش بنا دیا تھا کہ میں پہلے تو اس کے حسن و جمال میں ہی کھو کر رہ گیا... پھر اچانک ہی مجھے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ محی الدین نے اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے واقعی ایک نادر ہیرا ڈھونڈ نکالا تھا۔ دفعتاً عورت کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں چونک پڑا۔ وہ ختم سے کہہ رہی تھی...

”اگر تم اپنے باپ کو خوش و خرم اور زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو بڑے صاحب کا کتنا مان لو۔ آج تمہیں نوازش صاحب کے ہاں جانا ہے۔ صبح تم واپس آؤ گی تو تمہارے ہاتھ میں دو کروڑ کے ٹھیکے کا...“

میرے دل میں نفرت کی ایک شدید لہر اٹھی جس نے ختم کا حسین سراپا اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آہ یہ لڑکی کس قدر کمزور لگی۔ میں نے بڑے کرب سے سوچا۔ آخر اس نے حالات کے سامنے سر تسلیم خم کر ہی دیا۔ اس سے پہلے کہ میرے ذہن میں منفی خیالوں کا زہر پوری طرح پھیلنا ختم کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”کوئی خیرت مند باپ اپنی بیٹی کو بے آبرو دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے تو ایسی بیٹی کا مرجانا خوشی کا باعث ہو سکتا ہے۔ تم میرے باپ کو نہیں جانتیں۔ وہ بہت غیرت مند ہے اور میری عزت پر ہزار بار اپنی جان قربان کر سکتا ہے۔“ اس کے لہجے میں زہری زہر بھرا ہوا تھا۔

عورت نے ایک طویل سانس لی۔ ”ہاں بیٹی! محبت کرنے والے باپ ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن تم نے اس کا کتنا نہ مانا تو وہ تمہارے باپ کو مروا دے گا۔“

”وہ چیز لائی ہو؟“ ختم نے سرگوشی کی۔

عورت کے چہرے پر تذبذب کے آثار پیدا ہو گئے۔ چند لمحے وہ بے بسی سے ختم کی طرف

ہے۔ میں نے شمس کا نازک سا ہاتھ پکڑ کر جب سے ایک ہزار روپے نکالے اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ”تم تینوں بہنوں کے لیے... ایک بھائی کی طرف سے۔“

امداد حسین کے گھروالوں نے ہم دونوں کو جس محبت، گرم جوشی اور جذبے سے رخصت کیا اس سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ہمارا ان سے خون کا رشتہ نانا ہے۔

ہم بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے تو خاموش تھے۔ ایک عجیب سے سرور میں ڈوبے ہوئے۔ جس کی گہرائی کی کوئی حد نہیں تھی۔

کراچی پہنچ کر میں نے تازہ اخبار خریدے۔ اخبار میں محی الدین کی ڈکیتی کے گرفتار شدگان کے بارے میں پولیس کی جانب سے یہ تردید چھپی تھی کہ گزشتہ روز سکندر نامی جس شخص کو گرفتار کیا تھا، وہ مجرم نہیں بلکہ محی الدین کے ملازم کا دوست تھا جو سروٹ کوارٹر میں مقیم تھا۔ وہ گولی کی آواز سن کر کمرے میں پہنچا تو اسے ہی شہسے میں گرفتار کر لیا گیا۔ اسے کل ہی رہا کر دیا ہے۔ جی نامی شخص کو جسے مفور قرار دیا جا چکا تھا، وہ بھی مجرم نہیں ہے۔ پولیس اصل مجرمان کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔

بے حد مضحکہ خیز اور پولیس کو نا اہل ثابت کرنے والی تردید تھی۔ میں جی کو اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے اپنے گھروالوں کو تسلی دے کر چلا آیا کہ اب کوئی خوف و خدشہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہم دونوں اس بنگلے کے بارے میں سوچ رہے تھے جو بہادر آباد میں تھا اور جہاں ختم قید تھی۔ کچھ دیر بعد ہاتھ روم جانے کے ارادے سے اٹھا تو اپنی جیب سے پیسے اور نوٹ بک نکال کر میز پر رکھ دی۔ جی نے پوچھا۔ ”کیا اس نوٹ بک میں آپ کے دوستوں کے ٹیلی فون نمبر ہیں؟“

”یہ نوٹ بک میری نہیں بلکہ شاہ جہاں کی ہے۔“ میں نے نوٹ بک جی کی طرف اچھال دی اور غسل خانے میں چلا گیا۔

اچانک جی کی طویل چکار سنائی دی۔ ”سکندر بھائی! بہادر آباد کا پتہ مل گیا۔“

شاہ جہاں کی نوٹ بک میں بہادر آباد کے ایک گھر کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں پتہ پڑھنے لگا۔

”سکندر بھائی! وہاں چل کر کھوج لگاتے ہیں۔ ممکن ہے، ختم اسی گھر میں ہو۔ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ آج رات ہی چلتے ہیں۔“ میں نے تائید کی۔

”محی الدین کے آدمی ہمیں پہچانتے ہیں۔“ جی فکر مند ہو گیا۔ ”اگر انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔“

”ان کے فرشتے بھی نہیں پہچان سکیں گے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ہم اپنے دوست عقل کے ہاں چلتے ہیں۔“

رات گیارہ بجے ہم اپنے دوست کے ہاں سے نکلے تو فقیروں کے گھس میں تھے۔ ہماری لمبی لمبی سفید داڑھیاں تھیں۔ بہادر آباد کا وہ گھر جی کا بھائی پہلے ہی جا کر دیکھ آیا تھا۔ اس نے ہمیں محل وقوع اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ لہذا وہاں پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ہم جا کر یہ دیکھنا چاہتے

کوشش کروں گا کہ نوازش بیگ ختم کو نہ لے جاسکے۔ جی نے اثبات میں سر ہلایا اور دبے قدموں وہاں سے چلا گیا۔

میں دل میں ڈر رہا تھا کہ ختم زہر نہ کھالے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ عورت چند لمحوں کے لیے کمرے سے چلی جائے تو ختم کو اپنی موجودگی کا احساس دلا دوں۔ عورت نے زہر لا کر دیا تھا اور میں اس کے جذبات سے بھی آگاہ تھا۔ لیکن وہ حالات سے شکست خوردہ عورت تھی اس لیے میں اس پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ممکن ہے، وہ مجھے دیکھتے ہی چیخ پڑے اور اس کی آواز سن کر جنگلے میں موجود لوگ متوجہ ہو جائیں۔ میں ان حالات میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا... لیکن خدا نے میری سن لی۔ عورت کسی کام سے چلی گئی۔ دروازہ بند ہوتے ہی اس نے زہر کی پڑیا نکالی۔ اسی لمحے میں نے دھیمی آواز میں اسے پکارا۔ ”ختم...!“

ختم کا ہاتھ کانپ گیا اور پڑیا اس کے ہاتھ سے فرش پر گر گئی۔ کانڈ میں لپٹا ہوا سفید پاؤڈر بکھر گیا۔ وہ کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کا منہ حیرت اور بے یقینی سے کھل گیا۔ میری آواز سے اس کے ذہن میں جو گمان پیدا ہوا تھا، میری صورت دیکھ کر شاید فوراً ہی دھل گیا تھا اور اب اس کی آنکھوں اور چہرے پر دہشت کی تحریر نمایاں تھی۔ ممکن تھا کہ وہ خوف کی زیادتی سے چیخ پڑتی اس لئے میں نے جلد ہی سے کہا۔ ”ختم۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں سکندر ہوں۔“

”سکندر...“ اس نے بے یقینی سے دہرایا پھر لپک کر کھڑکی کے قریب آگئی۔ ”سکندر صاحب۔“ اس کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔ ”میں نے تو سنا تھا کہ آپ جیل میں ہیں، پھر یہاں کیسے آ پہنچے؟“

”میں سکندر ہوں۔“ میں نے اس کا خوف اور ماحول کی سنگینی دور کرنے کے لیے شکستہ لہجے میں کہا۔ ”اور میری فتوحات کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔“

وہ بے چینی سے انگلیاں مروڑنے لگی۔ ”اچھا ہوا آپ آگئے ورنہ میں نے تو زہر کھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“

”زہر کھائیں تمہارے دشمن۔“ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ جی پولیس کو لینے گیا ہوا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”پولیس محی الدین کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ”وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ بہت دولت مند ہے۔“

”جس طرح ہر لڑکی بے بس ہو کر دوسروں کے ہاتھوں کھلونا نہیں بنتی اسی طرح پولیس کا ہر افسر برائے فروخت نہیں ہوتا۔“

اچانک دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ختم نے بدحواس ہو کر دروازے کی طرف دیکھا پھر اس نے جلدی سے کھڑکی کے فریم پر ہاتھ رکھ دیے۔ شاید وہ کھڑکی سے کود کر باہر آنا چاہتی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ”نہیں ایسا مت کرو۔ اس طرح ہم زیادہ دور نہیں جا سکیں

دیکھتی رہی پھر اس نے بلاؤز میں ہاتھ ڈال کر ایک پڑیا نکالی اور ختم کی طرف بڑھادی جسے ختم نے جھپٹ کر اپنے لباس میں چھپا لیا۔ ”کیا کروں بیٹی! میں ایک غریب اور مجبور ملازمہ ہوں۔ میں اس سے زیادہ تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔“ عورت کی آواز بھرا گئی۔

”تم نہیں جانتیں کہ مجھ پر کتنا بڑا احسان کر رہی ہو۔“ یہ کہتے ہوئے ختم بے اختیار اس عورت سے لپٹ کر سسک پڑی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اٹھ پڑا۔ ”عزت کی موت“ میرے لیے شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔“

میرے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ اس معمولی سی پڑیا میں درحقیقت ختم کی موت چھپی بیٹھی ہے۔ وہ زہر کی پڑیا ہے۔ میرے ذہن سے تمام شکوک و شبہات دھل گئے اور ختم مجھے اس قطرہ ختم کی طرح پاکیزہ اور شفاف نظر آنے لگی جو گلاب کی نازک سی پتی پر ہوا کے پہلے شریر جھونکے کی گدگدی سے لرز اٹھا ہو۔ وہ محی الدین کے ہاتھوں کھلونا بننے کی بجائے عزت کی موت قبول کر رہی تھی۔

عورت نے اسے دلاس دیا اور کہا۔ ”چپ ہو جاؤ بیٹی! رونے سے تقدیریں نہیں بدلا کرےں۔ تم نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ میرے لیے ازیتناک سہی لیکن قابل رشک ہے۔ کاش! چھ سال پہلے میں نے بھی یہی فیصلہ کیا ہوتا۔“ اس کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چھپنے لگی۔ ”اگر میں نے بھی تمہاری طرح زہر کھانے کا فیصلہ کر لیا ہوتا تو آج مجھے اپنا جسم غلامت کا ایک ایسا ڈھیر محسوس نہ ہوتا جس پر ہوس کی کھیاں بھینھنا کرتی ہیں۔“

اچانک دروازے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری۔ عورت سم کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں بھی ادھر ہی متوجہ ہو گیا... اور دروازے سے اندر آنے والی شخصیت کو دیکھ کر میری رگوں میں خون کی بجائے آتشیں لاوا دوڑنے لگا۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں لپک کر اس کے سامنے جاؤں اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن مروڑ ڈالوں۔ ممکن تھا کہ میں غصے سے اندھا ہو کر ایسا بھی کر گزرتا لیکن اسی لمحے محی الدین کی گرج دار آواز نے مجھے ہوش و حواس کی وادی میں بخ دیا۔ ”تمہارا ڈراما ابھی ختم نہیں ہوا۔“ وہ غصے سے گرج رہا تھا۔

ختم نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جن میں آنسوؤں کی دھند کے پیچھے نفرت کا سلاطم سکندر موہیں مار رہا تھا۔

”سلطان...“ محی الدین نے تھکمانے لہجے میں کہا۔ ”اس خنجر کی دھار ماند پڑ گئی ہے۔“ اس نے ختم کی طرف انگلی اٹھائی۔ ”اسے دوبارہ تیار کراؤ۔ دو کروڑ کے ٹیکے کا معاملہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ نوازش بیگ پہلی ہی نگاہ میں گھائل ہو جائے۔ جلدی کرو بہت دیر ہو رہی ہے۔“

عورت ختم کا میک اپ درست کرنے لگی اور محی الدین واپس چلا گیا۔

میں نے جی کی طرف دیکھا۔ وہ دوسری جانب دیوار سے چپکا کھڑا تھا اور اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں، جیسے میرے اردو کے محض ایک اشارے کا خطرہ ہو۔ میں نے سر کے اشارے سے اسے قریب بلایا اور سرگوشی میں کہا کہ وہ جلدی سے جاکر پولیس کو لے آئے۔ اس دوران میں

اس کا جائزہ لینے کی مہلت نہیں دی اور میں خیالوں میں باغیچہ پاؤں مارنے کی کوشش کرتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

میں کب تک بے ہوش رہا اور میرے بے ہوشی کے دوران کیا کچھ ہوا، اس کے بارے میں ظاہر ہے، میں بے خبری رہا ہوں گا... البتہ جب میری چشم ہوش دہوئی تو میں ایک بستر پر دراز تھا۔ مجھے اپنی کھوپڑی میں درد کا بار بار پھیلنا اور سکڑنا ہوا ایک گولہ سا محسوس ہونے لگا۔ میں نے پلکیں جھپکائیں اور ماحول سے مانوس ہونے کی کوشش کرتا رہا حتیٰ کہ مجھے سب سے پہلے خشم، پھر جی اور ان کے ساتھ چاچی کے خدوخال نظر آنے لگے۔ تب مجھے اپنے سر پر کس کر بندھی ہوئی پٹی کا احساس ہوا تو مجھے یاد آگیا کہ مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ پھر میری نگاہ ایک نئے چہرے پر جم گئی۔ یہ چاچی کے شوہر کا چہرہ تھا۔ میں نے چاچی کے ہاں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ اس لیے اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ ان چہروں میں ایک اجنبی چہرہ بھی تھا۔ جوان اور پرکشش... کسی رومانی ٹاول کے ہیرو کی طرح دل میں اتر جانے والا... سب چہرے کھلی کتابوں کی طرح میرے سامنے تھے اور سب پر ایک ہی تحریر تھی... خوشی اور طمانیت کی تحریر۔

سب سے زیادہ خوشی خشم کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں محبت کا سمندر لہریں لے رہا تھا۔ اس کے رخسار گلابی تھے اور ہونٹوں پر حیا آلود مسکراہٹ چل رہی تھی۔ اس وقت وہ اپنے سادہ سے گھریلو لباس میں تھی۔ اس کے جسم پر عروسی لباس نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اسے خواب میں دِلن بنے دیکھا ہو اور اب وہ اپنے حقیقی روپ میں میرے سامنے کھڑی ہو۔ میں اس کی طرف محویت سے دیکھتا رہا اور اس دوران میں اپنا درد بھی بھول گیا۔ میں اٹھ بیٹھا اور جی سے پوچھا۔ ”کیا ہوا تھا جی؟“

”دونوں مگر مجھ پولیس کے جال میں پھنس گئے ہیں۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”تمہارا مطلب ہے محی الدین اور نوازش بیگ؟“

”ہاں... اور ان کے ساتھ کئی چھوٹی مچھلیاں بھی پھنس گئی ہیں۔“

”مگر جی...“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”پولیس نے محی الدین اور وہاں موجود تمام لوگوں کو کیسے گرفتار کر لیا جبکہ اس کا دعویٰ تھا کہ تھانیدار اس کی مٹھی میں ہے اور پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

”اس نے غلط نہیں کہا تھا... لیکن جانتے ہو“ میں سیدھا سی آئی اے کے دفتر جا پہنچا تھا۔ وہاں کے ڈی ایس پی قریشی کی بہت دھوم مچی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں اُسے بھی آزما لیا جائے۔ قریشی صاحب نے میری بات بڑی توجہ سے سنی اور پھر مجھے اپنی موٹر سائیکل پر لے کر تھانے پہنچے۔ نتیجتاً تھانے دار کو سر پر پاؤں رکھ کر محی الدین کے بیٹلے کی طرف بھاگنا پڑ گیا۔ قریشی صاحب نے صاف کہہ دیا کہ وہ صرف پرانے تعلق کی بنا پر ذاتی طور پر چھاپہ نہیں مار رہے ہیں لہذا تھانیدار کو چاہیے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے۔ انہوں نے یہی نہیں کیا بلکہ پولیس فورس کے ساتھ خود بھی بیٹلے پر جا پہنچے تھے۔“

گئے، پھر تمہارا یہاں سے برآمد ہونا، ایک اہم شہادت ثابت ہو گا۔ بے فکر ہو کر دروازہ کھولو اور دیکھو کون ہے۔ میں یہاں موجود ہوں۔ پولیس کی آمد سے پہلے اگر کوئی گزیر ہوئی تو اسے سنبھال لوں گا۔ حوصلے سے کام لو، جی بس آتا ہی ہو گا۔“

وہ چند لمحے تو میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب اس کی آنکھوں اور چہرے پر سکون بالکورے لے رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے میں خود کار قفل لگا ہوا تھا جو دروازہ زور سے بند ہونے کی صورت میں خود بخود لاک ہو جاتا تھا۔ سلطانہ نے جاتے وقت شاید اسے زور سے بند کر دیا تھا۔ خشم دروازے کے سامنے پہنچی اور ہاتھ بڑھا کر لاک کا ٹیڑھ دباتے ہوئے کواڑ کھولی دیا۔ آہستہ والی سلطانہ تھی۔ وہی عورت جو کچھ دیر قفل کسی کام سے چلی گئی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی گہری نظروں سے خشم کی طرف دیکھا۔

”کہیں تم نے...؟“ اس نے جملہ ادھر اسی چھوڑ دیا۔

”نہیں۔“ خشم نے فرش سے پڑا اٹھائی اور سفید پاؤڈر سیٹ کر پڑیا کو ٹھیک سے باندھ کر لباس میں چھپاتے ہوئے کہا۔ ”اسے تو میں نوازش بیگ کی خواب گاہ میں کھاؤں گی تاکہ وہ بھی میرے ساتھ ہی کیفر کردار کو پہنچ جائے۔“

”چلو دیر ہو رہی ہے۔ وہ تمہارے لیے بہت بے چین ہو رہا ہے۔ کئی بار فون کر چکا ہے۔“

خشم، سلطانہ کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے سے نکلنے وقت اس نے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ چند لمحے اس کی نگاہیں کھڑکی پر جمی رہیں پھر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں کھڑکی سے ہٹ گیا اور گھوم کر احاطے میں داخل ہوا تو اسے سنسان پایا۔ وہاں تین کاریں کھڑی تھیں۔ میں نے جیب سے چاقو نکال لیا۔ جی ابھی تک نہیں آیا تھا جبکہ خشم یہاں سے روانہ ہونے والی تھی۔ میں نے سوچا کہ محی الدین کی کار کا ٹائر ناکارہ کو دینا چاہیے تاکہ اسے جانے میں کچھ دیر ہو جائے۔ اس دوران میں پولیس یہاں پہنچ ہی جائے گی۔ لیکن محی الدین کون سی کار استعمال کرتا ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ میں نے تینوں کاروں پر طبع آزمائی کا ارادہ کر لیا اور چاقو لے کر سرخ ٹیٹا کرولا کے ٹائر کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ میں نے چاقو کی نوک ٹائر پر رکھی اور اسے آہستہ آہستہ دبائے لگا۔

اسی لمحے ایک زبردست دھماکا ہوا۔ پہلے تو ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ ٹائر برست ہو گیا ہے اور یہ خوفناک آواز یقیناً دور دور تک پھیل گئی ہو گی لیکن اگلی ہی ساعت میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور میں نے بند پوٹوں کی اوٹ سے سینکڑوں سورج اور کروڑوں ننھے ننھے ستارے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے دیکھے تو یہ احساس ہوا کہ دھماکا باہر نہیں بلکہ میری کھوپڑی کے اندر ہوا ہے۔ یقیناً کسی نے کوئی وزنی شے میری کھوپڑی پر آزمائی تھی لیکن یہ سب کچھ کب اور کس طرح ہوا، ذہن پر چھانے والی بے ہوشی کی دھند نے مجھے

لگیں جیسے کوئی بار بار اس پر ہتھوڑے کی چونیں لگا رہا ہو۔ ہر چیز نگاہوں کے سامنے چکراتی محسوس ہونے لگی۔ گویا بھونچال آیا ہو۔ اس صدمے نے میری نظروں میں دنیا ایک بار پھر اندھیر کر دی۔ چاچی کی آواز آہستہ آہستہ دور سے آتی ہوئی بالکل ہی معدوم ہو گئی اور میں دوبارہ بے ہوشی میں ڈوب گیا۔

اگلے روز میں اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا، خود کو اپنے گھر میں نہیں، اس بھری پری دنیا میں بھی تھا محسوس کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں بے بسی کی نمی تیر آئی۔ دل کے نماں خانوں میں برسوں سے چھپے ہوئے زخموں سے ایک بار پھر لو رسنے لگا۔ یہ لو مجھے پینا تھا اور میں اسے پی رہا تھا... چپکے چپکے اور خاموشی کے ساتھ اسے واپس اپنے گھائل دل میں اتار رہا تھا۔ میں شبنم کو کوئی الزام نہیں دے سکتا تھا۔ غلطی مجھی سے ہوئی تھی۔ میں نے بلا سوچے سمجھے اس لڑکی کو اپنی دھڑکتوں میں بسالیا تھا مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ جاگتی آنکھوں سے نظر آنے والے خواب، درحقیقت سراب ہوتے ہیں۔ میں ان سراپوں سے دھوکا کھا گیا۔ میں دنیا میں تھا تھا اور یہ تھائی میرا مقدر تھی۔ مجھے تعامی رہنا تھا۔ اکیلے پن کا یہ احساس نیا تو نہیں تھا۔ نہ میرے ماں باپ تھے اور نہ ہی کوئی بہن یا بھائی تھا۔ میں تو بس منہ بولے رشتوں کے ساتھ وقت کے زنداں میں جی رہا تھا۔ والدین، میرے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے اور اب تو یادداشت کی تھوں سے ان کے خدوخال بھی ابھر کر شعور کے پردے پر نمودار نہیں ہوتے تھے۔

میں نے بے بسی کے یہ آنسو پی لے اور چھت پر نظریں گاڑ دیں، جہاں مکڑیوں نے ان گنت جالے بن رکھے تھے۔

اچانک دروازے پر دستک ہونے لگی۔

میں آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

فورا ہی دوبارہ دستک ہوئی۔ اس بار دروازے کو بڑی شدت سے بجایا گیا تھا۔ کون ہو سکتا ہے؟ میں نے ناگواری سے سوچا اور پھر جیسے ہی دروازہ کھولا، لڑکھانا ہوا کئی قدم پیچھے ہٹ آیا۔ میرے سامنے نیلم کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے ایک پولیس انسپکٹر اور چند سپاہی کھڑے تھے۔ میرا جہم سینے میں بھیک گیا اور سینے میں دھڑکتا ہوا دل خاموش محسوس ہونے لگا جیسے اس کی حرکت بند ہو گئی ہو نیلم کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور وہ بے حد غضب ناک دکھائی دے رہی تھی۔



نیلم اور پولیس والوں کی آمد میرے لیے غیر متوقع ہی نہیں حیران کن بھی تھی کیونکہ میں کبھی بھولے سے بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہ لڑکی، مجھ سے اس طرح کھرا کر اپنے پیروں پر کھڑی بھی مار سکتی ہے۔ اس کی کھوپڑی بے حد خوشنما تھی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس میں بکس بھرا ہوا ہے۔ یا تو وہ عقل سے بالکل ہی پیدل تھی یا پھر غصے اور انتقام کے جذبے نے اسے اندھا کر دیا تھا کہ

میں نے ایک طویل سانس لی اور دونوں ہاتھوں سے دیکھتے ہوئے سر کو تھام لیا جو اب یوں گھومنے لگا تھا جیسے میں کسی بڑے سے جھوٹے میں بہت لمبی چینگ لے رہا ہوں۔ اس دوران میں مجھے اپنے گرد کھڑی ہستیوں کے ہونے بھی گردش کرتے محسوس ہونے لگے تھے اور ان کے رنگ برنگے ملبوسات، آپس میں گڈھ ہو کر دھنک کی صورت اختیار کر گئے تھے اور یہ دھنک میرے حواس پر چھائے جا رہی تھی۔ شاید چاچی کے شوہر نے محسوس کر لیا کہ مجھ پر بے ہوشی طاری ہونے والی ہے۔ وہ لپک کر میرے قریب آیا اور مجھے کندھوں سے تھام کر لٹا دیا۔ میرا سر نیلے کی زرباؤں اور گداز سے آشنا ہوا تو جیسے اچانک ہی تمام گردشیں ختم گئیں۔ ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے ہوئے رنگ منتشر ہو گئے... اور جب یہ رنگ اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے تو میں نے اس پیلے رنگ پر نظریں گاڑ دیں جو سب رنگوں پر حاوی تھا۔ پیلے رنگ کا یہ دوپٹہ شبنم کے حسین چہرے کے گرد کسی ہالے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس کے رخساروں کی سرخی میں کشمیر کے سیبوں جیسی آب و تاب پیدا ہو گئی۔

”صادق صاحب یہاں موجود ہیں۔“ نذرل کی آواز نے میری توجہ پر ضرب لگائی۔ ”یہ عدالتی اکھاڑے میں محی الدین سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔“

میں نے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ نذرل نے جس کا حوالہ دیا تھا۔ وہ چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”شکریہ دوست! ہم آپ کے اس احسان کو زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔“

”یہ احسان نہیں بلکہ میرا فرض تھا۔“ میں نے کن آنکھوں سے شبنم کی طرف دیکھتے ہوئے رسمی جملہ ادا کیا۔

”آپ کی بے لوث، بے غرض اور پر غلو ص محبت نے ہم سب کو جیت لیا ہے۔“ صادق نے ممنونیت سے کہا۔ ”چچا بھی کل ضمانت پر رہا ہو کر آجائیں گے۔“

”ابو میاں آپ کے چچا ہیں؟“ میں چونک پڑا۔

”جی ہاں۔“ اس نے کہا پھر پل بھر توقف کے بعد کسی خیال کے تحت اس کا چہرہ تھما اٹھا۔

میں راولپنڈی میں پریکٹس کرتا ہوں اور ابو القاسم کی فرم سے وابستہ ہوں۔“

ابو القاسم کی فرم کا نام میں نے بار بار سنا تھا اور اخباروں میں اس کمپنی کے وکلاء کے کئی ذہانت آمیز کارنامے بھی پڑھے تھے اس لیے یہ نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔

”میں پریشانی کے عالم میں تمہیں ان کے بارے میں کچھ نہ بتا سکی۔“ چاچی نے کہا۔ ”صادق جو ہیں یہ دراصل... اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور معنی خیز نظروں سے شبنم کی طرف دیکھا جو فورا ہی دروازے کی طرف چل دی۔ میں یہ سمجھا کہ شاید وہ چائے بنانے کے لیے جا رہی ہے لیکن چاچی کے آئندہ جملے نے مجھ پر ایسا اثر کیا جیسے کسی نے اچانک ہی میرے کانوں کے قریب بے شمار پٹائے پھوڑ دیے ہوں۔ ابو میاں کے ہونے والے داماد ہیں۔ اگلے ماہ شبنم سے ان کی شادی ہونے والی ہے۔ دونوں بچپن کے ساتھی ہیں اور ایک دوسرے کو بے پناہ...“

لیکن میں اب ایک لفظ بھی نہیں سن رہا تھا۔ میرے سر میں اچانک ہی شدید ٹیسس اٹھنے

خاموش کھڑے ہمارے ڈائناگ سن رہے ہیں اور انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ انسپکٹر کی طرف گھوم کر بولی۔ ”انسپکٹر! یہ شخص حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔ تم اس کی زبان کیوں نہیں کھینچ لیتے؟“

”اس لیے کہ پولیس عوام کے ساتھ ایسی کوئی حرکت نہیں کرتی۔“ میں نے نرمی سے سمجھایا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ پولیس والوں کی آمد اور دروازے پر کھڑے کھڑے میری ایک حینہ سے تکرار کی آوازیں، محلے والوں کے تجسس کو ہوا دے رہی ہیں۔ میں دروازے سے ہٹ گیا۔ ”آپ لوگ اندر آجائیں تاکہ اطمینان سے بات ہو سکے۔“

انسپکٹر نے قدم بڑھایا اور اندر آگیا۔ پھر نیلم آئی اور اس کے بعد پولیس کے سپاہی اندر آگئے۔ انسپکٹر نے اندر آتے ہی ہولسٹر سے پستول نکال کر مجھ پر تان لیا۔ ایک سپاہی نے اندر سے دروازے کی کندی چڑھا دی۔

”رقم نکالو۔“ انسپکٹر نے کراخت لیے میں کما۔

”کون سی رقم؟“ میں نے انجان بننے ہوئے حیرت ظاہر کی۔

”دہی چھ لاکھ جو تم نے اس لڑکی سے ہتھیلے ہیں۔“

”کیا اس نے میرے خلاف باقاعدہ رپٹ درج کرائی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”فی الحال تو ہم شرافت سے ہی معاملہ نمٹا دیتا چاہتے ہیں۔“ انسپکٹر بولا۔ ”لیکن... تمہیں

رپٹ وغیرہ لکھوانے کا اتنا ہی شوق ہے تو تھانے جا کر وہ بھی پورا کر دیں گے۔“

”اس سے باتوں میں مت الجھو، انسپکٹر۔“ نیلم بولی۔ ”یہ انتہائی مکار آدمی ہے۔“

اچانک انسپکٹر نے میرے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ غصے کی ایک چنگاری نے میرے دل میں جنم لیا اور شرارہ بن کر سر سے پاؤں تک تحلیل ہو گئی۔ میں نے براہ راست انسپکٹر کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کا اس طرح میرا گریبان تھام لینا ایک عجیب سی بات تھی۔ اس کے ساتھ چند سپاہی موجود تھے۔ جو آسانی سے یہ فریضہ سرانجام دے سکتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ انسپکٹر کو اپنی افسرانہ شان دکھانے کی عادت نہیں تھی۔ یا پھر وہ کوئی بہت ہی جتھ جھٹ قسم کا آدمی تھا۔

”میرے گریبان سے ہاتھ ہٹاؤ، انسپکٹر۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس قابل ذکر صرف یہی ایک چیز ہے۔ جسے میں کسی کو چھونے کی اجازت نہیں دیتا۔“

”سیدھی طرح رقم نکال دو تمہاری ہر بات مان لی جائے گی۔“

”تو تم میرا گریبان نہیں چھوڑو گے۔“ میرا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ ”اگر سرکاری ہاتھ بلا دوچ عوام کے گریبانوں سے الجھنے لگیں تو سرکاری گریبان محفوظ نہیں رہتے۔“

میرے لہجے میں جو تاثر تھا، اس نے انسپکٹر کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری بات سے الجھن میں پڑ گیا ہے۔ اس نے کن انکھیوں سے نیلم کی طرف دیکھا جیسے اس سے مزید ہدایات لینا چاہتا ہو۔

”گریبان چھوڑ دو، انسپکٹر۔“ نیلم بولی۔ ”اور اپنے ساتھیوں سے کہو کہ گھر کی تلاشی لیں۔ اس نے اتنی جلدی اتنی بڑی رقم خرچ نہیں کی ہوگی۔“

وہ خود کو دوبارہ میرے راستے پر لے آئی تھی۔

میں چند لمحوں تک تو بے چینی سے اس البٹی اور بھاپ اڑاتی ہوئی کیتلی جیسی لڑکی کو دیکھتا رہا پھر میرے لبوں میں مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پولیس والوں کی مدد سے میرے ہوش ٹھکانے لگا کر اپنی رقم نکالوانے آئی ہے۔ اس ناگمانی صورت حال نے میرے دل و دماغ سے شبنم کا خیال دھو ڈالا اور میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے۔“

میری شوخی پر اس کا چہرہ ایک بہت بڑا، دکھتا ہوا انکارہ محسوس ہونے لگا۔ اس نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہی ہے وہ بد معاش، جس نے فریب دے کر مجھ سے چھ لاکھ روپے حاصل کیے ہیں۔“

انسپکٹر نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ دیکھ رہا ہو کہ میں انسان نہیں بلکہ کوئی ایسا تھیلا ہوں جس میں چھ لاکھ سا بھی سکتے ہیں یا نہیں، پھر اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ لیکن میں اس کی طرف متوجہ نہ رہا اور نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔ ”محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے ڈیڑھ... لیکن اس میں پولیس والوں کی مداخلت کسی طرح بھی جائز نہیں ہوتی۔“

”محبت... ہونہ۔ صرف جنگ کو... اور میرے نزدیک جنگ میں سبھی کچھ جائز ہوتا ہے۔ میں تمہیں سچ چوراہے پر لے جا کر ناک سے لکیریں نکواؤں گی۔“

”ہر لکیر محبت کا پیغام بن جائے گی۔“ میرا لہجہ درد ناک ہو گیا۔

”میں نے تمہیں کبھی گھاس نہیں ڈالی۔“ وہ تھلا گئی۔ ”اپنی صورت دیکھی ہے آئیے میں؟“

”جھوٹ مت بولو نیلم۔“ میں نے سوگوار ہو کر کہا۔ ”تم نے مجھے گھاس ڈالی تھی لیکن میں گھاس چرنے والا نوجوان نہیں تھا ورنہ اس وقت تم مجھ سے نگاہیں ملا کر بات نہیں کر رہی ہوتیں۔“

اس نے نچلا ہونٹ بھیج لیا۔ اس وقت ذہن میں اپنی خواب گاہ کا منظر گھوم گیا ہو گا، جب میں اس کی ہستی کو ایک چادر سے ڈھانپ کر چلا آیا تھا اور اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”گلشن والے جنگل کے گھراں، وہ تمہارے بابا...“

”شٹ اپ۔“ وہ پاؤں پٹخ کر غرائی۔

”تم غصے میں اور بھی حسین ہو جاتی...“ میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ ”انسپکٹر صاحب اور ان کے ساتھی بھی اس بات کی تصدیق کریں گے۔ یہ روپ میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“

”تم نے ابھی میرا وہ روپ نہیں دیکھا جو تمہیں راتوں کی نیند اور دن کے چین سے محروم کر دے گا۔“ وہ تھلا گئی۔ پھر شاید اسے احساس ہو گیا کہ انسپکٹر اور اس کے ساتھی ابھی تک

کا بھی پولیس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ روپ دھارنا اور اسے کامیابی سے بھانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔“

اچانک میری سماعت سے مختلف آوازیں نکلنے لگیں۔ میں اس محلے میں ایک طویل عرصے سے مقیم تھا اور سب لوگ میری عزت کرتے تھے۔ ان کے نزدیک میں ایک شریف اور محنتی نوجوان تھا۔ کیونکہ کسی نے مجھ میں کبھی کوئی اخلاقی برائی نہیں دیکھی تھی، اس لیے سب حیران تھے کہ میرے ہاں پولیس کیوں آئی ہے۔ باہر سے آنے والے شور میں سے جو چند منٹ میری سماعت تک پہنچے، ان سے اندازہ ہوا کہ لوگ پولیس کے آنے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں... ادھر میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر باوردی آدمیوں اور نیلم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

”اب بتاؤ، تم لوگوں سے کیا سلوک کرو؟“ میں نے پوچھا۔

انسپکٹر اور اس کے ساتھ قراورد نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

”میرا خیال ہے مجھے چاہیے کہ تمہیں محلے والوں کے حوالے کر دوں۔ یہ لوگ باوردی لوگوں پر پتھراؤ کر کے یوں بھی بہت خوش ہوتے ہیں... اور اگر انہیں بتا دیا جائے کہ تم بہروپے ہو تو آج محلے والوں کی عید ہو جائے گی۔ گھرے ہوئے شکار پر ہاتھ پیر آزمانے میں یوں بھی کچھ لوگ زیادہ ہی فراخ دل ثابت ہوتے ہیں۔“

”تم اپنے حق میں بہت برا کر رہے ہو۔“ انسپکٹر نما شخص نے غرا کر کہا۔

”یہی بات میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔“

”چلو چلیں... ہمیں اس سے بھر کسی وقت...“ نیلم نے کہا۔

”نہیں، مس نیلم، یہ میرا گھر ہے۔ ایک فن کار کا گھر... تم جتنی آسانی سے یہاں چل آئی تھیں، اتنی آسانی سے واپس نہیں جاسکتیں۔“

نیلم کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے۔ اس کی ساری تیزی طراری رخصت ہو گئی۔ ادھر انسپکٹر اور اس کے ساتھیوں کی وردیاں پسینے سے بھجک کر جسوں سے چپک گئی تھیں۔

”جلدی فیصلہ کرو۔“ میں نے کڑک کر کہا۔ ”محلے والے یا پولیس۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ انسپکٹر گڑبڑا گیا۔

میں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ”باہر ایک سو کے لگ بھگ بچے اور جوان موجود ہیں... اور قریبی قحانے کی نفری صرف بیس افراد پر مشتمل ہے۔“

”تم بہت کہتے ہو۔“ نیلم سک پڑی۔ ”ایک بار میرے ہتھے چڑھ گئے تو کچا ہی چبا جاؤں گی۔“

”ہمیں جانے دو۔“

”اور یہ جو تم لوگوں نے میرا قیمتی وقت برباد کیا ہے؟“

”مجھ کو کہ تمہارے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔“ نیلم غرائی۔ ”ان گدھوں کو چاہیے تھا کہ

انسپکٹر نے میرا گریبان چھوڑ دیا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ گھر کی تلاشی لیں۔ میں نے ان سے یہ پوچھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ان کے پاس تلاشی وارنٹ موجود ہے یا نہیں کہ میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ان لوگوں کی آمد سے اب تک میں ایک بے نام سی غلطی میں مبتلا تھا... اور اب وہ ابھرنے لگا تھا۔ خود بخود ہی سلجھ رہی تھی۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں جو مجھ جیسے مستعد اور چاق و چوبند ذہن رکھنے والے آدمی کو حقائق سے آگاہ کر سکتی تھیں لیکن میں نیلم کی آمد کے ذہنی جھٹکے سے شاید ابھی تک نہیں سنبھلا تھا ورنہ حقیقت بہت پہلے مجھ پر کھل چکی ہوتی۔ میں نے اپنے شہسے کی تصدیق کے لیے گزشتہ چند منٹوں میں ہونے والی تمام باتوں پر نظر ثانی کی تو ایک بے اختیار مسکراہٹ خود بخود ہی میرے لبوں پر آگئی۔

انسپکٹر اور سپاہی میرے گھر کی تلاشی لے رہے تھے۔ کچھ لمحے بعد نیلم بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

”ذرا توجہ سے دیکھنا، دوستو۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”میں گزشتہ دس سال سے یہاں جھک مار رہا ہوں۔ مجھے کبھی کچھ نہیں ملا۔ ہو سکتا ہے تمہیں مل جائے۔“

کسی نے میری بات پر توجہ نہیں دی۔

کچھ دیر بعد انہوں نے پورا گھر دیکھ ڈالا لیکن وہاں کچھ ہوتا تو ملتا۔ نیلم کے چہرے پر شکست کے آثار تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میری مسکراہٹ جلتی پر تیل کا کام کر گئی۔ وہ اپنے لیے ناخنوں والی اٹھیوں سے میرے چہرے پر جھپٹ پڑی جیسے اس مسکراہٹ کو نوج لینا چاہتی ہو۔ میں نے اطمینان سے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تمام لی اور سرکوشی کی۔ ”شکریہ!“

”کس بات کا؟“ وہ بھونچکا رہ گئی۔

”اپنا ہاتھ، میرے ہاتھ میں دینے کا۔“

”اوتے فریاد کے بچے۔“ انسپکٹر نے گرج کر کہا۔ ”میں پوچھتا ہوں، رقم کہاں ہے؟“

”آپ نے خود ملاحظہ فرمایا۔ اگر ہوتی تو یہیں کہیں ہوتی۔“

”میں تمہیں گولی مار دوں گا۔“

”یہ بات کسی انسپکٹر کو زیب نہیں دیتی۔“ میں نے تحمل سے کہا۔ ”یہ ڈائبل لگ تو کسی تیسرے درجے کے شدے بدعاش یا اسمگلر ہی کی زبان سے اچھا لگتا ہے۔“ میں نے اطمینان سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پستول نکال لیا۔

انسپکٹر نے تلاشی لیتے وقت پستول ہولسٹر میں ڈال لیا تھا۔ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کا ہاتھ تیزی سے اپنے ہولسٹر کی طرف گیا، لیکن وہی پستول تو میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا خالی ہولسٹر میں اسے بھلا کیا ملتا۔ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر نیلم کی حالت بھی غیر ہو گئی۔ اس نے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات کی اور انسپکٹر میری طرف بڑھنے لگا۔

”یہ حماقت نہ کرنا۔“ میں نے سفاک لمحے میں کہا۔ ”تم لوگ اس وقت پولیس کی وردی میں ہو۔ اگرچہ تم سب میرے لیے اجنبی ہو... لیکن میں جانتا ہوں کہ تم میں سے کسی کے آباء اجداد

”پھر کبھی سسی نیلم۔ اس وقت ہماری پوزیشن کمزور ہے۔“ انسپکٹر نے اسے سمجھایا۔ ”تم دیکھ لو گی کہ میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔ یہ رقم لے کر تمہیں گلی گلی ڈھونڈنا پھرے گا۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ساتھی پہلے ہی باہر جا چکے تھے۔ سب سے آخر میں نیلم ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ میں نے ساری رقم میٹ لی۔

ان کے جاتے ہی میرے پڑوسی اندر آگئے۔ انہوں نے بیک زبان مجھ سے پولیس کے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ پولیس کے ساتھ جو لڑکی تھی، اس کا بھائی گھر سے بھاگ گیا ہے۔ وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی میرے ہاں بھی آگئی کہ شاید مجھے اس لڑکے کے بارے میں کچھ معلوم ہو لیکن میں اس لڑکے کا پتہ نہیں بتا سکا کیونکہ اس سے میری آخری ملاقات تین چار ماہ پہلے ہوئی تھی۔ اس کے بعد تو میں نے کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ محلے والوں نے کھڑکی یا دروازے سے کان لگا کر اندر ہونے والی گفتگو نہیں سنی تھی، ورنہ انہیں آسانی سے مطمئن کرنا محال ہو جاتا۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ لوگ چلے گئے تو گلی میں سناٹا چھا گیا۔ گلی ویران سی ہو گئی۔ عموماً یہ گلی اسی طرح سنسان رہتی تھی۔ کچھ دیر بعد یوں محسوس ہوا کہ سرے سے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میرا ذہن بار بار نیلم کی طرف جا رہا تھا۔ آج کی حرکت سے اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ آئندہ بھی میرے لیے پریشانیاں کھڑی کرتی رہے گی۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے اس سے نہ صرف ہوشیار رہنا چاہیے... بلکہ اس کا کوئی مستقل بندوبست بھی کر دینا چاہیے۔ میں اس کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ نہ جانے ذہن کے کس گوشے سے نکل کر شبنم میرے تصور میں آکھڑی ہوئی۔ میری نظروں میں اس کا دلکش سراپا اور موہنی صورت گھومنے لگی... لیکن اب میں حقیقت پسند بن کر اپنے دل پر مہم رکھ سکتا تھا۔ میں اپنے دل کو سمجھانے لگا کہ شبنم پر صرف نوجوان وکیل کا حق ہے، جو اس کا بچپن کا ساتھی ہی نہیں، اس سے منسوب بھی ہے۔ کاش! شبنم نے جس خلوص کے جذبے سے مجھے غلط فہمی میں مبتلا کیا تھا، میں اس سراپ سے دور ہی رہتا۔ وہ مجھے بے تصور دکھائی دینے لگی۔ تصور سراسر میرا اپنا ہی تھا، جو میں اس کی مدد کرتے کرتے اس کی محبت میں الجھ کر رہ گیا۔ اس نے ایک بار بھی اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ کرتی بھی کیسے؟ وہ تو بچپن ہی سے صادق کی محبت کا دم بھرتی چلی آ رہی تھی۔

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے ہر خیال ذہن سے جھٹک دینا چاہا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ میں نے اس کی سادہ لوحی، خلوص اور اپنائیت کو محبت کا رنگ دے دیا تھا اور یہ میری غلطی تھی۔ اب جب کہ کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہا تھا تو پھر میں کس لیے جذباتی ہو رہا تھا؟ میرے دل و دماغ پر ایک بوجھ سا کیوں ہے؟ مجھے اس ذہنی کش مکش سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجانا چاہیے اور عملی طور پر شبنم کے خلوص کا جواب خلوص ہی سے دینا چاہیے۔

یہ سوچ کر میرے دل کو قدرے سکون اور قرار سا آگیا۔ میرے اعصاب پھول کی طرح

پہلے تمہارا کچھ مر نکال دیتے۔ پھر کوئی بات کرتے۔“

”گویا تم لوگ میرے قیمتی وقت کی بربادی کا ہر جانہ ادا کرتا نہیں چاہتے۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ ایک سپاہی نما شخص بول پڑا۔

”سب لوگ اپنی اپنی جیبیں خالی کرو۔“ میں نے حکم دیا۔ ”جو کچھ بھی ہے، نکال کر سامنے

میز پر ڈال دو اور منہ لٹکا کر یہاں سے چلے جاؤ۔“

سپاہی کی وردی میں ملبوس جس شخص نے مجھ سے سوال کیا تھا، وہ بے حد سمجھ دار نکلا۔ اس نے جلدی سے جیبیں کھنگالیں اور جو کچھ اس کے پاس تھا، نکال کر میز پر رکھ دیا۔ دیکھا دیکھی دوسری آدمیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ سپاہی نما شخص اپنی جیبیں خالی کر چکے تو انسپکٹر نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا بڑھ نکال کر میز پر ڈال دیا۔

”اندر دینی جیب سے وہ نوٹوں کی گڈی بھی نکالو۔“ میں نے کہا۔

”آں... کوئی گڈی؟“ وہ حیران رہ گیا۔

”وہی جس کی خوشبو میرے تھنوں سے نکلا کر مجھے بے چین کر رہی ہے۔“ میں نے

سرکاری قیص کے اندر اپنی ہوئی باریک صدی کی طرف اشارہ کیا۔

چند لمحوں تو وہ حیرانی اور بے یقینی سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر اس قیص کے بن بھلوے اور نوٹوں کی گڈی نکال کر میز پر رکھ دی۔

”شاباش... یہ شاید نیلم کی طرف سے ڈالا ہوا راتب ہے۔ جس کی وجہ سے تم دم بلا تے ہوئے اس کے ساتھ یہاں چلے آئے تھے۔“ میں نے ہنس کر کہا اور نیلم کی طرف متوجہ ہو گیا جس کے تھن تیزی سے پھیل سکر رہے تھے۔ وہ یوں ہانپ رہی تھی جیسے بہت دور سے دوڑ کر آئی ہو۔

ابھی تم ان کرائے کے ٹٹوں کے ساتھ جا سکتی ہو لیکن میری ایک بات یاد رکھنا۔“

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”مجھ سے منٹنا چاہتی ہو تو ایک شخص کا ہاتھ تھام لو۔“

”کون ہے وہ؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”سکندر...“ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”جس کی فتوحات کا سلسلہ ابھی

جاری ہے۔“

”تمہاری فتوحات کی، ایسی کی تھیں...“ وہ ایک بار پھر میرا چہرہ نوچنے کے لیے جھپٹی لیکن میں نے پتول والا ہاتھ اٹھا دیا۔ پتول راستے میں حائل ہو گیا تو وہ ٹھنک سی گئی۔ میں نے پتول سے گولیاں نکال کر اس کی طرف اچھال دیا۔ ”اسے لیتی جاؤ۔ اگلی ملاقات میں شاید کسی ڈی آئی جی کے کام آجائے۔“

اس نے پتول لیا اور انسپکٹر کو تھما دیا۔

”اب یہ نسا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”کیا تم سب مل کر اس کی ہڈی پیلی ایک نہیں کر

سکتے؟“

انگل! وہاں میری بہت سی سیلیاں ہیں اور میں پڑھنا چاہتی ہوں۔“
”اچھا۔“ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور کہا۔ ”آؤ چلو، مجھے اسکول لے کر چلو۔ اب تمہیں کوئی اسکول سے نہیں نکالے گا۔“

نوشین کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں جو آنسو تھے، وہ خشک ہو گئے۔ وہ میری انگلی پکڑ کر چلنے لگی۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے بڑی مصومیت سے پوچھا۔ ”انگل! انکل! عذرا میری سیٹی ہے۔ اس کے ابو تو اس کی فیس نہیں دیتے۔ پھر اسے میری طرح اسکول سے کیوں نہیں نکال دیا جانا؟ وہ تو کہہ رہی تھی کہ اس کے ابو نے آج تک کبھی اسکول کی فیس نہیں دی۔ ایسا ہو سکتا ہے انکل سکندر؟“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جس اسکول میں تم پڑھتی ہو، وہاں ہر ایک سے فیس لی جاتی ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ اسکول ہے۔ البتہ سرکاری اسکولوں میں فیس نہیں لی جاتی۔ عذرا جھوٹ بولتی ہے۔ اسے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔“

”عذرا جھوٹ نہیں بولتی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ اس کے ابو مرزا ناصر سے پوچھ لیں۔ میرے ابو بھی کہتے ہیں کہ اسکول والے ان سے فیس لے ہی نہیں سکتے۔“

”مرزا ناصر...“ میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”عذرا مرزا ناصر کی بیٹی ہے، تمہارے ابو سچ کہتے ہیں نوشین بیٹی۔“

میں نوشین کو لے اسکول کی عمارت میں داخل ہوا۔ یہ ایک بہت بڑا اسکول تھا۔ کراچی شہر میں اس کی چار شاخیں تھیں۔ اس اسکول کی فیس بہت زیادہ تھی۔ لیکن فیس زیادہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی تمام کلاسوں میں بچے کھپا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ دوسرے پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکولوں کی طرح یہاں بھی پڑھائی پر کم، کتابوں، یونیفارم اور مختلف پروگراموں کا بہانہ بنا کر زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ اسکولوں کی استائیاں، ٹیچر کم اور ماڈل گرلز زیادہ نظر آتی تھیں۔ خادمہ نے مجھے پرنسپل کے کمرے میں جانے سے روک دیا۔ ”بڑے صاحب اندر موجود ہیں اور بیگم صاحبہ ان سے بات چیت کر رہی ہیں۔“

میں نے دس منٹ تک انتظار کیا۔ صاحب باہر نہ آئے تو میں اٹھ کر برآمدے میں ٹھٹھنے لگا۔

برآمدے میں ٹھٹھتے ہوئے میں دروازے کے سامنے سے گزرا۔ دروازہ نیم داکھا تھا۔ میں نے ایک نظر اندر ڈالی... پرنسپل صاحبہ ایک بھاری بھر کم عورت تھیں۔ چہرے سے خراٹ نظر آتی تھیں، جب کہ ان کے سامنے کھڑے شوہر نامدار دہلے پٹلے اور مرنجاں مرنجے تھے۔ میں ٹھٹھا ہوا واپس آیا تو کن انکھیوں سے دیکھا۔ پرنسپل صاحبہ میز کی دراز سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اپنے شوہر کی طرف بڑھا رہی تھیں۔ ”یہ رقم مسٹر اوپس کو بطور پیشگی دے دیں۔ چار ہزار گز کا وہ پلاٹ اسکول کی نئی عمارت کے لیے بہت موزوں ہے۔ ایک ہفتے میں پوری ادائیگی ہو جائے گی۔ اس کے بعد گلشن اقبال والے پلاٹ کی بھی بات کر لیں۔“

ہلکے ہو گئے۔ تب مجھے شدت سے بھوک کا احساس ہونے لگا۔ آج گھر بیٹھے ہی دھندہ ہو گیا تھا۔ میں اس ستم ظریفی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے مریاں ہوٹل جا کر ناشتہ کروں گا۔ وہاں سے جی کے ہاں جاؤں گا۔ سہ پہر کو ابو میاں کے ہاں بھی چکر لگاؤں گا۔ وہ رہا ہو کر گھر آگئے ہوں گے اور ان کے گھر خوشیاں اور مسکراہٹیں نکھری ہوں گی۔ وہاں جا کر میرے ضمیر کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور میری شرکت سے ان لوگوں کی خوشی بھی دوچند ہو جائے گی۔

مریاں ہوٹل پہنچ کر میں نے پر تکلف ناشتے کا آرڈر دیا اور وہاں موجود محلے کے چند شناسا لوگوں کو بھی اس میں شریک کر لیا۔ میرے محلے کے بیشتر لوگ سندھ پنجاب اور سرحد کے رہنے والے تھے لیکن کوئی بھی ایک دوسرے کے سلسلے میں تعصب کا شکار نہیں تھا۔ سب بھائیوں کی طرح رہتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے میرا محلہ ایک مثالی محلہ تھا۔

ناشتہ کر کے ہوٹل سے نکل کر گلی میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے برابر والے گھر کی سات سالہ بیٹی نوشین دکھائی دی۔ وہ غلام رسول کی بیٹی تھی اور مجھے پیار سے انکل کہا کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کے کندھے سے اس کا بستہ جھول رہا ہے۔ گویا وہ اسکول سے واپس آ رہی تھی۔

نوشین بڑی ہی پیاری بیٹی تھی۔ اس کا رنگ میرے جیسا سفید تھا اور ناک نقشے سے وہ کوئی چھٹی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ مجھے شروع ہی سے بچوں سے بہت پیار تھا لیکن نوشین تو جیسے میری اپنی ہی بیٹی تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں روشنی ہی دیکھی تھی۔ اس کے رونے اور یوں اسکول سے ناوقت واپس پر مجھے حیرت ہونے لگی۔ میں نے اسے پکارا۔ ”کیوں بیٹے نوشی! تم رو رہی ہو یا تمہاری آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہے؟“ میں نے گفتگو لمبے میں پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ اس بات پر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑے گی لیکن اس نے اپنے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے پونچھا، پھر ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”سکندر انکل! مجھے اسکول سے نکال دیا گیا ہے۔“

”اسکول سے نکال دیا گیا ہے؟ وہ کس لیے؟“ میں نے اپنے رومال میں اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے موتیوں کو جذب کرتے ہوئے پوچھا۔

”ابو نے دو مہینے کی فیس نہیں دی ہے نا، اس لیے۔“

”کیا مس نے تمہیں مارا بھی ہے؟“

”نہیں، مارا تو نہیں۔“ اس نے اپنا سر نگی میں ہلا دیا۔

”اگر کسی نے مارا نہیں تو پھر تم رو کیوں رہی ہو؟“

”اس لیے کہ اب میں اسکول نہیں جاسکوں گی۔ ابو کہہ رہے تھے کہ وہ ابھی دو مہینے اور اسکول کی فیس نہیں دے سکتے۔“ وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔ ”مجھے اسکول بہت اچھا لگتا ہے

”وہ امیر ہے یا غریب ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں صرف اپنی فیس سے غرض ہے۔ جو فیس نہیں دے سکتا، وہ یہاں نہیں پڑھ سکتا۔“

”میری بات تو سنیے، پلیز!“ میں نے لجاجت سے کہا۔ ”غلام رسول کا ٹھیلا تین مہینے پہلے کچھ شریپندوں نے لوٹ لیا تھا اور ٹھیلے کو توڑ پھوڑ دیا تھا۔ وہ غریب دو مہینے سے ٹھیلے کی کوشش کر رہا ہے۔ اتنا فیور اور خوددار ہے کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے سے مر جانا بستر سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ بچی کی فیس جمع نہیں کر سکا۔ اسے دو تین مہینے کی مہلت دے دیں۔ وہ سنبھل جائے گا تو آپ کی ساری فیس ادا کر دے گا۔ اس رعایت سے معصوم بچی کا مستقبل بھی تباہ ہونے سے بچ جائے گا۔“

”یہ کوئی سرکاری اسکول یا یتیم خانہ نہیں ہے جو بچوں کی فیس معاف کر دی جائے۔“ وہ رعوت سے کہنے لگیں۔ ”آپ غلام رسول صاحب سے کہہ دیں کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر فیس جمع کرا دیں۔ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد دوبارہ داخلہ بھی نہیں ملے گا۔ ہمارے پاس سٹیشن پہلے ہی کم ہیں۔“

”مگر آپ کے ہاں بھی تو بچوں کی فیس معاف ہوتی ہے۔ جب ایک بچے کی فیس معاف ہو سکتی ہے تو آپ کو چاہیے کہ ایک مستحق بچی کی فیس بھی معاف کر دیں۔ یہ خالص انسانی مسئلہ ہے۔“

”کس کی فیس معاف ہے؟“ وہ بھڑک اٹھیں۔ ان کا چہرہ سرخ ہو کر چندر کی طرح لگ رہا تھا۔ ”گورنر کے بچے ہوں، تب بھی میں ان کی فیس معاف نہیں کروں گی۔“

”کیا بے بی عذرا کسی وزیر کی بچی ہے جس کی فیس آپ نے معاف کر رکھی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آج تک اس بچی سے کوئی فیس نہیں لی گئی؟“

”بے بی عذرا؟“ وہ ایک دم سے ایسے اچھل پڑیں جیسے بے خبری میں سوئی چھ گئی ہو۔

بات دراصل یہ ہے جی... ”وہ گورنر ہیں۔“

”اصل بات کیا ہے؟ وہ میں جانتا ہوں۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”بے بی عذرا، مرزا ناصر کی بیٹی ہے اور مرزا ناصر انکم ٹیکس آفس میں ہیں۔“

پرنسپل صاحب کا چہرہ حقیر ہو گیا۔ وہ گنگ اور ساکت بیٹھی پتھر کا مجسمہ لگ رہی تھیں۔ میں نے اس خاموشی سے فائدہ اٹھا کر اپنی بات جاری رکھی۔ ”آپ نے ایک اسکول سے چار اسکول بنا کر اپنا مستقبل تو بنالیا۔ صرف دو مہینے کی فیس کے لیے اس بچی کی سال بھر کی محنت پر پانی پھیر رہی ہیں اور اس کا مستقبل تباہ کرنا چاہتی ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آپ ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ اسکول چلا رہی ہیں۔ اگر آپ نے اپنے کسی اسکول میں دو چار بچوں کو مفت پڑھنے دیا تو کون سافرق پڑ جائے گا۔ پھر آپ جانتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی نیکیوں کو ضائع نہیں کرتا۔“

وہ غل سی نظر آ رہی تھیں۔ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولیں۔ ”میں اب تو نوشین کی فیس نہیں لوں گی۔ یہ مفت تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔“

”اب اس احسان عظیم کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب تک سکندر زندہ ہے اسے اسکول سے

”ہم چار ہزار گز کے اس پلاٹ پر ایسی شاندار عمارت تعمیر کریں گے کہ کراچی شہر میں کوئی اسکول اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔“ شوہر کی آواز سنائی دی۔ ”اور ہم اس کی فیس اتنی رکھیں گے کہ سال دو سال میں ہی تعمیرات کا خرچ نکل آئے گا۔ ٹھیک ہے نا؟“

”اور کیا۔“ پرنسپل صاحب بولیں ”وہاں ایک ہزار بچوں کی گنجائش ہو گی، ہم دو سو سے کم فیس نہیں رکھیں گے۔“

”دو سو کچھ زیادہ نہیں ہو جائیں گے؟“

میں بہت بہت آہستہ آہستہ ٹھٹھا رہا اور میرے کان ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ پرنسپل صاحب فرما رہی تھیں۔

”لیاقت آباد کے لوگ زسری کلاس میں پڑھنے والے بچوں کی فیس ایک سو پچیس روپے دے سکتے ہیں تو ہمارے ناظم آباد والے کیوں نہیں دے سکتے۔ دو سو روپے فیس تو زسری کلاس کی ہو گی۔ بڑی کلاسوں کی تو ہم دو سو روپے سے تین سو روپے تک فیس لیں گے... یہ میرا دیرینہ خواب ہے۔“

شوہر نادر نے نوٹوں کی گڈی میز سے اٹھا کر جیب میں رکھی تو میرے ہاتھوں میں کھلبلی ہونے لگی۔ میں تیزی سے نوشین کے پاس جا کھڑا ہوا۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا اور دروازے سے ایک قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے اپنے شکار کا انتظار تھا چند لمحوں کے بعد پرنسپل کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی شخص باہر آ گیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ وہ گردن اٹھائے چلتا ہوا میرے قریب پہنچا تو دونوں میں ٹکرا ہو گئی۔ وہ جاگتی آنکھوں خواب دیکھ رہا تھا اس لیے اسے اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ میری فنکار انگلیوں نے اس کی جیب ہلکی کر دی ہے۔ اس نے زیر لب سوری کہا اور کار کی طرف بڑھ گیا۔

میں نوشین کو ساتھ لے کر پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوا تو بچی کو دیکھ کر ان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ”تم کس لیے آئی ہو، اسکول سے تمہارا نام کٹ دیا گیا ہے۔“

”یہ آئی نہیں ہے بلکہ میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔“ میں نے ملاقاتیوں کے لیے رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے کہا اور نوشین کو بھی ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پرنسپل اپنی گول گول آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں ابھریں۔ شاید اس لیے کہ میں نے ان سے کرسی پر بیٹھنے کے لیے اجازت طلب نہیں کی تھی۔ میں نے بڑی شائستگی سے دریافت کیا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس بچی کا نام اسکول سے کیوں خارج کر دیا گیا ہے؟“

”اس لیے کہ دو مہینے کی فیس باقی ہے۔“ انہوں نے تند لہجے میں کہا۔ ”بار بار نوٹس دیا گیا مگر والدین پر کسی نوٹس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔“

”آپ شاید اس معصوم بچی کے باپ غلام رسول کو نہیں جانتیں۔ وہ لالوہیت میں پیاز کا ٹھیلا لگاتا ہے۔ وہ ایک غریب آدمی ہے۔“

ان لوگوں سے ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ رقم چھ سو نہیں بلکہ چھ لاکھ تھی۔ اس رقم کے لیے وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔“

”اوکلی میں سردیا ہے تو ڈر کی کیا بات ہے۔۔۔ اور پھر مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ اس پر میرا ایمان ہے۔ فکر نہ کرو، مجھے ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب آتا ہے۔“

دفترا! مجھے یاد آیا کہ میری جیب میں ایک کانڈ موجود ہے جو انسپکٹر کی جیب سے نوٹوں کے ساتھ نکلا تھا۔ ایسے ہی کانڈات میں نے نیلم کے پرس میں بھی دیکھے تھے لیکن میں نے دانستہ انہیں ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ میں نے جیب سے وہ کانڈ نکالا۔ اسے کھول کر دیکھا تو وہ ایک خط تھا۔

”ڈیز کریم بخش افضل! تمہارا خط اور مفصل رپورٹ ملی۔ رپورٹ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ تم اندرون ملک اور تقریباً تمام صوبوں میں سرگرم عمل ہو اور اپنے ہم خیال جوانوں کو ساتھ لے کر چل رہے ہو۔ اب تک تمہاری طرف سے جو کاروائیاں ہوئی ہیں، وہ چھوٹے پیمانے پر ہیں۔ ان کا سلسلہ جاری رکھو، کسی بھی کارروائی کے مقابلے میں ذہنی طور پر کسی کو ہم خیال بنانا بہت ضروری ہے۔ یہی سب سے بڑی کارروائی ہے۔ جب تک ہمارے خیالات اور مقاصد کسی کے دل و دماغ میں سرایت نہیں کر جاتے، اس وقت تک ہم اپنے آپ کو کامیاب و کامران نہیں کہہ سکتے۔ سب سے پہلے ذہن پر قبضہ جمانا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ جوانوں کو رکن بناد۔ رقم کی فکر نہ کرو، ہمارے پاس معقول فنڈ موجود ہے اور مزید فنڈ کچھ روز میں پہنچنے والا ہے۔ ہمارے غیر ملکی دوست بڑے خلوص اور جذبے سے ہماری مدد پر آمادہ ہیں۔ اسلحہ بھی پہنچ رہا ہے، مگر ہر کسی کو ہتھیار دینا درست نہیں۔ صرف تربیت یافتہ افراد کو اسلحہ دیا جائے۔ چند منتخب نوجوانوں کو ہمارے پاس بھیج دو۔ احتیاط بے حد ضروری ہے کیونکہ حکومت کے کارندے، شکاری کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ ہر جوان کو مخصوص کارڈ دے کر بھیجنا۔ ہم انہیں تربیت کے لیے اپنے دوست ملک بھیج دیں گے۔ آج کل کے جوانوں کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے۔ دوست ممالک میں ایسے نوجوانوں کی پذیرائی کے لیے حسین اور پر شباب دوشیزائیں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ دیگر تفریحات بھی ہیں۔ تم انہیں یہ سب کچھ بتاؤ گے تو وہ تحریک میں حصہ لینے اور تربیت پانے کے لیے ضرور پر جوش ہو جائیں گے۔ ہم نے یہاں بھی چند حسین لڑکیوں کو اس مقصد کے لیے تیار کیا ہے، ان کی وجہ سے کالی جوان تنظیم میں شامل ہو رہے ہیں لڑکے، ایسی لڑکیوں سے متاثر ہو کر کشاکش کشاں چلے آتے ہیں۔ لہذا کوشش کرو کہ مقامی طور پر حسین لڑکیاں تنظیم میں شامل ہوں تاکہ وہ لڑکوں کو ہم خیال بنا کر ان کے دلوں میں انقلاب کا جذبہ موجزن کریں۔۔۔ یہ خط صابر کے ہاتھ روانہ کیا جا رہا ہے، اسے پڑھنے کے بعد تلف کر دیا جائے۔“

خط کے آخر میں نہ تو کسی کا نام تھا اور نہ پتہ لکھا ہوا تھا۔ کریم بخش افضل کون ہے؟ کس شہر میں رہتا ہے۔ اس خط سے کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ نیلم جس تنظیم سے وابستہ ہے، وہ بڑی منظم، خال اور زیر زمین ہے اور اسے وسعت دی جا رہی ہے۔

میں نے خط پڑھ کر جی کے حوالے کر دیا۔ جی نے خط پڑھ کر کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ یہ

نہیں نکالا جائے گا۔“ میں نے جیب سے رقم نکالی تو ”معا“ میری نظر ایک کانڈ پر پڑی جو نوٹوں کے درمیان دبا ہوا تھا۔ پہلے تو میں حیران ہوا کہ یہ کانڈ کہاں سے آگیا، پھر یاد آیا کہ یہ کانڈ انسپکٹر کی جیب سے نکلا تھا۔ یہاں وقت اور موقع نہیں تھا کہ میں اس کانڈ کو کھول کر دیکھتا لہذا میں نے پندرہ سو روپے کی رقم میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نوشین کے نام پورے ایک سال کی فیس جمع کر لیں اور آئندہ اس معصوم بچی کے نازک دل کو غمیں نہ پہنچائیں۔“

نوشین اپنی کلاس کی طرف چلی گئی اور پرنسپل صاحبہ رسید بنانے میں مصروف ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد میں پرنسپل کے دفتر سے نکلا تو میرے سارے بدن میں فرحت سی دوڑ رہی تھی اور نس نس میں لہو جیسے رقص کر رہا تھا۔ کوئی نیکی کرنے سے کس قدر خوشی اور طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ آج بھی میرا دل اس تصور سے سرور ہو جاتا ہے۔ ایسی مسرت دنیا جہاں کی دولت ملنے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

میری جیب میں دس ہزار کی رقم تھی۔ دس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ یہ رقم بڑی آسانی سے، میری اگلیوں کی مہارت سے، میری جیب میں منتقل ہو گئی تھی۔ مگر اسے پاکر مجھے خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ اس رقم کو پانے کے بعد میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں ابھرا تھا۔ اگر یہ رقم نہ ملتی تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ میرے شب و روز گزر رہے جاتے، تاہم میرا دل اور ضمیر مطمئن تھا کہ میں نے کسی شریف اور محنت کش کی جیب نہیں کاٹی۔ میں نے ان لوگوں کی جیب کاٹی ہے جو اپنے اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے والدین کا پیٹ کاٹ رہے ہیں اور پھر مجبور ماں باپ کی جیبیں کاٹ کر ایک اسکول سے چار چار اسکول بنا رہے ہیں۔ لاکھوں روپے کمانے کی غرض سے چار ہزار گز کا پلاٹ رشوت دے کر خرید رہے ہیں۔ ان کے پاس کیا کچھ نہیں ہے۔ چند سالوں میں انہوں نے کوٹھیاں بنالیں۔ بنگلے بنا لیے۔ ہر سال نئے ماڈل کی کاریں خریدتے ہیں۔ دوسروں کا مستقبل روند کر اپنا مستقبل بنا رہے ہیں۔ یہ لوگ بھی تو پاکت مار ہیں لیکن ان کے لیے کوئی قانون نہیں ہے۔ تاہم مجھ میں اور ان میں ایک واضح فرق ہے۔ میں کسی شریف اور محنت کش کے منہ سے نوالہ نہیں چھیٹتا۔ چند سو روپے کی خاطر کسی بچی کا مستقبل تاریک نہیں کرتا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک زندہ رہوں گا، ایسے پاکت ماروں کے خلاف میری تحریک جاری رہے گی۔

میں بہت جذباتی ہو رہا تھا بلکہ ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ میں ایک سال تک اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکا تھا۔ میرے باپ کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ میرا باپ زندہ رہتا تو شاید میں ڈاکٹر بن جاتا۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوتا۔ حالات نے مجھے ڈاکٹر نہیں بننے دیا۔ شاید اس میں قدرت کی کوئی مصلحت تھی۔ آج کل کے ڈاکٹروں کے مقابلے میں میرا پاکت مار ہونا اچھا ثابت ہو رہا تھا۔

میں انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا جی کے ہاں پہنچا تو وہ میرا منتظر تھا۔

میں نے اسے نیلم اور اس کے ساتھیوں کی آمد کا تازہ ترین واقعہ سنایا۔ جی نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔ ”سکندر بھائی! اب تو نیلم اور اس کی تنظیم آپ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے۔

”اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پلٹ کر بھی نہ دیکھتا۔“ جنم کی آواز سرین کر فضا میں گونجی تو میں نے ابو میاں کے سینے سے سر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے ممنونیت کے چراغ روشن تھے۔ اس کے رخساروں کے گلاب کھل اٹھے تھے۔ مجھے اپنے آپ پر کوئی اختیار نہ رہا اور میں اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے مجھے یوں متوجہ پایا تو اپنی آنکھوں کی چلن نیچے گرائی۔ اس نے پھر سے میرے دل کے زخموں کو تازہ کر دیا تھا۔ اس کی قربت سے میری عجیب حالت ہونے لگی۔ میرے سینے میں دھک دھک سی بھر گئی۔ میں نے سوچا کہ اب آئندہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ یہ لڑکی جب بھی میرے سامنے آئے گی، میری یہی حالت ہو گی۔ ہو سکتا ہے میں کسی وقت اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکوں۔

میں نے جانے کی اجازت چاہی تو وہ بولی۔ ”آپ آئے اپنی مرضی سے ہیں، مگر جائیں گے میری مرضی سے۔ میں آپ کو کھانا کھلائے بغیر نہ جانے دوں گی۔“

ایک ایک لمحہ مجھ پر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں محرومی کی صلیب پر لٹکا ہوا ہوں اور کتنی اذیت برداشت کر رہا ہوں۔ وہ غلط کا خنجر بن کر میرے سینے میں پوسٹ ہو گئی تھی۔ دل میں درد تو چھپایا جاسکتا ہے مگر محبت کبھی نہیں چھپائی جاسکتی۔ یہ راز دل کا ناسور بن جاتا ہے اور پھر آنکھوں سے چھلک جاتا ہے، چہرے پر ابھر آتا ہے۔

میں کوشش کے باوجود انکار نہ کر سکا۔ اس نے جس اپنائیت سے، جس لیے اور جس محبت سے مجھے دعوت دی تھی، اس نے میری زبان پر جیسے قفل ڈال دیا تھا۔ مجھے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر چاچی مکرانے لگیں۔

”جنم بہت لذیذ کھانے پکاتی ہے۔ ایک بار کھاؤ گے تو زندگی بھر اس کا ذائقہ بھول نہیں سکو گے۔“ چاچی نے کہا اور میں نے ایک طویل سانس لے کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایکایک صادق اور جنم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس بل وہ دونوں جیسے ہم سب ہی سے نہیں... دنیا و مافیہا سے بھی بے خبر ہو گئے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوب گئے۔ وہ کھو گئے تھے۔ آنکھوں کے راستے دلوں میں اتر گئے تھے۔ میں نے صادق کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بولتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ یوں لگا جیسے وہ آنکھیں جنم سے کہہ رہی ہوں کہ انہیں کھانوں کے ذائقے نے تو اسے امیر بنایا ہے۔

بار بار میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس ماحول سے چلا جاؤں جہاں میرا دم گھٹنے لگا تھا لیکن میرے پیروں میں کئی کئی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکا... اور جب کھانا چن دیا گیا اور جنم میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی تو مجھے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی پڑا۔ وہ مجھے اور جی کو بوے اصرار سے کھلا رہ تھی اور میرا وجود اس کی رفاقت میں دھک رہا تھا۔ میری رگوں میں خون کی بجائے سیال آگ دوڑ رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے ہر ممکن اجتناب برت رہا تھا کیونکہ صادق میرے مقابل بیٹھا ہوا تھا اور وہ صادق کی امانت تھی۔ میں اپنی نظروں کو اس امانت میں خیانت کرنے سے باز رکھنا چاہتا تھا مگر مجھے اپنے آپ اور اپنی نظروں سے کئی بار ٹکست ہوئی اور

تنظیم ملک کے کھڑے کھڑے کر دینا چاہتی ہے۔ آخر یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“

”یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہمارے ملک کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ یہ لوگ کھاتے یہاں کا ہیں اور گاتے دوسروں کا ہیں۔ غلام ذہنیت کے لوگ ہیں۔ ان کے نزدیک دولت ہی سب کچھ ہے اور وہ اس ملک کو حلوے کی پلٹ کی طرح دشمنوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں تم انہیں تنگ وطن، تنگ دین اور غدار کہہ سکتے ہو۔“

”کیوں نہ یہ خط پولیس کو دے دیں؟“ جی نے مشورہ دیا۔ ”ہم اس نقلی انسپلر کو پکڑ کر قانون کے حوالے کر دیں گے، پولیس اس سے سب کچھ خود اگلو الے گی۔“

”نہیں... پولیس اس سے کس بنیاد پر اگلو الے گی؟ وہ صاف انکار کر دے گا۔ ہمیں سب سے پہلے تنظیم کے دفتر کا پتہ معلوم کرنا ہو گا، مگر اس کا سراغ لگانا آسان نہیں ہے۔ وہ لوگ بہت محتاط ہیں۔“ میں نے کہا۔

جی کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ ”اگر آپ نیلم کا تعاقب جاری رکھیں تو بات بن سکتی ہے۔“

”نیلم کا تعاقب...“ دوسرے ہی لمحے بات میری سمجھ میں آگئی۔ ”مگر میرے دوست صرف دفتر کا پتہ چلانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہمیں بہت سی باتیں معلوم کرنا ہوں گی۔ اس تنظیم کے ممبروں کا پتہ چلانا ہو گا۔ اس کے علاوہ ٹھوس ثبوت بھی حاصل کرنا پڑیں گے۔“

ہم سہ پہر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر کچھ منصوبے بھی بنائے۔ ایک اشتیاق اور تجسس تھا جو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ جی بھی میری طرح اس تنظیم کا کھوج لگانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا کہ اسے نیست و نابود کیا جاسکے۔ شام پانچ بجے میں اور جی ابو میاں کے پاس جا پہنچے۔ ابو میاں ضمانت پر رہا ہو کر آگئے تھے اور گھر میں موجود تھے۔ چاچی، صادق اور جنم، ان کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ابو میاں خوش ہو گئے۔ ”آؤ بیٹے، آؤ۔“ انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور بولے۔ ”بیٹا! تم نے میرے اور میری بیٹی کے لیے جو کچھ کیا، اسے میں ساری زندگی نہیں بھول سکتا۔ مجھ غریب کے پاس صرف دعائیں ہی ہیں جو تمہیں ہر لمحے دیتا رہوں گا۔“

میں نے ان کے دونوں ہاتھ اپنائیت اور محبت سے تھام کر کہا۔ ”میں نے جو کچھ کیا اسے آپ احسان کا نام نہ دیں۔ میرے لیے دعاؤں سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ ایک نیک آدمی ہر لمحے مجھے اپنی دعاؤں سے نوازتا رہے گا۔“

”جنم نے بتایا کہ تم نے اور تمہارے دوست نے اس کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈال دی تھیں۔“ ابو میاں کی آواز گلے میں رنڈھ رہی تھی۔ ”اس دنیا میں کون کسی کے لیے اپنی جان خطرہ میں ڈالتا ہے۔ اور پھر بیٹا میرا اور جنم کا تم سے رشتہ نانا ہی کیا تھا۔ نہ تم بیٹے ہو، نہ بھائی ہو، نہ خاندان کے کوئی فرد ہو اور نہ ہی ہم وطن ہو۔ مگر تم نے ہم سے ایک نہ ٹوٹنے والا پاکیزہ رشتہ قائم کر لیا۔ دنیا میں بھلا اس سے بڑا اور کونسا رشتہ ہو سکتا ہے؟“

میں اپنے دل کا راز فاش ہونے پر سٹپٹا نہیں بلکہ پر سکون لہجے میں پوچھا۔ ”تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟“

”جو محبت آشنا ہوتے ہیں وہ دلوں کا گداز آنکھوں سے پڑھ لیتے ہیں۔ محبت انسان کو بڑا حساس بنا دیتی ہے۔“

”تم سچ کہتے ہو میرے دوست!“ میری آواز میں اداسی کھل گئی۔ ”میری زندگی میں یوں تو کتنی ہی ٹوکیاں آئیں، جو حسین بھی تھیں اور پر شباب بھی، لیکن نہ تو کبھی مجھ پر ان کے حسن کا جادو چلا اور نہ ہی ان کا شباب مجھے ڈسنے میں کامیاب ہو سکا۔ ان کا حسن و جمال میرے دل کے گوشوں میں اپنے لیے کوئی جگہ بنا سکا۔ مگر خبثت... پہلی بار اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے مجھے اپنی منزل مل گئی ہے۔ میں ساحل پر پہنچ گیا ہوں۔ جیسے میں ساری زندگی اس کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ وہ ٹلی بھی تو اس لیے کہ مل کر پھجڑ جائے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ صادق کی محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ صادق کو والمانڈ انداز میں چاہتی ہے اور بچپن ہی سے اس کی محبت میں سرشار ہے۔ میں صادق کی جگہ نہیں لے سکتا، ایسا لگتا ہے، اب میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا... کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے سامنے جاکر اسے دیکھ کر اسے حاصل کرنے کے لیے میں کوئی انتہائی فیصلہ کر لوں، لہذا میں نے سوچا ہے کہ اب کبھی اس کے سامنے نہیں جاؤں گا۔“

”میں بھی آپ کو یہی مشورہ دینے والا تھا۔“ جی نے کہا۔ ”مجھے آپ کا فیصلہ سن کر خوشی ہوئی ہے۔ آپ نے بڑا دلائل مداندہ فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ آپ دونوں کے حق میں مفید ثابت ہو گا۔“

”مگر کیا میں اس فیصلے پر قائم بھی رہ سکوں گا بعض اوقات ہم جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی فیصلہ تو کر لیتے ہیں لیکن پھر اس پر قائم نہیں رہ پاتے۔“

”اگر آپ کو خبثت سے واقعی محبت ہے، اس کا مستقبل اور خوشیاں عزیز ہیں تو اس فیصلے پر قائم رہنا ہو گا۔ جن کے دلوں میں محبت کا گداز ہوتا ہے وہ محبت کا احترام بھی کرتے ہیں۔ یہ حقیقت آپ پر واضح ہو چکی ہے کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ اس کے دل میں تصور میں اور خوابوں میں کوئی اور ہی بسا ہوا ہے۔ ہم کتنی آسانی سے دوسروں کی جیبوں سے مال اڑا لیتے ہیں، اگر صادق اس کے دل کی بجائے جیب میں ہوتا تو میں پہلی فرصت میں اسے پار کر کے کسی گڑ میں پھینک دیتا اور آپ کے لیے راستہ صاف ہو جاتا۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا۔

میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

”ہاں۔ ایک صورت ہو سکتی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”وہ کیا؟“ میں چونک پڑا۔

”اگر ممکن ہو تو کسی طرح اس کا دل جیت لیجئے۔“

”دل کا سودا صرف ایک بار ہوتا ہے۔ یہ بازی ہمیشہ ایک ہی بار لگتی ہے۔ چاہے جیتو، چاہے ہارو، دوسرا موقع نہیں ملتا۔“ میں نے حتیٰ لہجے میں کہا اور چپ ہو گیا۔ جی سے ہاتھیں کر کے

میں کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر ایک نیا لقمہ نگل کر رہ جاتا۔

میں اور جی ابو میاں کے ہاں سے نکلے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ خبثت بھی دروازے تک رخصت کرنے آئی تھی۔ رخصت کرتے وقت اس کی کائنات جیسی بڑی بڑی آنکھوں میں ان گنت چراغوں کی روشنی تھی اور ہنسنے والی ہونٹوں پر مگھوٹی حسن بکھرا ہوا تھا۔ ”سکندر صاحب! آتے رہیے گا۔“ اس نے استدعا کی۔

میں نے سوچا اس سے پوچھوں کس لیے خبثت! کیا کوئی نیا زخم کھانے کے لیے... کیا تم مجھے میرے درد کی دوا دے سکتی ہو؟ دل کا ایک در بند ہوتا ہے تو سارے در بند ہو جاتے ہیں... نہیں خبثت نہیں جو در بند ہو گیا ہے اسے بند ہی رہنے دو۔ مجھے اس پر دستک دینے کے لیے مت بلاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس پر دستک دیتے دیتے پاگل ہو جاؤں اور پھر دیوانگی میں اسے توڑ ڈالوں، میں نے ایک ننگ خبثت کو آخری بار دیکھا تو اس نے گہرا کر اپنی آنکھوں اور ہلکوں کے درمیان بھی بند کر لیے، جیسے اس نے میری آنکھوں میں میرے دل کے زخموں سے رستے ہوئے لو کو دیکھ لیا ہو۔ آخر وہ عورت تھی۔ عورت جو مرد کو جتنا چھاپتی ہے اور پڑھ سکتی ہے، مرد اس کا عشر حشر بھی سمجھ نہیں سکتا۔ اس کے گلاب سے چہرے پر کرب کا ایک بادل سا آکر گزر گیا۔ اس کا جھکا ہوا سر اور چہرے کا کرب بتا رہا تھا کہ وہ ایک دور اسے پرکھڑی ہے۔ پھر میں نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا اور رکشے کی طرف بڑھ گیا۔

جی نے رکشے میں بیٹھنے کے بعد ڈرائیور کو میرے گھر کا پتہ بتایا۔ رکشا چل پڑا تو وہ مجھ سے بولا۔ ”سکندر بھائی! یہ آپ بیٹھے بیٹھے کہاں کھو جاتے ہیں۔ میں نے کئی بار محسوس کیا کہ آپ خبثت کو دیکھ کر کھو جاتے ہیں اور آپ کو یہ بھی ہوش نہیں رہتا کہ آپ کہاں بیٹھے ہیں؟“

میں خبثت کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ جی کی بات پر چونک پڑا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا کہا۔ کون کھو جاتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے؟“

”آپ!“ جی مسکرا دیا۔ ”آپ سکندر بھائی! میں نے کئی بار محسوس کیا کہ آپ خبثت کو دیکھ کر کھو جاتے تھے اور آپ کو یہ ہوش بھی نہیں رہتا تھا کہ آپ کہاں بیٹھے ہیں۔ ممکن ہے، آپ کی یہ حرکت کسی اور نے محسوس نہ کی ہو، مگر میں نے اور خبثت نے اسے ضرور محسوس کر لیا تھا۔ وہ بے چاری تو سرا سید اور پریشان سی ہوتی جا رہی تھی۔“

”شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک حسین جسم ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے سکندر بھائی!“ جی کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ ”کوئی اور بات ہے؟“

”بھلا اور کیا بات ہو سکتی ہے دوست!“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کیا وہ اتنی حسین نہیں کہ اسے بار بار دیکھا جائے؟“

”آپ!“ جی کو اپنے دل کی بات کہتے ہوئے کچھ تذبذب سا ہو رہا تھا۔ پھر اس نے کہہ ہی دیا۔ ”آپ شاید خبثت کو پسند کرنے لگے ہیں، بلکہ آپ کو اس سے محبت ہو گئی ہے۔“

علی 'نصباح ہی میری آنکھ کھل گئی مگر میں دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ نو بجے اٹھ کر میں نے غسل کیا... کپڑے تبدیل کیے۔ پھر میں نے اپنی جیب کا جائزہ لیا اور خفیہ جگہ سے مزید رقم نکال لی۔ اس کے بعد میں نے وہ خط نکالا جو انسپکٹر کی جیب سے نکلا تھا۔ اسے دو تین بار پڑھا۔ حالات کی سنگینی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ نیلم بھی اسی تنظیم سے وابستہ تھی۔ یہ تنظیم ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تلی ہوئی تھی اور ملک میں بد امنی اور انتشار پھیلانے کے لیے نوجوانوں کو استعمال کر رہی تھی۔ میں نے خط یہ کر کے خفیہ جگہ پر رکھ دیا۔

گھر سے نکل کر میں نے طلوہ پوری کی دکان کا رخ کیا۔ آج ناشتے میں طلوہ پوری کھانے کو طبیعت چاہ رہی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں چائے پیئے مہربان ہوٹل گیا اور چائے پیئے کے دوران سوچتا رہا کہ اس تنظیم تک کیسے رسائی کروں۔ میں اس تنظیم کے صرف ایک رکن سے واقف تھا۔ وہ نیلم تھی۔ مگر میں نیلم کے دشمنوں میں سے تھا اور وہ تو میری جانی دشمن بنی ہوئی تھی۔ کسی طرح تنظیم کے دفتر کا پتہ چل بھی جاتا تو وہاں قدم رکھنا گویا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا کیونکہ نیلم میرا وجود برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ نقلی انسپکٹر اور اس کے ساتھی بھی میرے صورت آشنا ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں کچھ بھی تو نہیں ہو سکتا تھا۔

رات جو میرے ذہن میں تدبیر آئی تھی، اس پر عمل کرنا فضول تھا۔ میں کوئی دوسری تدبیر سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ نیلم کا تعاقب کر کے تنظیم کے دفتر کا پتہ چلایا جائے۔ دفتر کا پتہ چلنے کے بعد پھر سوچا جاسکتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ دفعتاً مجھے اس نقلی انسپکٹر کا بھی خیال آیا۔ اگر وہ کہیں نظر آجائے تب بھی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ وہ بھی اس تنظیم کا ایک اہم رکن تھا۔ جیسی تو اس کے ذمے اتنا اہم خط پہنچانے کی ذمے داری ڈالی گئی تھی۔ اس کا نام صابر تھا۔ خط میں صابر ہی لکھا تھا۔ صابر کو کسی طرح قابو کرنے سے بھی بہت سی باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔

جیب سے برآمد ہونے والا خط کسی آسیب کی طرح میرے ذہن پر چھا گیا تھا۔ میرے وطن کی طرف ناپاک نظریں اٹھی ہوئی تھیں اور دشمن کے گھناؤنے عزائم کی بو آ رہی تھی۔ انتشار، بد امنی اور ملک ٹوٹنے کا خوف میرے اعصاب کو شکستہ کر رہا تھا۔ میں نے تہہ کر لیا کہ اس تنظیم کا قلع قمع کر کے رہوں گا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا تاکہ عقل کے پاس جاؤں، میک اپ کر کے اپنا حلیہ تبدیل کر دوں۔ اس صورت میں نیلم کا تعاقب آسانی سے کیا جاسکتا تھا۔ معاً میری نگاہ ایک شخص پر پڑی جو مجھے اپنی نظروں کی گرفت میں لیے ہوئے تھا اور میرے کھڑے ہوتے ہی وہ بھی اٹھ گیا۔ اس کا انداز مجھے بہت پر اسرار لگا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کا جائزہ لے لیا۔ وضع قطع سے وہ کوئی نمبری بد معاش لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر سفاکی چھائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں وحشتانہ چمک تھا۔ وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے کچا ہی چبا جائے گا۔

میرا جی قدرے ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ میرے گھر کے دروازے پر اتار کر جانا چاہتا تھا مگر میں چوراہے پر ہی اتر گیا تاکہ ٹھٹھا ہوا چلا جاؤں۔

اپنی گلی میں پہنچا تو غلام رسول کو بے قراری کے عالم میں ٹٹلتے ہوئے دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ لپک کر میرے پاس آگیا۔ "سکندر بھائی کہاں رہ گئے تھے۔ آپ! میں شام سے آپ کے انتظار میں ٹھل رہا ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کس لیے آیا ہے۔ اس نے میرے کمرے میں پہنچ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "یہ آپ نے کیا کیا سکندر بھائی! آپ نے پورے ایک سال کی فیس دے دی۔ لیکن سکندر بھائی! آپ نے یہ بھی سوچا کہ میں ایک غریب آدمی ہوں، اتنا بوجھ کیسے اتار سکوں گا۔ میں تو ان بنگاموں کی وجہ سے بالکل فلاش ہو گیا ہوں۔"

"اس سے آپ کا کیا تعلق ہے غلام رسول بھائی؟" میں نے مصنوعی خشکی سے کہا۔ "آپ سے کس نے کہا ہے کہ چچا اور بھتیجی کے معاملے میں دخل دیں؟"

"نہیں۔ نہیں سکندر بھائی! خدا کے لیے مجھے میری نظروں میں مت گراؤ۔ میں اس بد نصیب بچی کا باپ ہوں۔" اس نے میرے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"اور میں اس خوش نصیب بچی کا اٹکل ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا اور اس کے شانوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ "نوشین سے میرا تعلق برسوں پرانا ہے۔ اور پھر کوئی کسی پر احسان نہیں کرتا۔ یہ تو سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اگر نوشین کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ روشنی دیکھنے کے لیے مجھے کچھ مزید بھی کرنا پڑتا تو شاید میں دریغ نہ کرتا... اور ہاں۔" میں نے جیب سے تین ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ رقم البتہ قرض حسنہ ہے۔ آپ کے کاروبار کے لیے..."

غلام رسول نے ششدر ہو کر سو سو کے نوٹوں کی گڈی دیکھی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، میں نے اس سے کہا۔ "مجھے اس بھتے بڑے اچھے آرڈر ملے تھے۔ یہ رقم اس آرڈر کا کیش ہے۔" مکمل والوں میں میرے بارے میں یہ مشہور تھا کہ میں شر میں، ایک پرائیویٹ فرم کا سیکرٹری ہوں اور کمیشن پر کام کرتا ہوں۔ "آپ اس رقم سے کاروبار کریں جب کاروبار سنبھل جائے تو میری رقم لوٹا دیجئے گا۔"

غلام رسول کسی قیمت پر یہ رقم لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے زبردستی کرے سے نکالا اور اس کی ایک نہ سنی۔ پھر اسے اس کے گھر چھوڑ کر آیا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میں بستر پر لیٹا تو میرے تصور میں پھر سے خشم آکھڑی ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اب تو اس کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے۔ اب وہ کسی اور کی امانت ہے۔ کچھ دیر کی کش مکش کے بعد میں خشم کو ذہن سے جھٹک کر نیلم اور اس کی تنظیم کے بارے میں سوچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا ذہن ایک تدبیر کے گرد گھوم رہا تھا اور اس پر عمل کرنا زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔ میں اس پر دو گرام کے تانے بانے سلجھاتا ہوا سو گیا۔

بھوک چمک اٹھی تھی اور پیٹ میں آنتوں نے ایک دوسرے سے الجھنا شروع کر دیا تھا... میں زیب التنا اسٹریٹ کی طرف چل دیا اور عقب میں دیکھا تو وہ شخص میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ فاصلہ ہونے کے باوجود مجھے اس کے کڑے تیوروں اور گھورتی ہوئی آنکھوں کا احساس ہو رہا تھا۔ میں زیر لب مسکراتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

قائب اسٹیک کے سامنے پہنچ کر میں رک گیا۔ یہ ایک انٹر کنڈیشنڈ ہوٹل تھا۔ گرمی اور پسینے سے پریشان ہو کر مجھے ٹھنڈے اور فرحت بخش ماحول کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ میں دروازے میں داخل ہو گیا۔

جب میں اندر داخل ہو رہا تھا تو ایک جوڑا باہر نکل رہا تھا۔ لڑکی حسین اور پرکشش تھی۔ اس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا اور اتراٹی اتراٹی سی لگ رہی تھی۔ اس کا ساتھی بہترین سوٹ میں وجیرہ اور اسٹارٹ لگ رہا تھا... امارت اور غرور کی جھلک اس کی آنکھوں سے نمایاں تھی... یکایک لڑکی مجھ سے بچنے کے لیے تیزی سے اپنے ساتھی کی طرف سمت گئی۔ اس طرح وہ بے دھیانی میں چلنے والے ساتھی کے کندھے ٹکرائی تو وہ بوکھلا گیا۔ یوں لڑکی سیدھی میرے کندھے سے آٹکرائی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے جلدی سے رخ پھیر لیا ورنہ شاید... جی ہاں ہم غالباً "معاقدہ کر رہے ہوتے۔" مرد سوچے سمجھے بغیر مجھ پر چڑھ دوڑا۔ "اندھے ہو،" دیکھ کر نہیں چلتے۔" وہ غرایا۔

"دیکھ کر چلنا بعض اوقات زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔" میں نے معنی خیر لہجے میں کہا۔ "وہاں..." وہ دہاڑا۔ "ہم تم جیسے بد معاشوں کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔" وہ بالکل سی سنک گیا۔

"دیکھئے محترم۔" میں نے قدرے نرمی اختیار کر لی۔ "جو کچھ ہوا، محض اتفاقاً" ہی ہوا ہے۔ آخر اس میں چراغ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی۔"

میں نے اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ اس کے ساتھ ایک خاتون تھی۔ شرفاء عموماً "خواتین کی موجودگی میں مبروہ قتل کا دامن تھام لیتے ہیں لیکن وہ شخص غالباً" اس معمولی سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنانے پر قتل گیا تھا۔ میری نرم گفتاری نے شاید اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا ناؤ اور گریبان پکڑ لیا۔ "ذلیل،" کہنے میں تمہارا ماغ درست کر دوں گا۔" وہ بری طرح دہاڑنے لگا۔

اس کا ہاتھ اپنے گریبان پر دیکھ کر میری رگوں میں بھی خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میں نے بھی اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور پھر میرے فنکار ہاتھوں نے فوراً ہی اپنا کام سرانجام دے ڈالا۔

ایک ہاتھ اس کے جڑے پر پڑا۔ دوسرا ہاتھ اس کے کوٹ کی اندرونی جیب سے ہوا نکال لایا۔ میرا ہاتھ جیسے ہی اس کے جڑے پر پڑا وہ ہلکا کر رہ گیا۔ اس نے جواباً "حملہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا تھا کہ میں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کے پیٹ میں مکا دے مارا۔ اس نے میرا

میں نے ہوٹل سے نکل کر ایک قریبی بک اسٹال پر کھڑے ہو کر اپنا ٹھک دور کرنے کے لیے پلٹ کر دیکھا تو اسے اپنے تعاقب میں پایا۔ وہ ایک پان کی دکان پر کھڑا مخالف سمت میں دیکھ کر یہ تاثر دے رہا تھا کہ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے ایک خالی رکشا روکا اور اس میں سوار ہو گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ ایک خالی ٹیکسی روک کر ڈرائیور سے بات کر رہا تھا۔ ڈرائیور شاید آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ پھر شاید اس نے اسے کچھ لالچ دے کر تیار کر لیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ ٹیکسی کسی قدر فاصلے پر میرا تعاقب کر رہی تھی۔

مجھے گویا ایک تفریح ہاتھ آگئی۔ میں نے رکشا ڈرائیور کو آواز پورٹ چلنے کو کہا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا کیونکہ میں نے اس سے صدر چلنے کے لیے کہا تھا۔ لیکن اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ایک لمبی مسافت کا مسافر مل گیا تھا۔ آواز پورٹ پہنچ کر میں نے اس سے کلفٹن چلنے کے لیے کہا۔ کلفٹن سے کیما ڈی، ٹیکسی مسلسل میرے تعاقب میں تھی۔ میں انجان اور بے پروا بنا بیٹھا تھا۔ اور دل ہی دل میں ہنس بھی رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا کہ اسے نیلم ہی نے میرے تعاقب میں بھیجا ہے۔ وہ مجھے خوفزدہ اور ہراساں کر کے اپنی رقم وصول کرنا چاہتی تھی یا پھر کوئی دوسرا مقصد رہا ہو گا۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ وہ کتنی دیر تک میرا تعاقب جاری رکھتا ہے۔ ایک طرح سے میں اسے تعاقب کا مزا چکھانا چاہتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ شخص ٹیکسی میں بیٹھا جھنجھلا رہا ہو گا اور بری طرح پیچ و تاب بھی کھا رہا ہو گا۔ ٹیکسی کے میٹر کے ساتھ ساتھ اس کا پارہ بھی چڑھ رہا ہو گا۔ ادھر میرا رکشہ والا الگ پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ادھر ادھر مارا مارا کیوں پھر رہا ہوں۔ اسے شاید یہ گمان ہوا ہو کہ میں کوئی خبیثی ہوں۔ بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ "بھائی صاحب! یہ آپ بلا مقصد ادھر ادھر کیوں گھوم رہے ہیں؟"

"میں چیچا وطنی سے آیا ہوں۔ کراچی شہر کی بڑی تعریف سنی تھی، اس لیے گھوم پھر کر دیکھ رہا ہوں۔"

میں نے دوبار رکشہ والے کو رکوا کر لسی اور سیون اپ کی بوتل پلائی، تمباکو کے پان بھی کھلائے۔ اس دوران ٹیکسی ذرا سے فاصلے پر رکی تھی۔ تعاقب کرنے والا ٹیکسی میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ٹیکسی کے قریب جا کر اس کے چہرے کا جغرافیہ دیکھوں۔ میری اس حرکت سے اس پر کیا بیت رہی ہے۔ مگر میں نے اپنی اس خواہش کو بری طرح کچل دیا۔

صدر پہنچ کر میں نے رکشا چھوڑ دیا۔ میٹر سے پچاس روپے زیادہ دیے تو ڈرائیور خوش ہو گیا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مجھے سلام کیا اور رخصت ہوتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ کو پھر کبھی سیر کرنی ہو تو کوثر نیازی کالونی میں آکر گل زمان ہوٹل والے سے بہادر خان کا پوچھ لیں۔ میرا نام بہادر خان ہے۔ میں بیس سال سے رکشا چلا رہا ہوں۔"

دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔

چار گھنٹے مسلسل رکشے کا سفر چار گھنٹوں کی گھڑ سواری کے مترادف تھا۔ جو لوگ کراچی کی سڑکوں پر رکشے کا سفر کر چکے ہیں، وہ یقیناً میری اس بات سے اتفاق کریں گے... بہر حال، میری

کے طور پر اڑا لیا تھا۔ ٹوائیلٹ میں میں پہنچ کر جیب سے بڑا نکالا۔ بڑا ہی نرم و نازک سیاہ رنگ کا چرمی بڑا تھا۔ میں نے زپ ہٹائی اور بونے کا منہ کھول کر اندر جھانکا تو میرا رواں رواں خوشی سے جموم گیا۔ بونے میں سو سو کے نوٹوں کی ایک نئی پتلی سی گڈی موجود تھی۔ میں نے اسے باہر نکال کر دیکھا تو وہ تعداد میں پچاس تھے۔ اس کے علاوہ پچاس کے تین 'دس' کے پانچ اور پانچ والے چھ نوٹ بھی تھے۔ چار چھ ورنینگ کارڈ بھی تھے۔ پرس پھینکنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ میں نے دل پر جبر کر کے فٹش کی فٹش کا ڈھکنا اٹھایا اور بڑا اس میں ڈال دیا۔

میں نے سو سو کے نوٹوں کی گڈی کی پین اندر دبا دی تاکہ پیر میں نہ چھپے پھر اسے موزے میں رکھ لیا اور شلوار کا پانچہ ٹھیک کر لیا۔ باقی رقم میں نے قمیص کی جیب میں رکھ لی۔ پھر ہال میں آکر میز کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا تو میری نظریں اس شخص کو بھی ڈھونڈ رہی تھیں جو میرے تعاقب میں تھا۔ ہال میں ملگنی سی روشنی تھی مگر چہرے نظر آرہے تھے۔ وہ خوف ناک چہرہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ گویا وہ شخص اندر نہیں آیا تھا اور باہر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں کارز ٹیبل کی طرف بڑھ گیا جس کے قریب اور دو تین میزیں بھی خالی پڑی تھیں۔ وینر آیا تو میں نے اسے انتہائی پر تکلف کھانے کا آرڈر دیا۔

میرا آرڈر پیڈ پر نوٹ کر کے اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ "باہر میرا ایک دوست کھڑا ہے" اسے بلا لاؤ۔ کتا" سکندر بلا رہا ہے۔" میں نے ایسے پانچ روپے کا نوٹ دیتے ہوئے اس کا حلیہ بتایا اور اس نوٹ نے اس پر بجلی کا سا اثر کیا۔ اس نے کچن جاکر آرڈر بتایا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

چند منٹ بعد وینر آیا تو اس کے پیچھے پیچھے میرا دشمن بھی تھا۔ اس کے چہرے اور سرخ سرخ آنکھوں میں شدید حیرانی کے آثار تھے۔ جیسے 'اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ میں نے ہی اسے بلایا ہے۔ وہ میری میز کے پاس پہنچ کر رکا تو میں نے مسکراتے ہوئے استنبال کیا۔ "آؤ بیٹو، تم تھک گئے ہو گے، کچھ دیر سناؤ۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرے دوستانہ رویے نے ایسے مزید حیران کر دیا اور اس کی آواز گویا حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی ہو۔ وہ کرنسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا تو میں نے ٹھنڈے پانی کے لبریز گلاس کی طرف اشارہ کر دیا۔ "پانی پیو یار۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ "ٹھنڈا پانی غصے کے لیے ہی نہیں حیرت دور کرنے کے لیے بھی اکیر ہے۔"

اسے واقعی سخت پیاس لگ رہی تھی۔ ویسے بھی اس نے میرے تعاقب کے دوران کچھ کھایا یا نہیں تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ جب اس نے دوسرے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کی راہ میں میرا ہاتھ حائل ہو گیا۔ "پانی سے پیٹ بھر لو گے تو کھاؤ گے کیا؟ میں نے تمہارے لیے بھی کھانا منگوایا ہے۔"

"میرے لیے کھانا...؟" اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھا۔ جیب سے ایک میلا سا رومال نکال کر چہرے سے پیندہ پونچھا۔ "تم مجھے جانتے ہو کیا؟" اس کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

گربان چھوڑ دیا اور پیٹ پکڑ کر اپنے لگاؤ میں نے اس کے ایک لات بھی جڑ دی۔ اس رنگین تھکی کا چہرہ اتر گیا۔ اسے شاید توقع نہیں تھی کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔

یہ ہنگامہ ریستوران کے ہال کے دروازے پر ہوا تھا۔ اندر بست سی میزیں بھری ہوئی تھیں۔ قریبی میز سے ایک شخص اٹھ کر ہمارے قریب آیا۔ وہ بے حد سنجیدہ اور پروقار نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں عقاب جیسی تھیں۔ اس کی وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ کوئی اعلیٰ افسر ہے۔ اس دوران وہ رنگین تھکی مجھ پر برس پڑی۔ "میں تمہیں سمجھ لوں گی۔ ایک تو تم نے میرے ساتھ بدتمیزی کی، دوسرے میرے شوہر کو مارا۔ میں تمہیں ابھی کھسک اپ کرادوں گی۔"

"میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ تم اپنے شوہر کے کندھے سے ٹکرا کر مجھ سے ٹکرائی تھیں۔" میں نے بھی تند لہجے میں جواب دیا۔ "تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ پہلے کس نے بدتمیزی کی اور گالیاں دیں۔ جو دوسروں کی عزت نہیں کرتا اس کی کوئی بھی عزت نہیں کرتا۔ کھسک اپ کرانے کی حسرت ہے تو وہ بھی پوری کرلو۔"

"پلیز... پلیز..." اس سنجیدہ شخص نے درمیان میں آکر کہا۔ "اس جھگڑے کو ختم کر دیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ بات آگے نہ بڑھائیں۔"

عورت کا شوہر سنبھل کر کھڑا ہو گیا مگر اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے اور وہ اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کرسی کا سارا لے کر کراہتے ہوئے کہا۔ "یہ جھگڑا یوں آسانی سے ختم نہیں ہو سکتا۔ میں اس ڈفر کو چھوڑوں گا نہیں۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے، میری توہین کی ہے اور مجھے گالیاں دی ہیں۔"

"گالیاں انہوں نے نہیں آپ نے دی ہیں۔" اس شخص نے مداخلت کی۔ "انہوں نے آپ کی میز کے ساتھ غلط حرکت بھی نہیں کی۔ میں دیکھ رہا تھا۔ میرے ساتھی بھی اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ آپ کی میز ہی ان سے ٹکرائی تھیں۔ آپ ایک شریف آدمی ہو کر دوسرے شریف آدمی سے اس طرح پیش آرہے ہیں۔"

"آپ... آپ بلا وجہ اس شخص کی حمایت کر رہے ہیں۔" عورت ٹٹک کر بولی۔ "آپ اسے شریف آدمی کہہ رہے ہیں جس نے میرے شوہر پر ہاتھ اٹھایا ہے۔"

"تو کیا شریف آدمی، دوسروں کے گربان پر ہاتھ ڈالنے والے کو کہیں گے...؟ بہتر ہے آپ بات ختم کر دیں۔ بات بڑھانے سے آپ کو ندامت اور پریشانی اٹھانا پڑے گی۔ اشتعال انگیزی سے کوئی فائدہ نہیں۔ پلیز، آپ اپنے شوہر کو باہر لے جائیں۔"

چارو نا چاروہ بد مزاج محترمہ اپنے خردماغ شوہر کا بازو پکڑ کر اسے باہر لے گئیں۔ میں نے اس مہربان شخص سے مصافحہ کر کے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا۔ "کوئی بات نہیں، مسز، غلطی انہی دونوں کی تھی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے سیدھا ہاتھ روم کی طرف چلا گیا۔ مجھے فوری طور پر اس بونے سے نجات حاصل کرنا تھی جو میں نے اس جھگڑے کے ہر جانے

اعصاب کا انتشار بڑی حد تک قابو میں آگیا۔ کھانے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اس دوران میں گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتا رہا تھا۔

وہ مضبوط ہاتھ پیروں والا ایک خونخوار آدمی تھا... اس کے ہونٹوں اور چہرے کی ساخت سے سفاکی جھلک رہی تھی لیکن آنکھیں... گہری سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سا دکھ گھلا ہوا تھا۔

”چائے منگواؤں؟“ میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں... کھانے کے بعد چائے نہیں پیتا۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر قبل وہ جتنا احمق اور سادہ لوح نظر آ رہا تھا اب ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ بھوک نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ نہ جانے کب سے اسے غذا میسر نہیں آئی تھی۔ میری سوالیہ نگاہوں کے جواب میں بالآخر وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔

”تمہارا دھندا کیا؟“ اس نے دریافت کیا۔

میں ایک کمیشن ایجنٹ ہوں۔“

”کس قسم کا کام ہے؟“ اس کی آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ ”غیر قانونی؟“

”ارے نہیں۔“ میں ہنس پڑا۔ ”میں اپنا کام قانونی سمجھ کر ہی کرتا ہوں۔“

”تم مجھے معقول آدمی لگتے ہو۔“

”شکریہ۔ تمہارے بارے میں میری بھی یہی رائے ہے۔“ میں نے کہا۔

”تمہاری رائے غلط ہے۔“ اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ ”تم نوجوان ہو۔ میرا چھوٹا بھائی

بالکل تمہاری ہی عمر کا ہے۔“ اس کے لہجے میں کرب کی آمیزش محسوس ہونے لگی۔ جس سے اندازہ

ہوا کہ اپنے چھوٹے بھائی کے سلسلے میں اسے کوئی گمراہ صدمہ پہنچا ہے، ممکن ہے وہ مرچکا ہو... یا پھر

شاید قریب المرگ ہو... میرا پہلا خیال غلط تھا کیونکہ اس نے اپنے بھائی کا تذکرہ ماضی کے نہیں بلکہ

حال کے صبیغے میں کیا تھا۔ پھر یقینی طور پر دوسری ہی بات تھی۔

”تم مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھ سکتے ہو۔“ میں نے زیر لب کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا ”پہلے تمہاری

زندگی خطرے میں تھی۔ لیکن اب میری زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ میں ایک غلط فہمی میں

اندھ چلا آیا تھا، ورنہ شاید...“

”بیٹھ جاؤ، دوست۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اگر ہم دونوں کی زندگی خطرے میں ہے

تو ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہیے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک اس نے چونک کر میری طرف

دیکھا۔ میری آنکھوں میں یقیناً اس وقت سفاکی کی جھلک نظر آئی ہو گی اس کے رخساروں پر ہلکی سی

زردی نظر آنے لگی۔ میرے دونوں ہاتھ میز کے نیچے تھے۔

”تم اس وقت میرے چاقو کی نوک پر ہو۔“ میں نے دھتے دھتے سر ہلایا۔ ”اگر یہ

”نہیں...“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مگر جاننا ضرور چاہتا ہوں، کیونکہ تم تقریباً چار

پانچ گھنٹوں سے مجھ میں دلچسپی لے رہے ہو۔“

”اچھا تو تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ میں تمہارے تعاقب میں ہوں؟“ اس نے متعجب ہو کر

پوچھا۔ ”شاید اسی لیے تم رکشے میں بیٹھ کر سڑکوں پر گھومتے رہے ہو۔“

”تم نے بڑے بھونڈے انداز میں میرا تعاقب کیا تھا، تعاقب کرنا بھی ایک فن ہے اور تم

اس سے ناواقف ہو۔“

”تم کسی لومڑی کی طرح چالاک اور ہوشیار ہو۔“ اس نے مجھے، جیسے خراج تحسین پیش کیا۔

”... تم نے کسی بھی لمحے مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ تمہیں اس تعاقب کا احساس ہو گیا ہے۔“

”چھوڑو ان باتوں کو۔“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”جس طرح کھیل کے مقابلے میں لڑنے

کا وقفہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اس مقابلے میں بھی لڑنے کا وقفہ ہوا ہے یا پھر اسے عارضی صلح بندی سمجھ

لو۔ تم مجھ سے واقف ہو لیکن میں تم سے ناواقف ہوں۔ اب ذرا تفصیلی تعارف ہو جانا چاہیے۔“

”میں تمہارے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمہارا نام سکندر ہے... میرے بارے

میں جان کر کیا کرو گے۔ اس سے تمہیں کچھ حاصل نہ ہو گا۔ میرے ذمے جو کام لگایا گیا ہے اسے ہر

قیمت پر انجام دینا ہے۔“

اس کا آخری جملہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ”اگر تم مجھے اپنے بارے

میں نہیں بتانا چاہتے تو شوق سے مت بتاؤ، لیکن یہ تو بتا دو کہ تمہیں میرے پیچھے کس نے لگایا ہے۔ کیا

نیلیم اتنی ہی بے وقوف لڑکی ہے؟“

”کون نیلیم...“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا... ”غلط فہمی ہوئی ہے مجھے کسی نیلیم

نے تمہارے تعاقب میں نہیں بھیجا۔“

ویٹر کھانا لے کر آگیا تو ہم نے خاموشی اختیار کر لی۔ ویٹر میز پر برتن لگا رہا تھا تو اس نے

حیرت سے ان کھانوں کو دیکھا۔ جس سے مجھے اس کی حیثیت کا اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہ

ہوئی۔ شاید اسے اب تک کی زندگی میں پہلے کبھی ایسا پر تکلف کھانا نصیب نہیں ہوا تھا۔

ویٹر چلا گیا تو میں نے پوچھا۔ ”مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم چاہتے کیا ہو؟ کس لیے میرا تعاقب

کر رہے ہو؟“

وہ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”میں صرف تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں، اور کچھ نہیں۔“

”اگر تم میری مدد کرنا چاہتے ہو تو خاموش رہو۔“ یہ کہہ کر وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو

گیا۔

میں بھی کھانے لگا۔ مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ وہ بھوکا ہے اور اس وقت تک کچھ نہیں بولے

گا جب تک اس کے منہ میں لقمے کا گداز ہے۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ اڑکنڈیشہ ہال کے ٹھنڈے

ماحول نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی تیزی سکون آشنا ہو گئی اور

کردوں گا۔ اس کی بجائے میں تمہیں اپنا فرض پورا کر کے ان لوگوں کی نظروں میں سرخرو ہونے کا موقع دوں گا۔

”جانتے ہو میرا فرض کیا ہے؟“ اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

”زیادہ سے زیادہ میری موت۔“ میں نے خود کو داؤ پر لگا دیا۔ میں پاکٹ مار ہی نہیں ایک جواری بھی تھا۔ اس لیے اتنا بڑا داؤ لگانا میری فطرت کے عین مطابق تھا۔ اب مجھے نتیجے کا انتظار تھا جو ہر حال خاطر خواہ ہی نکلا۔

”تم اپنی زندگی داؤ پر لگا رہے ہو۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”حالانکہ زندگی اور موت کے اس کھیل میں لوگ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتا پسند کرتے ہیں۔“

”زندگی اگر کسی کے کام آجائے تو میں اس کی کبھی پروا نہیں کرتا۔“ میں نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور چوٹ لگائی۔ ”میں سمجھ چکا ہوں کہ تم ایک اچھے آدمی ہو اور حالات نے تمہیں اس راہ پر ڈال دیا ہے... لیکن تمہارے ہم سفر قابل اعتماد نہیں ہیں۔ وہ کام نکل جانے پر تمہیں بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔ اب اس کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میری باتوں سے وہ قدرے مطمئن ہو گیا تھا اس لیے خود کو بچانے کے لیے میرا دست تعاون قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ ”تاؤ تم کیا چاہتے ہو؟“

”سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہارے ذمے کیا کام لگایا گیا تھا؟“

”کسی ویران جگہ تمہیں گھیر کر بے بس کرنا اور تم سے یہ اگھوٹا لاکھ روپے کمان ہیں؟“ اس نے آہستہ آہستہ اگل ہی دیا۔

”لیکن کچھ دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ نیلم تمہارے لیے اجنبی ہے۔“

”وہ اب بھی میرے لیے اجنبی ہی ہے۔“

”گویا تمہیں کسی اور نے اس کام پر لگایا تھا؟“

”ہاں...“ اس نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

”کیا وہی شخص جو چند لمحے پہلے اس ریستوران میں داخل ہوا ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”بہت خوب۔“ میں نے کہا۔ ”اور اس سارے کام کا تمہیں کیا معاوضہ ملتا؟“

”پچیس ہزار روپے۔“

”اور اس رقم کی تمہیں کسی خاص مقصد کے لیے ضرورت ہے؟“

”ہاں... میرا بھائی زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اس کا آپریشن ہونے والا

ہے۔“ اس کے لیے میں کرب جھٹک آیا۔

”تمہارے پاس چاقو تو ہو گا؟“

نوک تمہاری ران کے گوشت میں پیوست ہو گئی تو تم ایک لمحے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکو گے۔

اس چاقو کا بلبلہ زہر آلود ہے...“

وہ کسی تنگی مجھے کی طرح ساکت و جامد کھڑا رہا۔ میں نے کن آنکھوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ قریب کی میزیں اب بھی خالی تھیں اور نیم تاریک ماحول میرے لیے... بے حد معاون ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ پر سکون تھیں جب کہ ساکن سینہ بتا رہا تھا کہ اس کی سانس سینے میں رک گئی ہے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ میں نے دھیمی غراہٹ سے کہا۔

وہ آہستہ آہستہ یوں بیٹھ گیا جیسے کسی غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے۔

میرا چاقو والا ہاتھ حرکت میں آیا اور چاقو کی نوک اس کی ران پر کچھ اوپر ایک جگہ جم گئی۔

”یہ ہال کا ایک نسبتاً تاریک گوشہ ہے۔ تم اسی طرح ساکت بیٹھے رہ جاؤ گے اور میں یہاں سے بہت دور جا چکا ہوں گا تب ہی کسی کو معلوم ہو گا کہ تم مر چکے ہو۔“ میں نے دہشت کا تاثر شدید تر کرنے کے لیے کہا۔

وہ خاموشی سے مجھے گھورنے لگا۔

”تم شاید اس غلط فہمی میں اندر آ گئے تھے کہ تمہارے ہی کسی ساتھی نے تمہیں اندر بلایا ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ہر حال میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم دہشت زدہ نہیں ہو۔ گویا تم ایک دلیر آدمی ہو۔“

”میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن ابھی کچھ دن مرنا نہیں چاہتا۔“

”موت انسان کی خواہش سے بے نیاز ہے۔“

اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر اس کی نگاہ دروازے پر جم گئی۔ تب میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں دیکھیں۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ایک شخص ہال میں داخل ہوا تھا اور وہ بائیں جانب کی ایک میز کی طرف جا رہا تھا۔ اس وقت میری طرف اس کی پشت تھی، اس لیے میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا... لیکن میرے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی دہشت زدہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ یقیناً وہی آدمی ہے جس سے اسے اپنی زندگی کا خطرہ لاحق رہا ہو گا۔

”گویا اب تم دو طرف سے موت کے زرخے میں ہو۔“ میں نے تبصرہ کیا۔ ”تمہیں میرے پاس بیٹھے دیکھ لیا گیا ہے اس لیے کوئی بھی تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کرے گا۔“

اس نے تھوک نکلا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”بادشاہ خان...“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

”میں تمہارے سامنے ایک تجویز رکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ چونک کر میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ ”اگرچہ تم میری زد میں ہو اور میں آسانی سے تمہیں ٹھکانے لگا سکتا ہوں... لیکن میں ایسا نہیں

سے نکل کر ایک موٹر سائیکل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو منگھو پیر روڑ کی طرف چلنے کے لیے کہا اور دھیمی آواز میں بادشاہ خان سے باتیں کرنے لگا۔
”کیا تم جانتے ہو کہ یہ کون لوگ ہیں اور درحقیقت ان کے مقاصد کیا ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”یہ ایک انقلابی جماعت ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔“
”گویا تم نیلیم کو نہیں جانتے۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے تفصیل سے نیلیم کا حلیہ بتا دیا۔ وہاں بہت سی لڑکیاں آتی ہیں مگر میں نے اس حلیے کی کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔“
”بادشاہ خان!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ ملک دشمن تنظیم ہے اور اس کے عزائم بے حد خطرناک ہیں۔ میں اس تنظیم کے پرچے اڑا دیتا چاہتا ہوں۔ سمجھ گئے؟... اور اس سلسلے میں مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔“
”میں جو کچھ کر سکتا ہوں، ضرور کروں گا۔“

”تمہارا یہ احسان صرف مجھ پر ہی نہیں بلکہ وطن عزیز پر بھی ہو گا۔“ میں نے پر جوش ہو کر کہا۔ ”اس کے کارکنوں کا سراغ لگانے میں میری مدد کرو تو میرا کام بہت آسان ہو جائے گا۔“
”آج جمعرات ہے۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اتوار کی شب آٹھ بجے میرے گھر آجانا۔ میں تمہیں کچھ لوگوں کی تصویریں اور پتے دے دوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے بغدادی میں واقع اپنے گھر کا پتہ مجھے ذہن نشین کروا دیا۔

ٹیکسی منگھو پیر کی پہاڑیوں کے قریب پہنچ رہی تھی۔ میں نے ایک جگہ، سڑک پر ٹیکسی رٹوائی اور کرایہ دے کر اسے رخصت کر دیا۔ میں نے عقب میں دیکھا۔ دور دور تک سڑک خالی تھی۔ وہ موٹر سائیکل سوار کیس دیکھائی نہیں دے رہا تھا۔
میں بادشاہ خان کے ساتھ پہاڑیوں کی طرف چل دیا۔

معاملے کو حقیقت کا رنگ دینے اور صورت حال کو سنگین بنانے کے لیے بادشاہ خان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا اور اس کی نوک میری پشت سے لگا دی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھے ایک خاص سمت میں چلنے پر مجبور کر رہا ہو۔ یہ ڈرامے بازی محض اس لیے ہو رہی تھی کہ تعاقب میں آنے والا اگر اب بھی کہیں سے چھپ کر نگرانی کر رہا ہو تو مطمئن ہو جائے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں قطعی پس و پیش نہیں تھا کہ نیلیم بے حد منظم اور طاقت ور ہے۔ انہوں نے بادشاہ خان کو میرے انجرجبر ڈھیلے کرنے پر ہی مامور نہیں کیا تھا بلکہ اپنا ایک آدمی، بادشاہ خان کے تعاقب میں بھی لگا دیا تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تعاقب کا وہ سلسلہ کہاں ختم ہوتا۔

بادشاہ خان مجھے دھکیلتا ہوا پہاڑی کے اوپری حصے پر پہنچ گیا۔ وہاں ایک قدرتی طور پر ہموار جگہ تھی۔ یہ پلیٹ فارم نما حصہ گلفام آباد کی تقریباً ”سیدھ“ میں واقع تھا۔ وہاں سے گلفام آباد کی کچی کچی جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

”مجھے وہ جگہ بتا دو، جہاں تم نے چھ لاکھ رکھے ہیں۔“ بادشاہ خان نے بے حد سفاکی سے

اس نے تائید میں سر ہلایا۔ اس کی حالت اب کسی معمول جیسی تھی۔ میں جو کچھ کہتا جا رہا تھا، وہ اس پر بے چون و چرا سر ہلاتا جا رہا تھا۔

”کیا یہ تمہاری زندگی کا پہلا کام ہے؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔
”دوسرا...“ وہ تھوک نکل کر بولا۔ ”اگر میں پہلے کام میں ہاتھ نہ ڈالتا تو شاید دوسرے کام کے لیے کبھی تیار نہ ہوتا۔“

”دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ انسان اور حالات میں ایک دوسرے کو بے بس کرنے کی یہ جدوجہد بہت پرانی ہے۔ میرا خیال ہے پہلے کام کے حوالے سے تمہیں بلیک میل بھی کیا جا رہا ہو گا؟“

اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

”ٹھیک ہے، بادشاہ خان۔“ میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”ہم یہاں سے نکلیں گے اور سیدھے منگھو پیر روڑ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ دونوں ایک ساتھ چلیں گے۔ اس طرح تمہارا وہ نام نہاد آقا یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ تم مجھے بلا پھسلا کر کسی ویرانے کی طرف لے جا رہے ہو۔ اس طرح تمہیں بعد میں اپنی پوزیشن صاف کرنے میں آسانی رہے گی۔“

”وہاں جا کر کیا کرو گے؟ شاید وہ ہمارا پیچھا کرے۔“

”مجھے زخمی کر دینا اور ان کی نظروں میں سرخرو ہو جانا۔“

”لیکن وہ چھ لاکھ روپے؟“

”کہہ دینا کہ تشدد کے باوجود مجھ سے اگلوآنے میں ناکام رہے ہو۔“

”ہوں...“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”اچھا لیکن اس طرح وہ مطمئن نہیں ہوں گے... پھر شاید کسی اور کو تمہارے پیچھے لگا دیا جائے۔“

”میں جانتا ہوں کہ بات بہت بڑھ چکی ہے اور اس کا فیصلہ اب بہت دور جا کر کسی مقام پر ہو گا لیکن تم میری فکر نہ کرو۔ نہ تو میری لاش پر کوئی رونے والا اس دنیا میں موجود ہے اور نہ ہی اس زندگی میں کوئی میرے لیے دیدہ و دل فرس راہ کیے بیٹھا ہے۔ فی الحال تمہاری پوزیشن صاف کرنے کا مسئلہ ہے۔ اس کے بعد جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔“

میں نے ویز کو بل لانے کا اشارہ کیا۔

بل ادا کر کے ہم اٹھ گئے۔

میں دروازے کی طرف بڑھ گیا تو وہ میرے ساتھ تھا۔ اس نے دروازے کے قریب پہنچنے کے بعد ہال کے اس گوشے کی طرف دیکھا، جہاں وہ شخص بیٹھا تھا، نئے دیکھ کر بادشاہ خان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ سے مخصوص اشارہ کیا جیسے اس شخص کو جتنا چاہتا ہو کہ سب کچھ توقع کے مطابق ہو رہا ہے اور اسے بے فکر رہنا چاہیے۔

باہر آکر میں نے ایک ٹیکسی روکی اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

میں نے کن انکھیوں سے ریستوران کے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہی شخص دروازے

بادشاہ خان کا دوسرا دار میں نے خالی جانے دیا، پھر اس کی کلائی پکڑ کر جھکا مارا، اس نے چاقو پر گرفت ڈھیلی کر دی، نتیجہ "چاقو اڑتا ہوا نشیب میں جاگرا اور نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے زور لگا کر بادشاہ کو اچھال پھینکا۔ اس نے گرتے ہی سنبھالا لیا اور ایک بڑا سا پتھر مجھ پر کھینچ مارا۔ میں نے جھکائی دی تو پتھر نشیب میں چلا گیا۔ پھر جو ابا" میں نے ایک بڑا پتھر اٹھایا اور بادشاہ خان پر چلانے کی بجائے دائیں جانب اچھال دیا۔ کیونکہ مجھے اس طرف ایک سائے کی جھلک دکھائی دے گئی تھی۔ اتفاق سے نشانہ ٹھیک بیٹھا اور اس طرف سے ایک دلدوز جیج سنائی دی۔

اس طرف دوڑ پڑنے سے پیشتر میں نے بادشاہ خان کے قریب پہنچ کر اس کی کپٹی پر ایک بھرپور ہاتھ رسید کر دیا۔ بادشاہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے اس کے حلق سے ایک بے معنی آواز نکلی اور وہ دہرا ہو گیا۔ اس کی حیرت بجا تھی، اس لیے کہ یہ حصہ اس کے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ اس کے دہرا ہوتے ہی میں نے اس کی گدی پر تابو توڑ دو چار کے اور رسید کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے زمین چاٹنا پڑی۔ زمین پر گرتے ہی اسے دم سادھ لینے میں اپنی عافیت نظر آئی۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی چکا تھا کہ میں اسے بے بس دیکھنا چاہتا ہوں۔

اس طرف سے فارغ ہو کر میں نے چھلانگیں لگائیں اور دائیں جانب کے اس نشیب کی طرف بڑھا جا کر اسے راکو من کی چیخ سنائی دی تھی۔ وہ ایک تنگ سادہ تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو مجھے وہاں کچھ نہ ملا، جب کہ میں بے ہوش راکو من کی توقع کر رہا تھا۔ پتھر کھا کر گرتے تو میں نے اسے دیکھا تھا سرعت سے میرے ذہن میں خیال آیا کہ ممکن ہے، اس نے مجھے ڈاج دیا ہو۔ اگر ایسا تھا تو لازماً "اب میں ایک حقیقی اور جان لیوا خطرے سے دو چار تھا۔

یہ تو طے تھا کہ تنظیم کے لڑاکے میری جان نہیں لیں گے۔ کیوں کہ اس صورت میں وہ چھ لاکھ روپوں سے محروم ہو جاتے جو ان کی دانست میں میری تحویل میں تھے۔ جب کہ مجھ پر تشدد کرنے یا مجھے اپاہج کرنے کے بعد وہ میری زبان سے کچھ اگوانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ میں دائیں جانب دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ عقب سے آواز آئی۔ "ٹھہرو..." میں ٹھک کر رہ گیا۔

"اب میری طرف مڑو۔" وہی گونج دار اور ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی۔ "مگر ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ میں زمین کھود کر تمہیں یہیں گاڑ دوں گا۔"

میں اس کی طرف مڑا۔ اسے دیکھ کر میرے جسم میں ایک سردی لہر دوڑتی چلی گئی۔ اس کا چہرہ، داڑھی مونچھوں سے عاری اور جسم کسی گیندے کی طرح ٹھوس تھا... نائب اسٹیک میں روشنی کی کمی کے باعث میں اس کا صحیح طور پر جائزہ نہیں لے سکا تھا۔ اب اسے دیکھ کر روح فنا ہو رہی تھی۔ قد و قامت میں وہ مجھ سے ٹکنا ہوا تھا۔ اس نے کاڈرائے کی پتلون اور آدمی آستین کی جرسی پہن رکھی تھی۔ اس لیے مجھے اس کے بازو کی پھلیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے بائیں ہاتھ میں لمبی نال کا ایک ریوالتور دبا ہوا تھا، جس کا رخ ظاہر ہے کہ میری ہی طرف تھا۔

ریوالتور کی نال چمک دار تھی اس لیے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی اس سے منعکس ہو

کہا۔

"ورنہ؟" میں نے منہ نہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ جویشن غیر حقیقی تھی اور مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی قلم کی شوٹنگ میں حصہ لے رہا ہوں۔

"ورنہ میں تمہارے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دوں گا۔" وہ غرایا۔

"مجھے منظور ہے مگر دل کبھی تم میرے لیے چھوڑ دینا کیونکہ یہ دونوں چیزیں مجھے بہت پسند ہیں۔"

"بکواس بند کرو خانہ خراب کا بچہ۔" وہ دہاڑ کر بولا۔ پھر کینہ توڑ نگاہوں سے دیکھتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ تعاقب میں آنے والا دکھائی دے جاتا تو سب سے پہلے اسی سے نمٹ لیتا تاکہ بادشاہ کو چاقو ہاتھ میں لے کر اداکاری نہ کرنا پڑتی اور مجھے تاثر نہ دینا پڑتا جیسے خوف کے مارے میرا دم نکلا جا رہا ہو۔

بادشاہ خان حلق سے ایک وحیانہ آواز نکالتا ہوا میرے قریب آیا پھر اس نے قضا میں چاقو سے ایک خوف ناک قوس بنائی جیسے ایک ہی وار میں میری انتڑیاں نکال پھینکنا چاہتا ہو۔ میں نے پھرتی سے دائیں جانب چھلانگ لگاتے ہوئے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔

"سکندر کو زیر کرنا اتنا آسان نہیں، بادشاہ۔" میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "جب کہ تم محض نام کے بادشاہ ہو۔" تماش کے پتے۔

ہم زور آزمائی کرتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آئے تو بادشاہ نے سرگوشی میں کہا۔ "راکو من بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"کون؟" میں چونکا۔

"وہی جو نائب اسٹیک سے ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ میں نے ابھی ابھی دائیں جانب کے نشیب کی طرف اس کی جھلک دیکھی ہے۔"

"پھر...؟" میں نے تذبذب کے عالم میں کہا۔ اگر ہم اس مصنوعی لڑائی کو جاری رکھتے تو بے سود تھا، کیونکہ اس صورت میں زخمی کرنا تو درکنار ہمارے ہاتھوں ایک دوسرے کو خراش تک نہ آتی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ بادشاہ مجھ پر حملہ کرنے اور مجھے نقصان پہنچانے سے گریز کر رہا ہے۔ شاید یہ اسی وجہ سے تھا کہ میں نے اسے اپنائیت سے کھانا کھلایا تھا اور اس سے اپنوں جیسا سلوک کیا تھا۔ "میرا خیال ہے، تم مجھے زخمی کر کے نکل جاؤ۔"

"اس طرح بات نہیں بنے گی۔" اس نے جھکے سے چاقو والا ہاتھ چھڑا لیا اور سرگوشی میں کہا۔ "وہ نزدیک آکر تمہارا جائزہ لے گا۔ اس کے بعد ممکن ہے وہ تمہیں مزید زخمی کر دے۔"

"تو پھر تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟" میں نے ہاتھ پیر چلائے ہوئے کہا۔

"میرا چاقو والا ہاتھ دوبارہ پکڑ کر جھکا دو تاکہ چاقو پاڑی کے نشیب میں جا کرے۔ میں نستا ہو جاؤں گا پھر ہم ایک دوسرے پر پتھر برساتے ہوئے اس کی طرف بڑھیں گے۔"

اس کا منصوبہ ایک لمحے میں میری سمجھ میں آگیا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

میں نے زبان پر اپنے خون کا زائقہ محسوس کیا۔ سینے پر پڑنے والا مکا بھی قیامت خیز تھا۔
میں جانتا تھا کہ اس ارے بیٹھے کو میں طاقت کے بل بوتے پر زیر نہیں کر سوں گا۔ اس پر
مجھے کوئی اور ہی حربہ آزمانا پڑے گا... مگر وہ ظالم مجھے اس کی مصلحت بھی تو نہیں دے رہا تھا۔ میرے
گرتے ہی اس نے میری کینٹی پر دو چار ٹھوکریں بھجائیں اور جب میں نیم جاں سا ہو گیا تو اس نے
گریبان پکڑ کر مجھے اٹھایا۔ زمین سے اٹھتے ہی میں نے ایک پتھر اٹھایا۔ لاشعور میں اپنے تحفظ کا
خیال تو دبا ہی ہوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں اس وقت کچھ کر نہیں پا رہا تھا یا میرے ہاتھ پاؤں
ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ تاہم اس ایک ثانیہ میں موقع ملا تو میں نے فوری طور پر پتھر اٹھایا اور
اس کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔

اس کے حلق سے ایک کربہ آواز نکلی اور اس نے سرعت سے اپنا ہاتھ چلایا میرے ہاتھ
میں دبا ہوا پتھر اچھل کر تھپ میں جاگرا۔ میں ایک بار پھر نہتا ہو گیا۔ تاہم یہ دیکھ کر قدرے اطمینان
ہوا کہ میں نے اسے زخمی کر دیا ہے۔ اس کے سر پر گلتے والا وار کاری ثابت ہوا۔ اس کی کھوپڑی
کھل گئی... خون کی ایک موٹی سی دھار اس کی پیشانی سے لکیر بناتی ہوئی اس کی آنکھوں میں آ
رہی تھی اس نے اضطرابی طور پر اپنی آنکھوں میں گرنا ہوا پونچھا تو اس کا چہرہ اس میں لتھڑ گیا
اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ بھانک دکھائی دینے لگا۔

اس نے یکھٹ اپنے ہاتھ آگے بڑھائے تو اس کی ہڈیاں کڑکرائیں۔ اب استخوانی اور بے
رحم انگلیاں مجھے گرفت میں لینے کے لیے بے چین تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس بار وہ مجھے پس
کر رکھ دے گا۔ اس کی خون آلود آنکھوں سے درندگی جھلک رہی تھی اور سانس بے ترتیب
تھیں۔ یکبارگی اس نے مجھ پر جست لگائی۔ اس بار میں تیار تھا لہذا میں دائیں بائیں ہٹنے کی بجائے
سرعت سے بچھ گیا۔ اور میں نے اپنے ہاتھ آگے کر دیے۔ اس کا گینڈے کی طرح بھاری جسم مجھ پر
آن پڑا تاہم میں اس کے نیچے کھل طور پر دب نہ سکا کیونکہ میں نے اپنے ہاتھ آگے کیے ہوئے
تھے۔ اس کے گرتے ہی میں نے پوری قوت صرف کر کے اسے بائیں جانب اچھال پھینکا۔

اس طرف کیکنٹس سے مشابہ ایک پودا تھا، بلند قامت اس کی تیز دھار کانٹوں والی شاخیں
جڑ سے اوپر تک سیدھی تھیں۔ راکومن اڑتا ہوا اس پر جاگرا۔ اس کے حلق سے ایک طویل اور
لرزہ خیز چیخ نکلی۔ پودے پر گرتے ہی اس نے لاشعوری طور پر ہاتھ پیر چلائے۔ "نہیہ" وہ اپنے آپ
کو شدید زخمی کر بیٹھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کانٹے کسی بلیڈ کی طرح تیز
دھار تھے اور نوکیلے۔ اندھا دھند ہاتھ پیر پھینکنے کی وجہ سے اس کے جسم پر لمبی لمبی خراشیں پڑ گئیں
جن سے خون رسنے لگا۔

میں نے مونتے سے فائدہ اٹھایا اور پاؤں جما جما کر پہاڑی سے اترنے لگا۔ راکومن تو
میرے تعاقب میں نہیں آسکتا تھا البتہ اس کی دلدوز چیخیں سن کر گرد و نواح کی آبادی کے لوگ
ضرور متوجہ ہو سکتے تھے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ سڑک پر چلتے والے لوگ راکومن کی چیخیں
سن کر ٹھکے اور سر اٹھا کر ادھر دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک دو آدمی پہاڑی کی طرف بھی بڑھے۔

رہی تھی جب کہ اس کا دہانہ تاریک تھا، اور تاریکی کے پیچھے موت چھپی بیٹھی تھی۔ اس کی انگلی
ٹرائیکلر پر خفیف سا دباؤ ڈالتی، فائر ہوتا اور میری پیشانی میں سوراخ ہو جاتا۔ اس سے رحم دلی کی
توقع کرنا حماقت ہی تھی۔

"تم بہت خوش ہو گے کہ تم نے بادشاہ خان کو زیر کر لیا۔" اس نے خونخوار کبجے میں کہا۔
"بادشاہ خان تو ہمارا ایک معمولی سامرہ ہے۔"

"تمہاری تنظیم کے اصل سرے کہاں ہیں؟" میں نے بے پروائی ظاہر کی۔ "مجھے ان کے
نام اور پتوں سے آگاہ کرو تاکہ میں ایک ساتھ سب کو ٹھکانے لگا سکوں۔"

"خوب، بہت جیسے معلوم ہوتے ہو۔" اس نے میرے حشے پر اوپر سے نیچے تک نگاہ
ڈالتے ہوئے کہا۔ "مگر سے نکلتے وقت تم نے ماں سے دودھ تو بخشوایا تھا؟"

"ریوالور ہاتھ میں ہو تو تم جیسے گیدڑ بھی شیروں کی طرح گر بنے لگتے ہیں۔" میں نے ہنس
کر کہا۔

"تم شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔" اس نے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔
"ریوالور تو میں نے حفظ مانتھم کے طور پر نکال لیا تھا، ورنہ میں تم جیسے پھروں سے یونہی نہٹ سکتا
ہوں۔"

میں لمبے سے اس کی قومیت کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا کیونکہ اس کی اردو بہت رواں تھی۔
اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ عرصے سے اس ملک میں مقیم ہے یا پھر اس نے باقاعدہ زبان
سیکھی ہے۔

"آؤ اور اپنی حسرت نکال لو۔ میں اس کھلونے کو درمیان سے ہٹا لیتا ہوں۔" اس نے کہا
اور ریوالور اپنی ہپ پاکت میں ڈال لیا۔
میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔

بنیادی طور پر تو میں محض ایک جیب تراش تھا۔ اور میں نے اس فن میں ہی مہارت حاصل
کی تھی۔ لڑائی بھڑائی اور دھماکے دار چیزوں کا استعمال میری سرشت میں شامل نہیں تھا۔ میں تو
دوسروں کی تکلیف پر کلیجہ نکال کر رکھ دینے والا آدمی تھا، دوسروں کا خون کیسے اچھال سکتا تھا...
میری مشاق انگلیاں تو سرنک بلیڈ سے کھینچی تھیں، جنہیں میں جیبوں پر آزمانا تھا۔ میں تو چری بنوں
سے کھینچنے کا عادی تھا... مہ، پتلے اور گداز بنوے، جن کی تھوں میں رنگا رنگ نوٹ انگڑائیاں
لیتے ہیں... لیکن اس وقت تو جان پر بنی ہوئی تھی اور حریف طاقت آزمائی پر آمادہ تھا۔ اس کا کوئی
بندوبست تو کرنا ہی تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مجھے لکار رہا تھا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑا سوچ رہا
تھا کہ جائے اماں کہاں ملے گی؟

دھند "اس نے جست لگائی اور کسی چپتے کی طرح اڑتا ہوا میری طرف آیا۔ میں پھرتی سے
دائیں جانب ہوا مگر اس کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ اس کا ایک ہاتھ میرے سینے پر اور دوسرا ٹھوڑی
پر پڑا۔ میں نے اپنے جڑے پلٹے محسوس کیے۔ زبان دانتوں تلے آکر کٹ گئی تھی... چند ہی لمحوں بعد

دہشت پسند تنظیم کے بارے میں بھی سوچا جس کے کارکن برسوں سے اس ملک کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ میں نے پختہ عزم کر لیا کہ ملک کی سالمیت پر آج نہیں آنے دوں گا۔ جو مجھ سے بن پڑے گا، ضرور کروں گا۔ شب بیداری کے نتیجے میں صبح دیر تک سوتا رہا۔ حتیٰ کہ دروازے پر دستک کے شور نے مجھے بیدار کر دیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو جی کو کھڑا پایا۔ جی نے بتایا کہ کل اس نے میرے گھر کے کئی چکر کاٹے مگر ملاقات نہ ہوئی۔ میں نے جی کو کل کا سنسنی خیز واقعہ سنایا تو وہ ششدر رہ گیا۔

”گویا صورت حال بے حد خراب ہے لہذا بہتر ہو گا کہ آپ ہوشیار رہیں۔“
کچھ دیر بعد میں تیار ہو کر جی کو ساتھ لے کر ہوٹل گیا۔ ہم دونوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ جی کو کوئی کام تھا وہ چلا گیا اور میں اپنے گھر آ گیا۔ آج اتوار کا دن تھا۔ بازار وغیرہ بند رہتے تھے۔ چھٹی کے دن یوں بھی دھندلا ذرا مندا ہی ہوتا ہے لیکن مجھے دھندے کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ میرے پاس اتنا کچھ موجود تھا کہ برسوں شاہانہ زندگی گزار سکتا تھا۔

میں سہ پہر کے وقت گھر سے نکلا اور سفاری پارک روانہ ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ اس طرح دل بھی ہل جائے گا اور کل کی تھکن بھی دور ہو جائے گی۔ میں سفاری پارک پہنچا۔ ایک تو چھٹی کا دن تھا دوسرے خاصی گرمی پڑ رہی تھی اور کراچی جیسے شہر میں تفریحی مقامات نہ ہونے کے برابر ہیں، اس لیے پارک میں بچوں، لڑکیوں، عورتوں اور مردوں کا ایک جھوم تھا۔ بڑی رونق اور چل پھل نظر آرہی تھی۔ ایسے جھوم میں ہی شکار کھیلنے کا لطف آتا تھا۔ مگر میں کسی شریف آدمی کی جیب کاٹ کر اس کی ہیرو تفریح غارت کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی مجھے اس کے بیوی بچوں کی بدعواؤں کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اچانک اس جھوم سے الگ تھلک کار پارکنگ میں، نیلم اپنی کار میں بیٹھی نظر آئی تو میں چونک پڑا۔ وہ ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے ہوئے کوئی ٹھنڈا مشروب پی رہی تھی۔ وہ اکیلی ہی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ اس کی نظریں کسی اور ہی سمت میں تھیں، اس لیے مجھے نہ دیکھ سکی۔

وہ ہلکے آسمانی رنگ کے شلوار سوٹ میں تھی۔ بڑی متاثر کن نظر آرہی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ اس کی موہنی صورت دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے اس حسین جانی دشمن کو دیکھ کر میرے لبوں پر ایک غیر اختیاری مسکراہٹ پھیل گئی۔

میں نے سوچا کہ کیوں نہ آج کی شام نیلم کے ساتھ منانی جائے۔ مزا تو اس میں ہے۔ نوک جھونک بھی ہو جائے گی۔ تفریح بھی رہے گی۔ دل و دماغ بھی تروتازہ ہو جائے گا۔ اور اس طرح شاید یہ شام ناقابل فراموش بھی بن جائے۔ میں سوچتا ہوا، ٹھٹھا ہوا اور اس کی نظروں سے اپنے آپ کو بچاتا ہوا کار کے اگلے دروازے کے پاس جا پہنچا۔ نیلم مخالف سمت میں دیکھ رہی تھی اور رونقوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے بالکل خبر نہ ہو سکی کہ اس دروازے کی طرف کوئی کھڑا ہے۔ وہ یوں بھی کھلے دروازے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی۔ میں دوسرے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے جائزہ لیا تو وہ مقفل نظر نہ آیا، اس کا شیشہ بھی اترا ہوا تھا۔

اب میں سیدھا اتر کر ان کی گرفت میں نہیں جانا چاہتا تھا... گلفام آباد کی وہ دکانیں جو لب مزک واقع تھیں، ان کے دکانداروں میں سے کسی نہ کسی نے مجھے اور بادشاہ خان کو پہاڑی پر چڑھتے ضرور دیکھا ہو گا۔ میرے تنہا واپس جانے پر وہ شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتے، ان کا شبہ ایسی صورت میں قوی ہو جاتا جب کہ اوپر سے راکومن کی کرب میں ڈوبی ہوئی آوازیں آرہی تھیں۔

سیدھا اترنے کی بجائے میں اوپر ہی اوپر، ویکا سینٹ فیکٹری کی طرف دوڑنے لگا۔ پہاڑی کے اوپر باقاعدہ راستہ تو نہیں تھا مگر لوگوں کے چلنے پھرنے سے پگھڑی سی بن گئی تھی۔ البتہ نشیب و فراز کافی تھے، کہیں کہیں سے پگھڑی بے حد تنگ ہو گئی تھی اس لیے وہاں رفتار کم کرنا پڑی، ورنہ پاؤں رہٹ جاتا اور میں نیچے گر جاتا تو ہڈیاں یقیناً سرمہ بن جاتیں۔

بھاگنے کے دوران میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا... میں جانتا تھا کہ لوگ پہلے تو صورت حال معلوم کریں گے اس کے بعد ہی میرے تعاقب میں آئیں گے۔ کافی آگے جا کر پہاڑی ختم ہو گئی اور ڈھلان شروع ہو گئی۔ میں وہاں سے نیچے اتر گیا۔ اس جگہ سے کسی نے ضرور آنا چٹان کو کاٹ دیا تھا۔ دائیں جانب نصرت بھٹو کالونی تھی۔

پہاڑی سے اتر کر میں کالونی میں داخل ہوا تو تھکن سے چور چور تھا اور میرا سانس پھولا ہوا تھا۔ میں نے ایک نلکے پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور جیب سے کتنکھا نکال کر بال درست کئے۔ پھر ایک چائے خانے میں جا بیٹھا اور چٹیک والی چائے منگوا کر پی۔ اب میں خود کو قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ نارنجی ناظم آباد کا ایک بلاک، نصرت بھٹو کالونی سے ملحق ہے اور وہاں سے تین نمبر بس چلتی ہے۔ میں بس میں بیٹھ کر ناظم آباد پہنچا، پھر وہاں سے دوسری بس میں لیاقت آباد روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر میں بستر پر گر پڑا۔ جوڑ جوڑ اس طرح سے دکھ رہا تھا کہ کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہا۔

میں نے سوچا تھا کہ لیتے ہی نیند آجائے گی لیکن تھکن کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی اور اس روز پیش آنے والے سنسنی خیز واقعات میرے پردہ تصور پر کسی قلم کی مانند چل رہے تھے۔ عجیب اتفاق تھا کہ... بادشاہ خان سے ملاقات ہو گئی تھی۔ واقعات نے ایک دشمن کو دوست بنا دیا تھا۔ دوستی کا یہ سفر اتنی تیزی سے طے ہوا تھا کہ وہ نہ صرف میرے لیے درد ثابت ہوا بلکہ فرشتہ رحمت بن گیا تھا۔ معلوم نہیں میری کون سی نیکی کام آگئی تھی۔ آج میں موت کے منہ سے نکل آیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے لیے، دشمن تک پہنچنے کی راہ اتنی آسان ہو جائے گی۔ میں بہر حال بعد میں بادشاہ خان سے راہ و رسم پوچھا کہ اس سے بلیک ہاک تنظیم کے بارے پوچھ سکتا تھا۔ اسے تنظیم میں شامل ہوئے زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا تھا مگر میرا قیاس تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہو گا۔ جہاں تک نیلم کا تعلق تھا، تو میں اسے شکست دے چکا تھا۔ بذات خود اسے اور راکومن کو بھی... جب کہ حسن سلوک سے بادشاہ خان کا دل مٹھی میں لے لیا تھا۔

اب مجھے ہوشیار رہنا تھا کیونکہ نیلم ان محاذوں پر ناکام ہونے کے بعد تیسرا وار بھی کر سکتی تھی۔ میں دیر تک بادشاہ خان، اس کی زندگی اور اس کے بھائی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ پھر اس

قرۃ العین کا نام سننے ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا لیکن اس نے جلد ہی خود پر قابو پایا۔
”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم انہیں بلیک میل کر کے لاکھوں کماؤ گے۔“
”ہر ایک کو اپنے اور اپنی تنظیم جیسا مت سمجھو۔ میں نے قرۃ العین کو تمہارے متعلق بتایا تھا۔ جانتی ہو اس نے تمہارے متعلق کیا کہا تھا؟“

نیلیم کا چہرہ خنجر ہو گیا۔ ”تم... تم اس سے بھی مل آئے اور اسے بتا دیا کہ...“ اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ ”بہت برا ہوا۔ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر کے بچے...“
”اس کا کتنا تھا کہ وہ تمہیں ایک بڑی بہن کی طرح چاہتی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ تم اس کے ساتھ ایسا بھی کر سکتی ہو۔ تمہارے اس طرز عمل سے قرۃ العین کو جو دکھ پہنچا ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“

”اوہ... ذلیل، پاجی...“ اس نے مشروب کی بوتل مجھے مارنے کے لیے فضا میں بلند کر لی لیکن پھر خود ہی جڑ بڑ ہو کر ہاتھ نیچے کر لیا اور غصے سے پائیں ہاتھ کی مٹی اسٹیمرنگ پر ماری اور مجھے غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں ایسی عبرت ناک اور اذیت ناک سزا ملے گی کہ ساری زندگی بھول نہیں سکو گے۔ میں تمہیں...“ وہ بے چین ہو رہی تھی۔

”خاک ڈالو ان باتوں پر اور دیکھو کتنا حسین ماحول ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
اسی لمحے وینر آگیا تو وہ بوتل واپس دے کر اپنا پرس ڈیش بورڈ سے نکالنے لگی۔ میں نے وینر سے کہا۔ ”دوڑ کر جاؤ اور دو بوتلیں لے آؤ۔“ نیلیم اسے روکتی ہی رہ گئی مگر وہ مٹینی انداز میں پلٹ کر تیزی سے کینٹین کی طرف چلا گیا۔ نیلیم نے مجھے تند نظروں سے گھورا۔
”دیکھو...“ میں نے مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس حسین شام کو غارت نہ کرو۔ ساری دنیا ماحول کا لطف اٹھائے اور ہم نفرتوں میں اپنا وقت ضائع کریں۔ اس سے بڑی بد ذوقی اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”میری کار سے اتر جاؤ۔“ اس نے تند لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ تم میرے لیے...“

میں نے درمیان سے اس کی بات کاٹتے ہوئے شوخی سے کہا۔ ”میں جانتا ہوں تم ایک سمجھ دار لڑکی ہو۔ عارضی طور پر کسی کو برداشت کرنا یوں بھی اچھی بات نہیں۔ چلو یہاں سے سیدھے کسی قاضی کے پاس چلتے ہیں اور نہایت آسان شرائط پر شادی کر لیتے ہیں۔ تم شرعی حق مہر رکھ دو اور میں جیز میں کچھ نہیں لوں گا۔ تم اس جوڑے میں بھی میرے گھر چل سکتی ہو۔ اب بھی تم کسی دلہن سے کم نہیں لگ رہی ہو۔“

”اگر تم سیدھی طرح نہیں اترو گے تو میں شور مچا دوں گی۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔ ”تمہارا جو حشر ہو گا، تمہیں شاید اس کا انداز نہیں۔ تمہاری کھوپڑی کے سارے بال صاف ہو جائیں گے۔“
”صرف میرا ہی حشر نہیں ہو گا بلکہ ساتھ ساتھ تمہارا بھی ہو گا۔ میں تو ڈوبوں گا تم کو بھی ساتھ لے ڈوبوں گا... شور مچانے سے پہلے تمام پہلوؤں کا ایک بار ضرور جائزہ لے لینا۔ ایسا نہ

مجھے اپنے انجام یا نیلیم کے غصے کی کوئی پروا نہیں تھی اس کے باوجود میں نے دروازہ کھولنے میں بہت احتیاط برتی۔ ہلکی سی کلک کی آواز پیدا ہوئی تو نیلیم نے تیزی سے سرگھا کر میری طرف دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اچھل پڑی اور اس کی آنکھوں میں حیرانی بھر گئی۔ وہ مجھے اچانک اور غیر متوقع طور پر سامنے دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی یا پھر اسے اس بات پر حیرت ہو گئی کہ میں اب تک زندہ کیسے ہوں۔ اس کی دانست میں تو اب تک میں اس دنیا سے سدھار چکا تھا۔ ”تم...“ اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

میں سرعت سے دروازہ کھول کر اس کے برابر بیٹھ گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ اس کے پاس بیٹھتے ہی مجھے مدہوش کر دینے والی ملک کا احساس ہوا جو اس کے لباس سے پھوٹ رہی تھی۔ کتنا خوشبودار وجود ہے لیکن ان لپٹوں کے نیچے کس قدر گھٹاؤنی ہستی رہتی ہے۔ میں نے تلخی سے سوچا۔ میں نے نگاہ بھر کر اسے دیکھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔
”جی وہی خاکسار...“ میں نے اس کی حیرت سے کشادہ حسین آنکھوں میں جھانکا۔ ”اس میں اتنی تعجب کی کیا بات ہے۔ میں انسان ہوں، کوئی روح تو نہیں جو تم مجھے اس قدر حیرت سے دیکھ رہی ہو؟“

”تم انسان تو ہو لیکن پورے خبیث ہو۔ فرہی، دعا باز اور پرلے درجے کے مکار ہو۔“ وہ برہمی سے بولی تو اس کی حسین پیشانی پر کئی خوش نما لب پڑ گئے۔ ”میں تمہیں بخشوں گی نہیں سکندر!“
”ایک طرف تو تم مجھے ان خطابات سے نواز رہی ہو جن کا مستحق میں نہیں بلکہ تم خود ہو۔ میں تو ایک ایسا شخص ہوں جو ڈیلی تمہارے خوابوں میں آتا ہے، تمہارے خیالوں میں ابھرتا رہتا ہے اور پھر تمہارے دل کی دھڑکن اور سانسوں تک میں بسا ہوا ہے۔ دوسری طرف تم اتنے پیار سے سکندر بھی کہہ رہی ہو کہ میرے دل کی حرکت ہی بند ہو گئی ہے۔ یہ کیا تضاد ہے نیلیم؟“
”تم اور میرے خوابوں، خیالوں اور سانسوں میں...“ وہ غصے سے سرخ ہو گئی اس کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ ”اور میں تمہیں پیار سے پکار رہی ہوں۔ میرا بس چلے تو تمہیں قبرستان پہنچا دوں۔“

”دیکھو نیلیم!“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ کھینچ لیا اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ ”ذرا اس زور زور سے دھڑکنے دل پر ہاتھ رکھ کر ایمانداری سے یہ تو بتاؤ کہ فرہی، دعا باز اور مکار کون ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ شروع سے تمہاری نیت میں فحش تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تم دھوکا کھا گئیں؟“

”تم نے وہ تصویریں بھی ہتھیا لیں اور چھ لاکھ کی رقم بھی... مجھے کیا ملا؟ تم دونوں چیزیں ہضم کر گئے۔ مگر یاد رکھو، میں تم سے وہ چیزیں ہر قیمت پر اگوا کر رہوں گی۔“

”تمہیں اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔“ میں نے کہا... ”تصویریں تو میں نے قرۃ العین کے والد کو لے جا کر دے دی تھیں اور وہ اسی وقت تلف کر دی گئیں۔ رہی رقم، تو وہ غریبوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ اس میں برامانے کی کیا بات ہے۔“
اس نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں رقص کر رہی
تھیں اور اس کی کینٹی کی ایک نل کے پھونکنے کا منظر بے حد حسین لگ رہا تھا۔
”اچھا ایک بات تو بتاؤ۔“ میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم ان تصویروں اور خط کا کیا
کرو گی؟“

وہ میری طرف گھوم کر بڑے ہی دل نشیں انداز میں مسکرائی۔ ”گویا میرا اندازہ درست
تھا۔ تم نے وہ خط اور تصویریں واپس نہیں کیں۔ ٹھیک ہے نا؟“
میں نے نفی میں سر ہلا دیا، یہ سوچ کر کہ وہ غلط کر رہی ہے۔ لیکن اس نے میرے سر کی
منفی جنبش کا مطلب یہ نیا کہ میں نے تصویریں واپس نہیں کی ہیں۔

”تم نے اپنے چند انقلاب پسند ساتھیوں کا تذکرہ کیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تمہاری کوئی
باقاعدہ تنظیم ہے؟“
”جلو، یہی سمجھ لو۔“

اس نے پراسرار لہجے میں کہا۔ ”اگر ہماری تنظیم ہے تو ظاہر ہے، وہ ان تصویروں اور
خطوط کی مدد سے بے شمار دولت حاصل کر سکتی ہے۔ ایسی تنظیموں کو فنڈ کی ضرورت ہوتی ہے اور
اس کے لیے وہ آخری، حدوں تک بھی جاسکتی ہے۔ تم اب تک محض میری نرمی کی وجہ سے محفوظ
رہے ہو ورنہ تم جانتے ہو کہ کسی تنظیم سے نکلنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔“

میں نے مسکرا کر اس کے سامنوں کے مدد جزر کو دیکھا جو اس کے ہڈیانی انداز میں بولنے
سے بے ترتیب سا ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ کسی وحشی قاتل کی طرح ہو رہا تھا۔ وہ مجھے اس طرح دیکھتا
پاکر کچھ سٹ سی گئی۔ اس کا شاخ جیسا بدن چل گیا تھا۔ میں نے مشروب کا ایک گھونٹ لے کر اس
کی شیطانی برساتی آنکھوں میں جھانکا۔ ”سنو، جان من! میں ایک بے خوف آدمی ہوں۔ جھوٹ بولنا
میری سرشت میں شامل نہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ نیکیوں اور تصویریں واقعی قرۃ العین
کے باپ کے ہاتھوں تلف ہو چکی ہیں۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں تو ابھی اور اسی وقت
کنٹین پر جا کے قرۃ العین کے ہاں فون کر کے تصدیق کرلو۔ رقم جہاں ٹھکانے لگی ہے میں تمہیں اس
ٹھکانے پر لے جاسکتا ہوں لہذا اب یہ دونوں باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند سمجھو۔ دوسری بات یہ ہے
کہ تم نے خواہ مخواہ اپنی تنظیم کے پھلوں کو زحمت دی۔ کوئی تنظیم کتنی ہی خطرناک کیوں نہ ہو،
بعض آدمی اپنی ذات میں انجمن ہوتے ہیں، پھر میرا ایمان تو خدا کی ذات پر ہے، وہی مارنے والا ہے
اور وہی بچانے والا ہے۔ وہی عزت اور ذلت بھی دیتا ہے۔“ میں نے توقف کر کے ایک ہی سانس
میں بول خالی کر دی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے
روک دیا اور کہا۔ ”مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی کہ تمہاری
اس خوبصورت کھوپڑی میں رومان خیز مغز کی بجائے تحریری مغز کیوں ہے؟ کیا تم اس خط کو دل و دماغ
کے تمام گوشوں سے نکال کر میرے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچ سکتیں؟“ اس کے چہرے سے

ہو کہ تمہیں بعد میں بچھٹانا پڑے۔“
”میرا بال تک بیک نہیں ہو گا۔“ اس نے نخوت سے کہا۔ ”میں عورت ذات ہوں۔ لوگ
میری بات پر یقین کریں گے اور تمہیں لاتیں اور جوتوں کے بار پڑیں گے۔“
”عورت تو آگینہ ہوتی ہے اور پھر تم نہ صرف ایک بڑے باپ کی بیٹی ہو بلکہ ایک حسین
لڑکی بھی ہو۔ تم نے میرے خلاف کوئی حرکت کی تو جواباً میں تمہارے خلاف اسکیڈل کھڑا کر دوں
گا۔ تمہارے ساتھ تمہارے والد کی عزت و شہرت کو بھی اتنا نقصان پہنچے گا کہ وہ اپنا دماغی توازن کھو
بینھیں گے۔“

”سکندر!“ وہ اس طرح سے چلائی جیسے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہو۔ ”تم مجھے
دھمکیاں دے کر خوفزدہ نہیں کر سکتے۔ میں شور مچا کر رہوں گی۔“
”میں تمہیں دھمکیاں نہیں دے رہا بلکہ سمجھا رہا ہوں کہ تمہاری اس حرکت پر دفاع کس
طرح کروں گا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ غصے کی وجہ سے تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں
ہے۔ ویٹرنیٹری بوتلیں لے کر آ رہا ہے۔ کچھ اور پی لو تو شاید ذہنی سکون میرے آجائے اور سوچنے
سمجھنے کی صلاحیت بھی آجائے۔“

ویٹرنیٹری بوتلیں لے کر قریب پہنچ گیا۔ نیلم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ میں نے بوتلیں لے
لیں۔ ویٹرنیٹری بوتلیں نے نیلم کی طرف بوتل بڑھائی۔ اس نے بوتل نہیں لی۔ اس کا چہرہ غصے سے
تمتار رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ مجھے دھکا دے کر گاڑی سے گرا دیتی۔
”تم غصے میں اور بھی حسین ہو جاتی ہو۔ خدا کرے تم پر ہر وقت غصہ سوار رہے۔“

وہ غصے سے اندر ہی اندر تپ رہی تھی۔ دانتوں سے اپنے ہونٹوں کو کاٹ رہی تھی۔ میں
بوتل کو منہ لگائے ٹھنڈا مشروب حلق سے نیچے اتار رہا تھا اور اس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا
بھی جا رہا تھا۔ وہ چند لمحوں تک باہر دیکھتی رہی پھر اچانک ہی میری طرف گردن گھما کر بولی۔ ”
سکندر، میں تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں کہ سیدھی طرح وہ رقم اور تصویریں دے دو ورنہ تمہارا
انجام اچھا نہ ہو گا۔“

”جس معاملے کا آغاز ہی اچھا نہ ہو، اس کا انجام بھلا کیا خاک اچھا ہو گا۔“ میں نے منہ بنا
کر کہا۔ ”لیکن ٹھہرو، تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں زندہ کیسے ہوں؟“
”تم جیسے ذہین یونسی تو نہیں مر جاتے۔“ وہ غرا کر بولی۔ ”تمہارے لیے سنجیدگی سے کچھ
سوچنا پڑے گا۔“

”یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔“ میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر بولی۔

”یہی کہ میرے بارے میں سنجیدگی سے سوچو۔ بلاخر تم اس نتیجے پر پہنچو گی کہ تمہیں اپنا

ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دینا چاہیے۔“

”سٹ اپ۔“ وہ تھملا گئی۔

دیکھا۔ میں کچھ دور جانے کے بعد ایک ایسی جگہ آگیا جہاں سے نلیم کی کار اور کینٹین نظر نہیں آری تھی۔ مجھے نلیم کے خیالات سے بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ اس انقلابی تنظیم نے اس کی جس طرح برین واشنگ کی تھی۔ اس طرح نہ جانے کتنے نوجوانوں کو بغاوت کا سبق سکھا رکھا تھا۔ ملک کی فضا میں زہر کھل رہا تھا اور میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

میں ایک لمبا چکر کاٹ کر واپس آیا تو دن ڈوب رہا تھا۔ میں چلتے چلتے ایک جگہ ٹھک کر رہ گیا۔ گھاس کے ایک قطعے پر نلیم چند نوجوان لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ان سے پر اسرار انداز میں باتیں کر رہی تھیں۔ لڑکیاں ہمہ تن گوش تھیں۔ نلیم کی پشت میری طرف تھی۔ وہ مجھے نہ دیکھ سکی۔ مگر میں ان لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا جو نوجوان، حسین، پر شاباب اور بے حد پر کشش تھیں۔ ان کے لمبوسات نے ان کے حسن کو چار چاند لگا رکھے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا، کبیں یہ لڑکیاں بطور چارہ استعمال کرنے کے لیے تو نہیں ہیں۔ شاید انہی لڑکیوں کی وجہ سے لڑکے اس تنظیم میں شامل ہوتے ہوں۔ پھر مجھے وہ خط یاد آگیا۔ اس خط میں حسین لڑکیوں کی ترغیب کا تذکرہ تھا۔

ان لڑکیوں میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین تھی... یہ لڑکیاں ایسے حسین ہم تھے جن سے مادر وطن کے پرچے اڑ سکتے تھے۔ مجھے ان سے نفرت محسوس ہونے لگی حالانکہ ان کا ظاہری حسن اپنی طرف کشش کر رہا تھا۔ معلوم نہیں کس نے اور کیسے ان لڑکیوں کے ذہنوں کو درغلا کر انہیں انقلاب میں حصہ لینے پر مجبور کیا تھا یا اس جذبے کو ہوا دی تھی؟ شاید یہ نلیم ہی تھی۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا تھا۔ ان لڑکیوں کا اس تنظیم میں شامل ہونا نہ صرف تعجب خیز تھا بلکہ ناقابل یقین بھی تھا۔ آج ان کا یہاں جمع ہونا بھی بلا وجہ نہیں تھا۔ یقیناً وہ کسی مسئلے پر سر جوڑ کر صلاح مشورہ کر رہی تھیں۔ کوئی سازش تیار کر رہی تھیں۔ کوئی منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔

معاں! میری نظر ایک ویٹر پر پڑی جو ایک بڑی سی ٹرے میں ٹھنڈی بوتلیں اور بن کباب لیے ان کی جانب جا رہا تھا۔ میرے دل میں ایک خیال آیا اور میں اس کی طرف لپکا۔ پھر کچھ سوچ کر اسے نکل جانے دیا۔ اگر میں اسے راستے میں روک کر اپنے خیال کو عملی جامہ پہناتا تو اس بات کا خدشہ تھا کہ کوئی لڑکی یا نلیم مجھے ویٹر سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیتی اور پھر وہ سب محتاط ہو جاتیں۔ میں کینٹین سے کچھ فاصلے پر 'لڑکیوں کی نظروں سے اوجھل' ایک جگہ ویٹر کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے اشارے سے اسے بلا لیا۔ اس نے میرے قریب پہنچ کر مجھے سلام کیا اور پوچھا۔ "جی صاحب! کیا چاہیے؟"

میں نے جب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور خالی ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب چاہیے۔"

دس روپے کے نوٹ نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔ وہ چالپوسی کے انداز میں ہنستا ہوا بولا۔ "جی صاحب! آپ جو پوچھیں گے اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا۔"

"ابھی تم جن لڑکیوں کے لیے بوتلیں اور بن کباب لے کر گئے تھے؟ وہ آپس میں کیا باتیں کر رہی تھیں... تم نے کیا کچھ سنا؟"

شدید نفرت کی لہر اٹھی۔ وہ مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ "تم جس تنظیم سے وابستہ ہو، میرے خیال میں وہ حکومت اور اس ملک کی سلامتی کے خلاف کام کر رہی ہے۔ بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے تم جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہین اور سمجھ دار لڑکی ننداروں سے مل گئی ہے جو اس ملک کو کوڑیوں کے مول بچ دینا چاہتے ہیں۔"

"ہم لوگ اس ملک میں انقلاب لا رہے ہیں۔ ہم اپنے صوبے کی آزادی چاہتے ہیں۔" وہ پر جوش لہجے میں بولی۔

"اگر صوبے کی آزادی ہی مقصود ہے تو ملک دشمن ہاتھوں میں کیوں کھیل رہی ہے؟ تمہاری تنظیم۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ان کی مدد غیر مشروط ہے؟ اس نام نہاد آزادی سے کیا ملے گا؟" "ہم اپنے ان جمہوریت پسند دوستوں کی مدد سے جنہیں تم دشمن کہہ رہے ہو آزادی حاصل کر لیں گے۔ پھر ایک خود مختار اور خوش حال زندگی گزاریں گے۔"

"تمہیں دنیا اور سیاست کا کوئی تجربہ نہیں۔ ہمارے دشمن ملک کے صوبوں کو جب آزادی اور خود مختاری نصیب نہیں تو عوام کی خوش حالی تو بہت دور کی بات ہے۔ انہیں دو وقت کی روٹی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتی۔ آئے دن وہاں بھی فسادات اور ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ کیا یہ حماقت نہیں کہ تم ان لوگوں سے آزادی اور خوش حالی کی توقع کر رہی ہو۔"

"تم تو اسے وثوق سے اور اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے جرم ظلم میں ایم اے کیا ہے اور اس ملک کے بہت بڑے صحافی ہو۔ کچھ بھی ہو، وہاں جمہوریت تو ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ سیاست کیا ہوتی ہے؟ تم تصویر کا صرف ایک ہی رخ دیکھ رہے ہو۔ مگر یاد رکھو، ہمارا خواب بہت جلدی پورا ہو گا اور آئندہ سیاست کے موضوع پر نہ بولو تو اچھا ہو گا کیوں کہ تم فراڈ، مکر و فریب اور جعل سازی میں ایم اے معلوم ہوتے ہو۔ سیاست بچوں کا کھیل نہیں ہے۔" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"میں اخبارات پڑھتا ہوں لہذا کچھ شدید تو رکھتا ہوں۔ وہاں جو اور جس قسم کی جمہوریت ہے، وہ محض دکھاوے کی ہے لولی لنگڑی... بہر حال، تم کہتی ہو تو میں کوئی سیاسی بات نہیں کروں گا۔ واقعی سیاست ہمارا کھیل نہیں، ہمارا کھیل تو محبت ہے۔ لہذا میری محبت کے بارے میں تمہارا..."

"یہ تم پر بار بار محبت کا دورہ کیوں پڑ رہا ہے۔ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں اور تمہارے خون کی پیاسی ہوں۔"

"میں نے بھی تیرہ کر رکھا ہے کہ تمہیں ایک روز اپنا بنا کر رہوں گا۔ اور تمہارے دل کے پلاٹ پر اپنا ایک چھوٹا سا اور محبت بھرا آشیانہ بنا لوں گا۔"

"میں کہتی ہوں گاڑی سے اتر جاؤ۔ میری سیلیاں آنے والی ہیں۔"

"میں کار سے تو اتر جاتا ہوں لیکن یاد رکھنا تمہارے دل سے اتر کے نہیں جا رہا ہوں۔ تم کسی طور پر مجھے یاد کرتی رہو گی اور میں تمہارے تصور میں آتا رہوں گا۔" یہ کہہ کر میں گاڑی سے اتر آیا اور ٹھٹھا ہوا چڑھائی کی طرف بڑھ گیا۔ اوپر چڑھتے ہوئے میں نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں

سوزو کی دین کی آڑ سے نکل کر اسے آواز دے کر قریب بلا لیا۔ وہ قریب آکر کھینے لگا۔ ”ان میں جو سب سے حسین لڑکی تھی، وہ کہہ رہی تھی... نیلم! مجھے کسی دن اس خبیث سکندر کو دور سے دکھا دو۔ میں اس سے نہ صرف وہ سب چیزیں لے لوں گی، بلکہ رقم وصول کر کے اسے اس قابل نہیں چھوڑوں گی کہ وہ چل پھر بھی سکے۔ دوسری لڑکی کہہ رہی۔ نیلم، تم قرۃ العین سے خود یا پھر کسی سہیلی کے ذریعے معلوم کرو کہ وہ چیزیں اسے واقعی مل گئی ہیں یا نہیں۔ اگر وہ چیزیں اس تک پہنچ گئی ہیں تو پھر ہمیں اپنا وقت سکندر کے پیچھے برباد کرنے کی بجائے کوئی اور تدبیر سوچنی چاہیے۔ صابر سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔“ ویٹر نے توقف کر کے سانس لیا پھر مسکراتے ہوئے اور پر امید نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بس جی، میں اتنا ہی سن سکا ہوں... کیا یہ کافی نہیں ہے...“

میں نے جیب سے پچاس کا ایک نوٹ نکالتے ہوئے متعجب ہو کر پوچھا۔ ”تم نے اتنی ساری باتیں کیسے سن لیں؟ کیا وہ تمہاری موجودگی میں چپ نہیں ہو گئی تھیں...“

”صاحب جی! میں دبے پاؤں پیچھے جا کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی باتوں میں اس قدر منہمک تھیں کہ انہیں میری موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر ایک لڑکی کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے اشارے سے اپنی ساتھی لڑکیوں کو میری موجودگی کا احساس دلایا اور سب چپ ہو گئیں۔ پھر وہ واپسی کا پروگرام بنانے لگی تھیں۔“

”تم نے واقعی ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔“ میں نے اس کا کندھا تھپ تھپایا۔ ”اس خوشی میں تمہیں پچاس روپے انعام دے رہا ہوں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے پالا ہوا تھا۔“ پچاس کا نوٹ پا کر وہ ایک دم خوش ہو گیا۔ اس نے نوٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”صاحب جی! یہ سکندر کون ہے جس کے بارے میں وہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں؟“

”ہے، ایک آدمی... اسے دور جدید کا سکندر اعظم کہا جاتا ہے۔ اس کی فتوحات سے دشمن بری طرح گھبرایا ہوا ہے اور پریشان ہو کر سوچ رہا ہے کہ اس کی فتوحات کا سلسلہ کہاں تک جائے گا اور اسے کیسے روکا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

ویٹر کچھ بھی نہ سمجھا اور ہونٹوں کی طرح میری صورت دیکھنے لگا تو میں مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں ان لڑکیوں کے بارے میں غور کرنے لگا جو میرے خلاف ہونے والی سازش میں شرکت کرنے آئی تھیں۔ معلوم نہیں وہ کون حسین لڑکی تھی جس نے نیلم سے میرے بارے میں دعویٰ کیا تھا۔ میں اس کی صورت دیکھ لیتا تو اچھا تھا۔ کبھی اس سے دو دو ہاتھ ہو جاتے۔

اگلے روز میں زیب النساء اسٹریٹ پر شکار کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ معاً میری نظر صابر پر پڑ گئی۔ وہ ایک دکان سے نکل کر بوہری بازار کی طرف جا رہا تھا۔ میں اس کے تعاقب میں لگ گیا۔ بوہری بازار کے گلز پر پہنچ کر اس نے ایک رکشے کو روکا تو میں نے ایک ٹیکسی روک لی ٹیکسی ڈرائیور مکرانی تھا۔ بوا زندہ دل اور خوش مزاج معلوم ہوتا تھا۔ میں نے صابر کے رکشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”استادا! اس رکشے کا پیچھا کرنا ہے۔ دیکھو، کہیں نکل نہ جائے۔“

”کون جی... وہ لڑکیاں...؟“ ویٹر نے کہا۔ ”میں جب ان کے پاس پہنچا تو وہ سب خاموش ہو گئی تھیں اور میرے بیٹے تک خاموش ہی رہی تھیں۔“

”ایک آدھ جملہ تو تمہارے کانوں میں ضرور پڑا ہو گا۔ ظاہر ہے ایک دم سے باتوں کو بریک تو نہیں لگ جاتا۔ شاباش، یاد کر کے بتاؤ۔“ میں نے اس کا شانہ تھپ تھپایا۔

وہ خلا میں گھورتا ہوا ذہن پر زور دینے لگا... پھر ایک لخت چونک کر بولا۔ ”جس لڑکی نے مجھے آرڈر دیا تھا وہ کہہ رہی تھی۔“ سکندر ہر بار بچ کر نکل جاتا ہے۔ اگر وہ...“ اس نے توقف کر کے میرے جانب دیکھا۔ ”پس صاحب، اتنا جملہ سنا تھا، پھر وہ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔“

”بوتلیں واپس لینے جاؤ تو اپنے کان کھلے رکھنا۔ میں ان لڑکیوں کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ خریدنے کو تیار ہوں۔“ میں نے متانت سے کہا۔ ”لیکن خیال رہے، اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہ کرنا۔“

”چکر کیا ہے صاحب؟“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”تمہاری شادی ہو چکی ہے؟“

”نہیں صاحب...“

”تو پھر تم یہ چکر نہیں سمجھ سکو گے۔ اس لیے صرف کمائی کی طرف دھیان رکھو۔“ میں نے مسکرا کر کہا اور باتیں آنکھ دبا دی۔

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا چلا گیا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ بعد ہر طرف شام کے دھندلے رات کے ٹلگے اندھیرے میں مدغم ہو رہے تھے کہ دی ویٹر نیلم اور ان لڑکیوں کے پاس گیا اور پھر تیز تیز چلتا ہوا میرے پاس آکر بولا... ”صاحب جی! وہ ادھر ہی آ رہی ہیں۔ میں بعد میں آکر بتاؤں گا۔“ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور میں لپک کر ایک سوزو کی دین کی آڑ میں ہو گیا۔

نیلم اور دوسری لڑکیاں ہنستی، کھٹکتی اور نرم و نازک شاخوں کی طرح لپکتی چلی آ رہی تھیں۔ جھینپے میں ان کے چہرے دیکھتے محسوس ہو رہے تھے۔ میں ان چہروں کو اپنے ذہن پر نقش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن بار بار توجہ بھٹک جاتی تھی۔

لڑکیاں دو کاروں میں آئی تھیں۔ ایک مرسلہ تھی اور دوسری نوپوٹا کرولا۔ دونوں کاریں نئے ماڈل کی تھیں۔ کاروں اور ان کے ملبوسات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان لڑکیوں کا تعلق اعلیٰ گھرانوں سے ہے۔ ساری لڑکیوں کا نہیں تو ایک دو لڑکیوں کا تو ضرور تھا۔ البتہ ایک بات سب میں مشترک تھی کہ وہ سب حسین و جمیل تھیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ کچے ذہن کی نہیں تھیں بلکہ تعلیم یافتہ لگتی تھیں۔ ایسی لڑکیاں تخریب کار بن جائیں تو زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں۔

نیلم جس طرح اپنی کار میں اکیلی آئی تھی اکیلی ہی چلی گئی۔ اس نے اپنی کار میں بیٹھنے سے پہلے گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا جیسے اس کی نگاہیں مجھے تلاش کر رہی ہوں۔ دوسری طرف تمام لڑکیاں دو کاروں میں بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ ویٹر میری تلاش میں آیا تو میں نے

لئے انتظار کرنے کے بعد بھر دستک دی۔ پانچ منٹ گزر گئے، اندر سے کوئی جواب نہ ملا اور نہ ہی بادشاہ خان باہر آیا تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بھیڑ دیا اور اسے پکارا۔ ”بادشاہ خان... بادشاہ خان۔“ معاً میری نظر سامنے والے کمرے پر پڑی تو میں ٹھک گیا۔ فرش پر کچھ چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ جیسے کسی بچے نے شرارت سے یا غصے میں آکر گھر کی چیزیں کمرے میں پھیلا دی ہوں۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ دہلیز پر پہنچا تو مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا اور میں یوں ساکت کھڑا رہ گیا جیسے میرے جسم کا سارا المونیم ہو گیا ہو۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سردی لہر دوڑتی چلی گئی۔ میں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے بادشاہ خان کی لاش دیکھ رہا تھا جو خون میں لت پت پڑی تھی۔ قاتل نے اس کا چہرہ ہی مسخ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اس کے جسم پر پڑی ہوئی خراشیں اور جگہ جگہ سے رنے والا خون تشدد آمیز اور اذیت ناک موت کی کہانی سنا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان کھلی آنکھوں میں خوف و دہشت کے تاثرات نمودار تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے ایک سے زیادہ افراد نے قتل کیا ہے۔ ویسے بھی بادشاہ جیسے شخص کو ایک دو آدمی زیر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بے پناہ طاقت ور اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میرے جسم پر چوٹیاں سی رہ گئیں لگیں اور دل میں وحشت سامنے لگی... میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بادشاہ خان کو اپنی ناکامی کی سزا قتل کی صورت میں بھی مل سکتی ہے۔ میری آنکھیں اپنے اس پر غلوص دوست کے لیے بھیگ گئیں۔

میں نے اس کمرے کا ایک نظر جائزہ لیا تو مجھے دائیں جانب ایک چھوٹی سی الماری ’صندوق‘ کرسی، میز اور چھوٹے سے ٹرانسٹر کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا قاتلوں نے اس واردات کو ڈیکھتی کارنگ دینے کے لیے الماری اور صندوق سے تمام چیزیں نکال کر فرش پر بکھیر دی تھیں۔ ٹرانسٹر جانے کیسے ٹوٹ گیا تھا۔ میز اور کرسی بھی الٹی پڑی تھی۔

میں نے بادشاہ خان کے قریب جا کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اسے تھوڑی سی دیر پہلے ٹھکانے لگایا گیا ہے۔ میری نظریں کمرے کا طواف کر رہی تھیں مگر مجھے وہاں اپنے مطلب کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کوئی ایسی چیز بھی نہیں جس سے قتل پر روشنی پڑ سکتی یا جس سے تنظیم کے تار و پود بکھرنے میں مدد مل سکتی۔ مختلف چیزوں کو ٹٹولنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں بادشاہ خان کی جامہ تلاشی کیوں نہ لوں۔ میں نے اس کے قریب جا کر اس کی جیبیں ٹولیں مگر معمولی ریزگاری اور بس کے استعمال شدہ ٹکٹ اور لائڈری کی رسید کے سوا کچھ نہ ملا۔ ابھی میں اسے تھپ تھپ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے اس کے شلوار کے نیپے میں کڑکڑاہٹ کا احساس ہوا۔

نیپے میں انگلی ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہاں اس نے کانڈ کی ایک عقی ٹھونس رکھی ہے۔ میں نے اسے قدرے دقت سے نکال لیا۔ اگر اس وقت بادشاہ خان عالم ہوش و حواس میں ہوتا تو شاید اسے حساس بھی نہ ہوتا کہ میں نے اس کے نیپے سے کوئی چیز نکالی ہے۔ جب میں نے اس عقی کی تمہیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مختصر سا پرزہ ہے جس پر چند نام اور پتے بھیٹے گئے ہیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بادشاہ خان نے کسی نہ کسی طریقے سے تنظیم میں شامل

اس نے اپنی موٹی گردن گھما کر مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر گہرا استعجاب تھا۔ پھر اس نے پر اسرار انداز میں پوچھا۔ ”ارے صاحب! آپ کوئی جاسوس ماسوس ہے کیا؟“

”ہاں...“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہ شخص جو رکشا میں سوار ہو کر جا رہا ہے ایک مغرور طرم ہے اور بہت دنوں بعد نظر آیا ہے“ اسے گرفتار کرنا ہے۔“

”اچھا!“ اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے ٹیکسی تیزی سے رکنے کے پیچھے لگا دی۔ بولو تو ہم ابھی اس کی گردن پکڑتا ہے۔“

”میں اس کی گرفتاری میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتا میں نے اسے سمجھایا۔“ ہمیں اس کے کچھ اور ساتھیوں کے بارے میں بھی معلوم کرنا ہے، اگر اسے ابھی گرفتار کر لیا تو اس کے ساتھی رو پوش ہو جائیں گے، لہذا ہمیں غیر محسوس طریقے سے اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا ہے۔“

ٹیکسی ڈرائیور کی سمجھ میں جلد ہی میری بات آگئی۔ وہ کچھ فاصلہ رکھ کر رکنے کا تعاقب کرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ طرم کے بارے میں جاننے کے لیے بہت چتاب ہے۔ اس نے طرم اور اس کے جرم کے متعلق کئی سوال کر ڈالے۔ میں نے سرسری سا جواب دے کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی اور دل میں ڈرتا رہا کہ کہیں وہ کوئی حادثہ نہ کر بیٹھے۔ وہ بڑے بھونڈے انداز میں ڈرائیور کر رہا تھا۔ دو ایک پرائیویٹ گاڑیوں سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا بھی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

صابر کا رکشا عرشی سینما کے چوراہے سے مڑ گیا، پھر لکڑی کے ٹال والے بس اسٹاپ پر پہنچ کر ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی گاڑی گلی کی عکڑ پر روک لی۔ صابر نے ایک مکان کے سامنے رکشا روک لیا تھا۔ وہ رکنے سے اترا اور کرایہ ادا کرنے لگا۔ میں نے اسے جیب سے چابی نکالتے دیکھا۔ مکان کا ٹالا کھول کر وہ اندر چلا گیا۔ میں نے صابر کا مکان اور اس کا محل وقوع ذہن نشین کر کے ٹیکسی والے سے کہا۔ ”واپس چلو۔“

جی کے مکان پر پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ اسے میں نے کرایے کے علاوہ دس روپے دیے تو وہ خوش ہو کر چلا گیا۔ میں نے جی کے دروازے پر دستک دی تو اس کے چھوٹے بھائی نے دروازہ کھولا۔ جی گھر پر نہیں تھا۔ میں نے کچھ دیر وہاں بیٹھ کر انتظار کیا۔ مگر وہ نہیں آیا تو میں اپنے گھر چلا آیا۔

اگلے روز اتوار تھا، مجھے بادشاہ خان نے رات آٹھ بجے آنے کو کہا تھا میں ٹھیک وقت پر اس کے گھر پہنچا۔ گلی میں چل چل کی بجائے سناٹا تھا۔ ٹیلی ویژن پر کوئی ڈراما دکھایا جا رہا تھا۔ اس کی آواز ہر مکان سے سنائی دے رہی تھی۔ اس ڈرامے کی وجہ سے گلی سنسان پڑی تھی۔ بادشاہ خان کے کمرے کا مکان کا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ کھل گیا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ بادشاہ خان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گھر میں تنہا رہتا ہے۔ پھر بھی بلا تکلف اور اجازت کے بغیر میں گھر میں داخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے چند

”کیپٹی چولے سے اتار لیجئے۔ پانی سننا رہا ہے۔“ اس نے کیپٹی سے بھاپ اٹھتی دیکھ کر کہا۔ ”شاید ابل چکا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“

میں نے پانی اتار کر کافی اور دودھ پیالیوں میں ڈالا اور ایک کپ جی کی طرف بڑھا دیا۔ کافی پی کر ہم باہر نکلے۔ ہم نے جیسی لی اور جی کے محلے میں جا بیچے۔ جی نے اپنے دوست سے جا کر چابی لی تو میں نے گناہ آدمی کی حیثیت سے پولیس اسٹیشن کو فون کر کے بادشاہ خان کے قتل کی اطلاع دی۔ وہاں سے واپسی پر جی نے پوچھا۔ ”اب کیا رہ گیا؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”جب آپ کے پاس تنظیم کے کارکنوں کے نام اور پتے موجود ہیں تو پھر ان لوگوں پر ہاتھ کیوں نہیں ڈال دیتے؟“

”ان لوگوں پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ان لوگوں سے براہ راست ٹکرانا بھی مناسب نہیں۔ ان کا قلع قمع کرنے کے لیے ہمیں قانون کا سارا لینا پڑے گا۔۔۔ جب کہ قانون اندھا ہوتا ہے۔ وہ کسی پر اس وقت تک ہاتھ نہیں ڈالتا جب تک کہ اس کے خلاف ٹھوس ثبوت موجود نہ ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے پہلے آپ ان لوگوں کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کریں گے!“ جی نے مایوسی سے کہا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔“

”بہت کچھ ہوا۔“ میں نے اس کا خیال رد کر دیا۔ ”اگر لوگوں کے نام اور پتے ہاتھ نہ لگتے تو ہم اندھیرے میں ہی رہ جاتے۔ اب کم از کم یہ تو ہوا ہے کہ ہمارے سامنے لائن آف ایکشن موجود ہے۔ ہم تنظیم کے ایک ایک فرد پر ہاتھ ڈال کر اسے نچوڑ سکتے ہیں یا اسے نگاہ میں رکھ کر اس کی خفیہ سرگرمیوں کا پتہ چلا سکتے ہیں۔“

”گویا اب ہمیں باقاعدہ سراغ رساں بننا پڑے گا۔“ جی ہنس پڑا۔

”...ہاں۔ اور وطن عزیز کی طرف بڑھنے والے ٹاپاک ہاتھوں کی جھجکنا کرنا پڑے گی۔“

”مگر تنظیم کے لوگوں کی صرف نگرانی ہی کیوں؟“ جی نے پوچھا۔

”پھر؟“ میں چونکا۔ ”اس کے علاوہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

”کیوں نہ اس تنظیم کا خفیہ کارڈ حاصل کرنے کی کوشش کریں اور ان میں شامل ہو جائیں۔ اس طرح سے ان کی جڑیں اکھاڑنے میں آسانی رہے گی۔“

”مگر اس کے لیے مجھے محتاط رہنا پڑے گا کیونکہ نیلیم مجھ سے بخوبی واقف ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس کی نگاہوں سے بچنے کے لیے آپ عقل کے ہاں جا کر میک اپ بھی کر سکتے ہیں۔“

لوگوں کے نام اور پتے حاصل کر لیے تھے مگر ان لوگوں کو خبر ہو گئی، خفیہ ”انہوں نے بادشاہ خان کو ہلاک کر دیا اور کمرے کی تلاشی لی مگر مطلوبہ فہرست حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ متوقع محلے کے پیش نظر یا پھر احتیاطاً“ بادشاہ خان اسے پہلے ہی نیپے میں رکھ چکا تھا۔ میں نے وہ پرزہ جیب میں ڈالا اور باہر نکل آیا۔

مکان سے نکلنے سے پہلے میں نے اطراف میں نگاہ دوڑائی مگر مجھے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ میں نے تیز قدموں سے گلی طے کی اور مین روڈ پر آگیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے ایک عکسی گزری تو میں نے اسے ہاتھ دے کر روکا اور اس کی عقبی سیٹ پر خود کو گراتے ہوئے ڈرائیور سے لیاقت آباد چلنے کے لیے کہہ دیا۔ سفر کے دوران میرا خون کھولتا رہا۔ میں نے عہد کر لیا تھا میں اس تنظیم کے تار و پود بکھیر کر رہوں گا، بادشاہ خان کے قاتلوں کو نہیں بخشوں گا اور انہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔

لیاقت آباد نمبر دس کے چوراہے پر اتر کر میں نے سوچا کہ پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دینا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ بادشاہ خان کی لاش کئی روز تک اس کے مکان میں کسی لاوارث لاش کی طرح پڑی سوتی رہے، مگر مسئلہ یہ تھا کہ فون کہاں سے کروں؟ میرے گھر میں فون نہیں تھا، کسی پبلک کال آفس سے پولیس کو آگاہ کرنا تو کال آفس کے مالک کی نگاہ میں آجاتا۔ وہ میرے جانے کے بعد یقیناً پولیس کو میرے بارے میں بتا دیتا یا بادشاہ خان کے قتل کی خبر دوسرے روز کے اخبارات میں شائع ہوتی تو وہ کڑیاں ملا لیتا اور اسے میرے بارے میں جستجو رہتی پھر کبھی مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ میری گردن پر ہاتھ ڈال دیتا۔

گھر پہنچ کر میں تھکن محسوس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بستر پر پاؤں پھیلائے پڑا رہا، پھر ہاتھ منہ دھو کر میں نے کافی تیار کی۔ چائے اور کافی کا سامان میں گھر میں بھی رکھتا ہوں تاکہ ہنگامی حالات میں تیار کر سکوں۔ بعض اوقات غیر متوقع مہمانوں کو کہیں باہر لے کر جانے کو جی نہیں چاہتا تو باورچی خانے میں جا کر اپنے ہاتھ اس معاملے میں بھی استعمال کر لیتا ہوں۔ کافی تیار کرنے کے دوران ذہن اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا تو جی کو موجود پایا۔ اس کی آمد پر خوشی محسوس ہوئی۔ میں نے کیپٹی میں ایک کپ پانی بڑھایا دیا اور اس کو بادشاہ خان کے ہیمنہ قتل کے بارے میں بتانے کے بعد اپنا مسئلہ پیش کیا۔

”استاد، یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔“ اس نے چٹکی بجا کر کہا۔

”کیوں، تمہارے ذہن میں کوئی ترکیب ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں میرے محلے میں ایک دوست کی دکان پر فون موجود ہے۔“ وہ بولا۔ ”اس وقت دکان بند ہوگی، میں اپنے دوست سے چابی لے کر کھولتا ہوں۔ آپ وہاں سے پولیس کو اطلاع دے دیجئے۔“

”شکر ہے، تم نے میرے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ اتار دیا۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”اب کافی پیوں گا تو زیادہ لطف دے گی۔“

”السلام علیکم۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ احساس ہوا کہ گڑبہ ہو گئی ہے۔ سلام پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے جواب دیا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید انہوں نے مجھے پہچانا نہیں۔ گویا اس سرسری سی ملاقات کے بعد وہ مجھے فراموش کر چکے تھے۔ میں تعارف کرانے ہی والا تھا کہ خیال آیا، معاملہ یونہی چلے دیا جائے۔ اسی شش و پنج میں کافی وقت گزر گیا۔ وہ آگے سے گئے اور بولے۔ ”کچھ کومے بھی یا فکر کر میری صورت ہی دیکھتے رہو گے۔“

”مم... میرا تعلق خفیہ پولیس سے ہے۔“ میں نے دروغ کوئی کا سارا لیتے ہوئے کہا۔ ”صورت سے تو تم اٹھائی گھرے لگتے ہو۔“ انہوں نے میرے نمربا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”گرد آلود کپڑے، کھلا گریبان اور پریشان زلفیں... صاحبزادے اس وقت نہ تو تم کسی مجرم کا عقاب کر رہے ہو اور نہ ہی ضرورتاً تم نے اپنا حلیہ تبدیل کر رکھا ہے پھر اتنے ہوشیاری کیوں بنے ہوئے ہو؟“

”میں در... در... اصل جلدی میں...“ الفاظ نوک زبان پر اگلے لگے۔ یہ گمان نہیں تھا کہ بڑے میاں اتنے ذی ہوش اور قیافہ شناس بھی ثابت ہوں گے۔

”کہیں تم یہ تو ظاہر نہیں کرنا چاہتے کہ خفیہ پولیس کے تمام کارکن اسی طرح کے ہوتے ہیں؟ مضصل... حواس باختہ... اور شب گرد۔“

”در اصل جلدی میں“ میں غلط گلی کے غلط مکان میں چلا گیا تھا۔ ”میں نے بات بتائی۔“ وہاں ایک خونخوار کتے سے ملاقات ہو گئی... معلوم نہیں کیوں ان لوگوں نے اسے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔

”تم جیسوں کی خاطر تواضع کے لیے۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہاں کے کتے بھی تم لوگوں سے بیزار ہیں۔“

”جج... جی ہاں۔“ میں نے شدت سے سر ہلایا۔

”تم ہر جگہ پر ہلکا کیوں رہے ہو؟ تمہاری زبان میں لکنت ہے یا یہاں کے کتوں کا خوف۔“ انہوں نے ایک اور حملہ کیا۔

”دونوں باتیں ہیں۔“ میں نے اپنی زبان پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”اچھا، اندر آ جاؤ... مالکہ تو ہیں نہیں... چلو کوارٹر میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”ہاں“ وہیں مناسب رہے گا۔“ میں نے کہا اور اندر چلا گیا۔ عبدل چاہا نے گیٹ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ پھر مجھے لے کر بنگلے کے عقبی حصے میں چلے گئے۔ وہاں دو سروٹ کوارٹر تھے۔ جس میں سے ایک کا دروازہ کھلا تھا اور بجلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

اس کوارٹر میں ایک چارپائی اور دو ٹین کرسیاں پڑی تھیں۔ اٹاٹ بہت کم تھا۔ غالباً وہ قناعت پسند تھے۔ میرے لیے انہوں نے ایک کرسی صاف کی اور بولے۔ ”اب اپنی آمد کا مقصد بھی

جی نے مجھے راہ بھائی۔“ لیکن ایک طریقہ اور بھی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”کیوں نہ ہم صابر کے مکان کی تلاش لیں۔ ممکن ہے وہاں سے کوئی کار آمد چیز ہاتھ لگ جائے جس سے تنظیم پر خاطر خواہ روشنی پڑ سکے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مگر اس کے مکان میں داخل ہونے سے پہلے، بہتر ہو گا کہ ہم دور سے جائزہ لے لیں اور صابر کے معمولات کا مشاہدہ کر لیں۔“

”یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔“ جی بولا۔

”تو پھر اٹھو۔“ میں نے کہا۔ ”میں نیلم کے گلشن والے بنگلے کا چکر لگاتا ہوں۔ تم فیڈرل بی ایریا کی طرف نکل جاؤ۔“

”آپ نیلم کے بنگلے کی طرف جا کر کیا کریں گے؟“ اس نے استفسار کیا۔

”مجھے یاد آتا ہے کہ وہاں عبدل چاہا سے ملاقات ہوئی تھی۔ اگر نیلم وہاں تنظیم کے اجلاس بلاتی رہتی ہے تو ممکن ہے عبدل چاہا ان لوگوں کے بارے میں کچھ بتا سکیں یا تنظیم کی سرگرمیوں پر کسی طور پر روشنی ڈال سکیں۔“

”ہاں“ یہ ٹھیک رہے گا۔ آپ عبدل چاہا سے ضرور ملاقات کیجئے۔“ جی بولا۔ ”مگر اپنی کھوپڑی بچا کر۔“

”یہ انتباہ شاید تم اس لیے کر رہے ہو کہ میں نے ان کی مالکہ، نیلم کو ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ یقیناً نیلم نے انہیں تاکید کی ہو گی کہ میں جہاں کہیں بھی دکھائی دوں، میرا حساب کتاب برابر کر دیا جائے یا کم از کم یہ ضرور کیا جائے کہ میں جب بھی بنگلے کی طرف رخ کروں، مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا جائے۔“

”آپ ٹھیک سمجھے۔“ جی نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ”اس لیے آپ کو مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ بنگلے کی طرف جانے سے پہلے اپنے سر پر توا ضرور باندھ لیں۔“

”اور ٹانگوں میں کرکٹ کے پیڈ۔“ میں نے اس کی پیٹھ پر دھول جماتے ہوئے کہا ”ڈفر کمیں کے۔“ تم نے مجھے اتنا بودا سمجھ رکھا ہے کہ میں ایک بوڑھے فروت کا مقابلہ نہیں کر سکوں گا۔“ ہم وہاں سے نکل کر بس اسٹاپ پر آئے۔ جی نے فیڈرل بی ایریا کے لیے بس پکڑی اور میں گلشن اقبال کے لیے مٹی میں سوافر ہو گیا۔ سوک سینٹر پر اتر کر میں نیپا چورنگی کی طرف چلا پھر بائیں جانب مڑ گیا۔ ریلوے اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر وہ بنگلا تھا جہاں مجھے نیلم لے گئی تھیں۔ عبدل چاہا سے گیٹ پر ہی ملاقات ہو گئی۔ وہ بیکری والے سے انڈے لے رہے تھے۔ اس وقت نوبے کا عمل ہو گا۔ اطراف کے تمام بنگلوں کی گیٹ لائٹس جل چکی تھیں اور گلی میں کچھ لوگ چل قدمی کر رہے تھے۔

بیکری والے نے اپنی سائیکل وہاں سے بڑھائی تو میں سمجھے کی آڑ سے نکلا اور ان کے قریب پہنچ گیا۔ ”ٹھہرے... ٹھہرے گیٹ بند نہ کیجئے گا۔“ میں نے کہا۔

”نو ٹھہرے گا۔“ انہوں نے مجھے اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔

بیان کر ڈالو؟

”میں آپ کی مالکہ نیلم کے متعلق تحقیق کر رہا ہوں۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

”ہوں۔“ انہوں نے مجھے نگاہوں ہی نگاہوں میں تولیا۔

”ہم تک جو اطلاعات پہنچی ہیں اس کے مطابق یہ ظاہر ہوتا ہے وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔“ میں نے نہایت احتیاط سے لفظوں کا انتخاب کر کے کہا۔

”ہوں۔“ انہوں نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے چہرے سے غرافت اور شوخی کی نقاب سرکتی جا رہی ہے۔ ”ملک دشمن۔“ وہ بڑبڑائے۔

”آپ اس پر کوئی روشنی ڈال سکیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کیا بتا سکتا ہوں؟“ وہ آہستہ سے بولے۔ ”تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے، میں

تو سمجھا تھا کہ۔۔۔“

”کیا؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”یہی کہ لڑکے شاید کوئی شغل کر رہے ہیں بلکہ یہ سمجھ رہا تھا کہ صاحب لوگ آئندہ ایکشن کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور اس سلسلے میں اپنی کوئی پارٹی بنا رہے ہیں... لیکن تم کہتے ہو کہ ملک دشمن...“ انہوں نے تذبذب میں پھر جملہ ناقص چھوڑ دیا۔

”یہ آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ نیلم اور اس کے ساتھی کوئی پارٹی بنا رہے ہیں؟“

”بنا رہے ہیں یا بنا چکے ہیں۔“ انہوں نے کہا۔ ”میں ایک بار ڈرامنگ روم کی صفائی کر رہا تھا تو مجھے صوفے کے نیچے سے ایک کارڈ ملا تھا۔ ممکن ہے ان میں سے کسی کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے چلا گیا ہو اور بعد میں نہ ملا ہو... کچھ عجیب سا کارڈ تھا۔“

”کیا لکھا تھا اس پر؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”کسی پرندے کی تصویر بنی تھی۔“ انہوں نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھہرو میں دیکھتا ہوں، شاید مل جائے۔“ انہوں نے چارپائی کے نیچے رکھے ہوئے ٹین کو کھینچ کر نکالا اور اس میں رکھے ہوئے کپڑوں کی حمیں الٹی پٹیں۔ بالآخر نچلے حصے سے ایک کارڈ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

بالشبہ یہ وہی کارڈ تھا جو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کا آدھا حصہ سفید اور آدھا سنہرا تھا۔ سفید والے حصے پر ایک عقاب کی تصویر تھی جس کے نیچے بلیک باک لکھا تھا۔ جبکہ سنہرے حصے پر دو جملے لکھے تھے۔ ”ہماری جدوجہد۔۔۔ سنہرے دنوں کے لیے۔“

”یہاں نیلم اور اس کے ساتھیوں کا اجتماع ہوتا ہو گا؟ میں نے پوچھا۔

”ہاں، مگر مجھے ان کے درمیان رہنے کی اجازت نہیں ہے۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”میں ملازم ہوں نا، میرا کام تو جھاڑ پونچھ اور چائے تیار کرنا ہے۔ لڑکے لڑکیاں اگر یہاں کوئی شغل کرتے ہیں تو مجھے اس سے کیا دلچسپی ہے۔“

”شغل سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”رات اور دن اجلاس ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے اور مذہب افراد اس میں شرکت کرتے ہیں۔ مگر میں نہیں جانتا کہ وہ آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں۔ گفتگو کے دوران مجھے اس طرف جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ دوسرے اگر ان میں سے کوئی کچھ کہہ رہا ہو اور میں اچانک ہی پہنچ جاؤں تو وہ خاموش ہو جاتا ہے۔“

اور کوئی بات؟“ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔

”اور تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سب ہی قسم کے لوگ آتے ہیں اور سب ہی قسم کے شغل ہوتے ہیں... تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ نیلم اور ملک دشمن۔“ وہ بڑبڑائے۔

غالباً ملک دشمن والی بات ان کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ گفتگو شروع کرتے وقت مجھے نیلم پر وطن دشمنی کا الزام نہیں لگانا چاہیے تھا، میں واقعات کی غیر معمولی صورت حال پر گفتگو کرتا اور وہاں ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں استفسار کرتا۔ بات از خود کھل جاتی بہر حال موضوع اب آگے بڑھ چکا تھا۔ میں نے ان کے تذبذب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میری بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ ممکن ہے، نیلم بظاہر کسی ایسی سرگرمی میں ملوث نہ ہو جسے وطن دشمنی کہا جاسکے مگر۔۔۔“

”تمہاری بات ماننے میں مجھے یوں تامل ہوتا ہے۔“ انہوں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”کہ اس کا باپ پرانا سیاست دان تھا۔ میں میاں نذیر الدین سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھے انہوں نے ہی ملازم رکھا تھا۔ اب تو وہ اس دنیا میں نہیں مگر انہوں نے نیلم کی تربیت اس انداز سے کی تھی کہ وہ وطن عزیز کی مخالفت میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”ہم تک پہنچنے والی اطلاعات ناقابل تردید ہیں۔“ میں نے اصرار کیا۔ ”آپ ذہن پر زور دے کر کوئی ایسی بات یاد کریں جو غیر معمولی ہو۔“

”غیر معمولی۔“ وہ بڑبڑائے۔ ”معلوم نہیں، اس بات میں غیر معمولی پن ہے یا نہیں... ایک ہفتہ پہلے یہاں ایک مشہور سیاسی لیڈر آیا تھا۔ مگر چوری چھپے... میرا مطلب ہے، اس کی کار کی کھڑکیوں پر سیاہ پردے پڑے ہوئے تھے وہ رات کو ایک بجے کے قریب آیا تھا۔ اس وقت یہاں دوسرے افراد بھی موجود تھے۔ وہ کار سے اتر کر ڈرامنگ روم میں نہیں گیا بلکہ اس کی کار سیدھی برآمدے میں پہنچ گئی۔ وہ وہاں سے اتر کر اندر چلا گیا۔ بس ایک لمحے کے لیے... میں صرف ایک لمحے کے لیے ہی اس کی جھلک دیکھ پایا تھا مگر اس لمحاتی جھلک میں میں نے اسے پہچان لیا۔“

”وہ کون تھا؟“

”وہ... وہ... دوغ...“ عبدل چاچا اپنا جملہ مکمل نہ کر سکے اور ان کے حلق سے ایک عجیب آواز نکلی۔ پھر وہ لہرا کر آگے گرے اور ساکت ہو گئے۔ میں بوکھلا کر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ ان پر بے آواز ریوالور سے فائر کیا گیا تھا کیوں کہ جس ثانیے ان کے حلق سے آواز نکلی، اسی لمحے میں نے ایک اور آواز سنی جیسی بوقل کا کارک کھلنے سے پیدا ہوتی ہے۔

ہوں اور وقتی طور پر بے ہوش ہو گئے ہوں۔

بالآخر میرا ہاتھ ان کے ہاتھ سے ٹکرایا۔ میں نے ان کی نبض ٹولی تو اسے ڈوبتے پایا۔

”چاچا... عبدال چاچا۔“ میں نے انہیں سرگوشی میں پکارا۔

”کک... کون؟“ ان کے حلق سے ایک کراہ آزاد ہوئی۔

”میں ہوں خفیہ پولیس کا آدمی۔“

”اچ... چھا... تہ... تم صحیح... کہتے تھے... یہ لوگ... دہن دشمن...“

”نی... نی... نی... نی... کو... کو... ان لوگوں... کے ساتھ... نہیں... نہیں شامل۔“ وہ اکھڑی

ہوئی سانسوں کے ساتھ کہہ رہے تھے۔ میرا سوال انہوں نے سنا نہیں تھا، یا پھر سن کر نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان کے حواس پر نلیم چھاگئی ہو اور انہیں افسوس ہو رہا ہو کہ وہ اس سازش میں کیوں شامل ہوئی۔

”اس لیڈر کا نام کیا ہے جسے آپ نے چند روز پیشتر دیکھا تھا؟“ میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

ان کی نبض ڈوب رہی تھی اور سانس ان کے سینے میں اٹک رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ انہیں طبی امداد پہنچا کر بھی نہیں بچایا جاسکتا۔ لہذا بھاگ دوڑ میں وقت ضائع کرنے سے بہتر تھا کہ میں اسے کارآمد مقاصد میں استعمال کرتا۔

”نام... لیڈر... ہاں... وہ... سیاسی۔“

دھنسا... میرا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ کیونکہ وہاں روشنی کا ایک دائرہ پکڑنے لگا تھا۔ کسی نے طاقتور نارنج کی روشنی پھینک کر جائزہ لیا تھا۔ روشنی انہیں جھاڑیوں کی طرف سے پھینکی گئی تھی۔ چونکہ میں فرش پر عبدال چاچا کے قریب لیٹا ہوا تھا اس لیے فوری طور پر مجھ پر روشنی نہیں پڑی۔ تاہم وہ دائرہ کسی وقت بھی مجھے اجاگر کر سکتا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا مجھے ہلاک کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

”ڈھب... ڈھب... ڈھب...“ میں اپنی دھڑکن کانوں میں سن رہا تھا۔

عبدال چاچا کے پاس پڑے رہنا، اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ کیونکہ وہ کھلے ہوئے دروازے کے ٹھیک سامنے پڑے ہوئے تھے۔ دو ہی صورتیں تھیں۔ میں ریٹکتا ہوا دروازے تک جاتا اور اسے بند کر دیتا، یا کم از کم دروازے کے سامنے سے ہٹ جاتا اور موقع پا کر، اپنے اپنے کسی سانپ کی طرح ریٹکتا ہوا باہر نکل جاتا۔ وہاں خود کو مقید کر لینے کا خیال مجھے درست نہیں معلوم ہوا۔ یوں میرے پھنسنے کے امکانات زیادہ تھے، لہذا میں کسی چھپکلی کی طرح ریٹکتا ہوا دائیں جانب کی دیوار کی طرف چلا گیا۔

یکایک کمرے میں جیسے روشنی کا سیلاب اٹھ آیا۔ پھر ایک عورت کا طویل اور بیجانی قہقہہ سنائی دیا۔ ”میں نے سرج لائٹ روشن کر دی ہے۔ راکومن، اب اسے کسی بھیکے ہوئے چوہے کی طرح پکڑ لو۔ یہ بچ کر نہیں جاسکتا۔“

میں یہ آواز سینکڑوں کیا ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

ان کی پشت دروازے کی طرف تھی اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں ان کے سامنے بیٹھا تھا مگر مجھے ان کے عقب میں کسی کی جھلک نہیں دکھائی دی۔ ممکن ہے، دور افتادہ جھاڑیوں کے پیچھے سے کسی نے فائر کیا ہو۔ وہ جھلک کا جتنی حصہ تھا اس لیے وہاں تاریکی کا راج تھا۔ قاتل نے اس تاریکی سے فائر اٹھاتے ہوئے وہاں پناہ لے لی ہوگی۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ پوری طرح سے محتاط تھے اور عبدال چاچا کی لاعلمی میں اس جھلک کی نگرانی کر رہے تھے۔ یہ تمام باتیں میرے ذہن میں پکڑنے لگیں۔ اگر قاتل اب بھی انہیں جھاڑیوں میں موجود ہے تو میری زندگی بھی یقیناً خطرے میں ہے۔ اس کمرے کی روشنی سے فائدہ اٹھا کر دوسرا فائر بھی کیا جاسکتا ہے اور میری زندگی کا چراغ بھی گل کیا جاسکتا ہے لہذا میں نے لپک کر بلب بجھا دیا۔ جس کا سوچ دائیں جانب کی کھڑکی کے قریب ہی تھا۔ میرے اٹھتے اٹھتے اسی قسم کی آواز دوبارہ ہوئی اور عقبی دیوار پر لگے ہوئے فریم کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ کیونکہ میں اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا اس لیے گولی فریم کے شیشے کو چاٹ گئی تھی۔ شیشے کی کڑیاں دور تک پھیل گئیں، پھر تاریکی چھا گئی۔

میرا دل انجانے وسوسوں سے دھڑکنے لگا۔ کمرے میں ایک لاش پڑی ہوئی تھی اور قاتل سامنے جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ میں تیسرے وار سے بھی بچ ہی جاتا۔ ہر چند کہ وہاں تاریکی تھی مگر مکمل تاریکی تو کہیں بھی نہیں ہوتی۔ اطراف سے آنے والی روشنی مجھے اجاگر کرنے کے لیے کافی تھی۔ قاتل ریوالور لیے موجود تھا۔ وہ میری کھوپڑی میں سوارخ کیے بغیر نہ رہتا۔

یہ خیال کر کے کہ ممکن ہے، عبدال چاچا میں ابھی کچھ جان ہو اور وہ اس سیاسی لیڈر کا نام بتا سکیں جو اس گھناؤنی سازش میں لوٹ ہے، میں اندازے سے ان کے قریب پہنچا تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اس لیے نادانستگی میں اس کرسی سے ٹکرایا، جس پر وہ بیٹھے تھے۔ کرسی میرے دھکے سے الٹ گئی۔ سنائے میں ایک تکلیف دہ شور ابھرا میں اسی وقت سامنے والی جھاڑیوں سے ایک شعلہ سا چکا اور کسی بوتل کا کارک اڑنے کی آواز بھی آئی۔ میں نے فوری طور پر خود کو نیچے گرا دیا... قاتل نے تیسرا فائر کیا تھا۔

میری دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ قاتل سامنے موجود تھا اور اس کمرے سے نکاسی کا ایک ہی راستہ تھا... سامنے کا دروازہ۔ میں کسی کو آواز دے کر مدد کے لیے بھی نہیں بلا سکتا تھا۔ خود پر کوئی تان لوثی دیکھ کر وہ نہایت اطمینان سے فرار ہو سکتا تھا جبکہ میں خون بہاتی لاش کے ساتھ وہاں تنہا رہتا ہوں اور لوگ مجھے قاتل سمجھ کر گھیر لیتے۔

تاریکی میں عبدال چاچا کو ٹٹونا بھی ایک وہاں تھا، کیونکہ نادانستگی میں میرا ہاتھ ٹھیک اس جگہ بھی پڑ سکتا تھا جہاں سے خون کا اخراج ہو رہا تھا۔ یوں میں خون آلود بھی ہو سکتا تھا۔ روشنی میں جانے پر لوگ خون دیکھ کر میری طرف فوری متوجہ ہو سکتے تھے۔ مگر انہیں تلاش کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا ممکن ہے، ان میں زندگی کی رمت باقی ہوتی، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ محض زخمی ہوئے

میں کہا۔ ”اس بار کوئی شعبہ کام نہیں آئے گا۔“

میں دم سادھے خاموش کھڑا رہا۔ اس کی آواز سے مجھے سمت کا اندازہ ہو گیا تھا مگر میں دروازے کے سامنے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

”اب تک تمہارے ساتھ نرمی برتی جا رہی تھی۔“ وہ پھر بولا۔ ”مگر تم نے اسے ہماری کمزوری سمجھا... اب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیا چیز ہیں۔“

میں جواباً بہت کچھ کہہ سکتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ ان حالات میں ایک چپ سو سکھ دیتی ہے۔ اگر اس وقت میں زبان کھولتا تو راکومن یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو جاتا کہ میں کمرے کے کس گوشے میں موجود ہوں پھر... یقیناً ”وہ اس کی مخالف سمت سے کمرے میں داخل ہو جاتا۔“

کچھ دیر دوسری جانب خاموشی چھائی رہی، پھر دہے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ محتاط انداز میں میری طرف بڑھ رہا تھا۔ بالکل کسی چپتے کی طرح۔ مجھے اعتراف ہے کہ وہ لمحات میرے لیے بے حد اعصاب شکن تھے۔ یہ ایک اعصابی جنگ بھی تھی جس میں فریقین کو ثابت قدم رہنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ کرسی کو اتنی دیر تک سر سے بلند اٹھائے رکھنا بھی مذاق نہیں تھا، مسلسل بوجھ سے میرے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ میرے بازو شل ہو جاتے، میں یک دم آگے بڑھا اور روشنی میں پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے راکومن اس وقت دروازے کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میں نے کرسی کھینچ ماری۔ اس نے بوکھلا کر فار کیا۔ ”ٹھس“ کی ہلکی سی آواز آئی اور ایک شعلہ میرے سر کے بالوں کو چھوٹا ہوا گزر گیا۔ راکومن کرسی میں الجھ کر گر پڑا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کھڑکی کی طرف چھلانگ لگا دی۔ پہلی جست میں میں کھڑکی کے قریب پہنچا اور دوسری میں اس سے باہر تھا۔ باہر گھنی بیلوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ عقبی کپاؤنڈ وال تھی اور اس پر ایک ”سے“ دوسرے سرے تک چنبیلی، بوگن ویلیا اور دیگر پھولوں کی بنیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں جلدی سے ان بیلوں کی آڑ میں ہو گیا لیکن کپاؤنڈ وال کے قریب پہنچ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

دیوار تقریباً ”نوفٹ اونچی تھی۔“

فرار کی راہ ایک بار پھر مسدود ہو چکی تھی۔

عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں کر میرا حلق ایک بار پھر خشک ہونے لگا۔ ایک درندہ ہاتھ میں سائنلنسر لگا دیو الوڑ لیے میرا تعاقب کر رہا تھا۔ تعاقب کا لفظ یہاں بے معنی لگتا ہے، وہ سائے کی طرح مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ میں ایک گھنی نیل کی آڑ میں ہو کر بے ترتیب سانسیں درست کرنے لگا۔ چند ہی لمحوں بعد، راکومن کی صورت دکھائی دی۔ وہ دیو الوڑ ہاتھ میں لیے چاروں طرف نگاہ دوڑا رہا تھا اور مجھے تلاش کر رہا تھا... میں قدرے مطمئن ہو گیا کہ کم از کم اس وقت تو اس کی نگاہ سے اوچھل ہوں... مگر کب تک؟ میں ساری رات تو وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک قدم بھی آگے بڑھاتا تو بیلوں میں جنبش ہوتی اور وہ میری موجودگی سے آگاہ ہو جاتا۔ اور اس کے بعد... اس کے بعد کیا ہو گا؟ یہ سوچنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں رہا۔

زندگی کے عزیز نہیں ہوتی؟ مگر اس کی قدر و قیمت کا اسی وقت احساس ہوتا ہے جب موت

نفرت و حقارت میں ڈوبی وہ آواز میری دشمن جان نیلم کی تھی۔

اب حقیقتاً ”بچنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ بے بسی کی ایک گہری سانس میرے حلق سے نکل گئی اور میرا جسم پسینے سے ہلکتا چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا راکومن تو ابھی اپنے سابقہ زخموں ہی کو شمار کر رہا ہو گا۔“

My Good Book
www.pdfbooksfree.pk

موت کو قریب پا کر بڑے بڑے پھنے خاں بھی حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں اور ان کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی ہوئی۔ ”دھپ... دھپ... دھپ“ تاریک جھاڑیوں کی طرف سے ہماری قدموں کی آواز آ رہی تھی اور دہشت سے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ موت کو اتنے قریب پا کر میں نے ایک بار پھر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اس خیال سے شاید فرار کی کوئی راہ سجھائی دے جائے جو میں نے جلدی میں نظر انداز کر دی ہو۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ دائیں جانب ایک کھڑکی تھی، جس کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور اس میں گرل بھی نہیں تھی۔ وہ ایک سروٹ کوارٹر تھا، اس لیے کھڑکی میں گرل لگانے کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ کھڑکی میری فرار کا ذریعہ بن سکتی تھی لیکن دشواری یہ تھی کہ کھڑکی دائیں جانب تھی اور میں بائیں جانب پڑا ہوا تھا۔ چون کہ میں اس دروازے کے سامنے نہیں تھا، اس لیے فوری دیکھ لیے جانے کا احتمال نہیں تھا... لیکن راکومن کے قریب آنے پر یہ ظاہر ہو جاتا کہ میں نے کس طرف پوزیشن لی ہے۔

نیلم کا کنارہ درست تھا۔ راکومن اس وقت مجھے کسی بھیجے ہوئے چوہے کی طرح پکڑ سکتا تھا... بیگا ہوا چوہا، جو اپنے ہماری جسم کی وجہ سے قدم نہیں اٹھا پاتا اور گر جاتا ہے یا پھر چیونٹی ایسی چال اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میری حالت تو اس وقت اس چوہے سے بھی بدتر تھی کیوں کہ میں دم سادھے دیوار سے چپکا پڑا تھا اور اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا۔

”دھپ... دھپ... دھپ“ ہماری ہونٹوں کی دھک اب بے حد قریب آگئی تھی۔ کسی بھی لمحے راکومن کوارٹر میں داخل ہونے والا تھا۔ میں نے فرش پر لیٹے لیٹے ٹانگ بڑھائی اور اس کرسی کے پائے میں پھنسا کر اپنی طرف کھینچ لی، جو اوندمی پڑی ہوئی تھی۔ پھر میں تیزی سے اٹھا اور کرسی کو جھٹکوں سے تھام کر سر سے بلند کر لیا۔ اب میں دم سادھے راکومن کا انتظار کر رہا تھا۔

دوسری طرف سے آنے والی قدموں کی چاپ ٹھم گئی تھی... شاید راکومن کو کسی گزبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ کوارٹر کا وہ حصہ روشنی میں تھا اس لیے اس نے مجھے کرسی کھینچنے دیکھ لیا ہو گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مجھ پر فائر نہیں کر سکا کیوں کہ میں فرش سے چپکا ہوا تھا۔ پھر یہ کہ میں نے اپنی ٹانگ محض چند ثانیوں کے لیے ہی اس کی طرف بڑھائی تھی۔

”خود کو میرے حوالے کر دو اور عقل مند کھلاؤ سکندر!“ راکومن نے استہزائیہ انداز

لیکن میں اس وقت اپنی کمین گاہ سے نکل کر سوئنگ پول کی طرف دوڑ رہا تھا۔ میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ فائرنگ کے دوران اگر آدمی آڑے ترچھے انداز میں بھاگے تو گولیوں سے بچ سکتا ہے۔۔۔ لہذا میں نے وہی انداز اختیار کر لیا۔

”ٹھس... ٹھس... ٹھس“ پے در پے کئی فائر ہوئے اور میری ٹانگوں کے آس پاس جگنو سے چمکے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دوڑتے قدموں کی آوازیں بھی سنیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ راکومن اس وقت بالکل چپٹا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ریوالور ہپ پاکٹ میں ڈال لیا تھا اور تیزی سے میرے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ سوئنگ پول سے کچھ فاصلے پر میں نے رفتار دھیمی کر لی۔۔۔ پھر راکومن قریب آیا تو میں اچانک ہی بیٹھ گیا۔ مجھ سے نکراتے ہی اس کے حلق سے ایک بے معنی آواز نکلی، پھر وہ اڑتا ہوا چھپا کر پانی میں گر پڑا۔ میں اس کا حشر دیکھنے کے لیے وہاں نہیں رکا بلکہ جنگل کے سامنے والے حصے کی طرف دوڑ لگا دی۔

گیٹ پر ایک شخص کھڑا دکھائی دیا۔ وہ جسمانی طور پر توانا نہیں تھا لیکن کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ بھی میرے لیے لوہے کا چنا ثابت ہو۔ جو تنظیم ملک میں انقلاب لانے کی تیاریوں میں مصروف ہو اور جس کا غیر ملکی طاقتوں سے اشتراک بھی ہو، اس کے کارکنوں سے کسی نرمی کی توقع رکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ اپنے آدمیوں... بادشاہ خان اور عبدل چاچا کو کسی حقیر کیڑے کی مانند کچل چکے تھے تو بھلا میری کیا حقیقت تھی۔ اپنے اب تک سلامت رہنے کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی اور وہ یہ کہ پہلے وہ مجھ سے اپنے چھ لاکھ وصول کر لینا چاہتے تھے۔ اگر ان کی اتنی بھاری رقم دہی ہوئی نہ ہوتی تو شاید اس وقت میں اپنی سرگزشت نہ سنا رہا ہوتا بلکہ یہ کسی کا لکھا ہوا محض ایک افسانہ ہی ہوتا جس میں لکھنے والا اپنی مرضی سے جتنا جی چاہتا مرجع سالہ لگا کر فرضی واقعات تحریر کرنا چلا جاتا۔

میں رک گیا اور ایک لمحے کے لیے جائزہ لیا، پھر قریبی کیاری سے دو بڑے بڑے ڈھیلے نکال کر سروٹ کوارٹر کی چھت پر اچھال دیے۔ کوارٹر کی چھت تین کی شیٹوں والی تھی، اس لیے پتھر برستے ہی قیامت کا شور مچ گیا۔ گیٹ پر کھڑا ہوا آدمی بری طرح چونک پڑا چند لمحے تو وہ کچھ سوچتا رہا، جیسے تذبذب میں گرفتار ہو، پھر بے تحاشا کوارٹر کی طرف دوڑ پڑا۔

راستہ صاف تھا۔۔۔ میں گیٹ کی طرف دوڑ پڑا۔۔۔ مگر اس وقت تو میرا دم ہی نکل گیا جب میں نے گیٹ کی کنڈی بند دیکھی اور اس میں جھوٹا ہوا فولادی تالا دیکھا۔ ان لوگوں نے ہر ممکن طریقے پر مجھے چھانسنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ میں بری طرح ہانپ گیا۔

میں نے اطراف میں ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی اور صورت حال کا جائزہ لیا۔ سروٹ کوارٹر کی طرف جانے والا محض جس کا نام ہلا کو تھا، کسی وقت بھی واپس آ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ راکومن کی جیم دھاڑ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سوئنگ پول سے نکل آیا ہے۔

گیٹ پر چوں کہ قفل لگا ہوا تھا، اس لیے ایک صورت تو یہ تھی کہ میں گیٹ پر چڑھ کر باہر کو کود جاتا، مگر اس صورت میں راکومن مجھ پر فائر کر سکتا تھا۔ اس کے ریوالور میں سائیکلر لگا ہوا تھا

انسان کی طرف بڑھ رہی ہوتی ہے۔ موت مجھ سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہی تھی اور وہ چوہا یقیناً” میں ہی تھا، بیٹھا ہوا چوہا۔

”راکومن... راکومن کیا ہوا؟“ دور کہیں سے نیلم کی آواز سنائی دی۔

”وہ سروٹ کوارٹر سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔“ راکومن غرایا۔

”اوہ، اسے تلاش کرو۔“

”بے فکر رہیں مادام! وہ کہیں نہیں جاسکتا۔“

”گیٹ پر کون ہے؟“ نیلم نے پوچھا۔ وہ کسی ایسی جگہ کھڑی تھی جہاں سے میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”ہلاکو“ راکومن نے جواب دیا۔

”ادکے۔ میں اندر جا رہی ہوں۔ اسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔ میں آج اس سے سارا

حساب بے باق کر لینا چاہتی ہوں۔“

میں کانپ کر رہ گیا۔ وہ اس وقت غصے کا آتش نشان بنی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں میرے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی۔

راکومن کھڑے کھڑے اکتا گیا تو چند قدم آگے آگیا۔ اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ میں آس اس ہی چھپا ہوا ہوں۔ مگر کہاں؟ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ میری حالت اس شخص جیسی تھی جو آسمان سے گر کر کجور میں اٹک گیا ہو۔ میں عبدل چاچا کے کوارٹر سے نکل آیا تھا مگر اس محل نما جنگل سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنی جیبیں تھپ تھپائیں تو انگلیاں پتلون کی چور جیب میں رکھے ہوئے چاقو سے نکرائیں۔ یک لخت میں اپنے آپ کو موت سے بہت دور اور زندگی سے قریب تر محسوس کرنے لگا۔ میں نے چاقو نکال کر کھولا اور اس کے دستے پر گرفت مضبوط کر لی۔ دل اس وقت اس انداز سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ چاقو سے ابھی تک میں نے سبزی ترکاری ہی کاٹی تھی کسی شخص کو زخمی نہیں کیا تھا۔ میں ایسا بھلا کیسے کر سکتا تھا۔ میں تو یاروں کا یار تھا، بے کسی کی آنکھ سے نکلا ہوا آنسو، میرے دل میں پھل چا دیتا تھا اور میں اس کے لیے آتش نمود میں بھی کود پڑنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔۔۔ میں بھلا قتل کیسے کر سکتا تھا۔۔۔ لیکن اس وقت راکومن کو قتل کیے بغیر وہاں سے نکلنا دشوار تھا۔ میں نے ایک جانب نگاہ دوڑائی تو مجھے کافی دور ایک سوئنگ پول دکھائی دیا۔ جس کی سطح چاندنی میں بھللا رہی تھی۔ اگر کوئی اس میں گر پڑتا تو فوراً ہی باہر نہیں آ سکتا تھا۔ کیوں کہ پانی زمین کی سطح سے کافی نیچے تھا۔

راکومن چند قدم دور کھڑا تھا۔ ریوالور کے دستے پر اس کی گرفت اب بھی مضبوط تھی اور وہ پوری طرح مستعد تھا۔ اس بات کا مجھے ہر حال اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ مجھے ہلاک نہیں کرے گا کیوں کہ نیلم نے مجھے اپنے پاس طلب کیا تھا۔ تاہم راکومن شدت اشتعال سے میرے ہاتھ پاؤں توڑ کر مجھے اپاچ ضرور بنا سکتا تھا۔ اس بات کی ہر حال نیلم نے اسے اجازت دے رکھی تھی۔ یکایک میں نے حلق سے ایک ڈری ڈری سی آواز نکالی اور فوراً ہی وہ جگہ جھوڑ دی۔ راکومن نے فائر کر دیا

کامو شک کر رہا تھا کہ کہیں انہیں کار کی ڈگی کا خیال نہ آ جائے۔
 ”کہاں سے تلاش کروں؟“ ہلاکو بولا۔ ”اگر کوئی چڑیا کا بچہ بھی اس طرف سے گزرا ہوتا تو میری نگاہ میں آ جاتا۔ یہاں جو بھی پھنستا ہے، مشکل ہی سے نکلنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کتنوں کے مقبرے تو میں اس وسیع و عریض لان میں بننے دیکھ چکا ہوں۔“
 خوف و دہشت کی ایک لہر نے مجھے اپنی پیٹ میں لے لیا۔ یہ انکشاف جان لیوا ثابت ہوا کہ مجھ سے پہلے کچھ بد نصیبوں کو مار کر انہوں نے بطور کھاد کیاریوں میں ڈالا ہوا ہے۔
 ”ممکن ہے وہ بنگلے کے اندر چلا گیا ہو!“

”ایسی صورت میں اندر جا کر اسے تلاش کرو۔“ ہلاکو بولا۔ ”مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں ہی جاتا ہوں۔ تم گیٹ کا خیال رکھنا، اور ہاں عبدل کو بیک اپ کر دو۔ ایسا نہ ہو کہ آنے جانے والوں کی نگاہ اس پر پڑ جائے۔“

”بہتر ہے... مگر کیا تم مادام کے سامنے انہی کپڑوں میں جاؤ گے؟“
 ”فی الحال تو مجبوری ہے۔“ راکومن کی آواز سنائی دی۔ ”میں اس خبیث کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔“

قدموں کی چاپ ابھری، دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ پھر وہاں سناٹا چھا گیا جس سے مجھے بے پناہ سکون کا احساس ہوا۔ موت کا خطرہ فی الحال ٹل گیا تھا۔ میں دیر تک دم سادھے وہیں پڑا رہا۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور متعدد قدموں کی چاپیں گونج اٹھیں۔ اچانک نیلم کی آواز سنائی دی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر میں واضح طور پر نہ سن سکا کہ اس نے کیا کہا تھا۔ پھر جیسے ہی کار اشارت ہونے کی آواز آئی، میرے حلق سے اطمینان کی سانس نکل گئی۔ کار آہنی دروازے پر آہنچی اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہم در زنداں سے نکل رہے تھے۔

اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ نیلم ہی کار چلا رہی ہے مگر کار کہاں جا رہی ہے اور اس کی منزل مقصود کیا ہے، میں اس سے بے خبر تھا۔ تاہم میں خوش تھا کہ موت کا فرشتہ ٹل گیا ہے۔ اب میں دعا گو تھا کہ شیطان کی اس خالہ سے بھی نجات مل جائے۔ کافی دیر بعد کار ایک جگہ رکی تو میں نے ڈرتے ڈرتے ڈگی کھولی۔ باہر سے روشنیوں کا سیلاب در آیا۔ کافی دیر سے تاریکی میں تھا، اس لیے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو معلوم ہوا کہ کار طارق روڈ پر متین سینٹر کے سامنے کھڑی ہے۔ متین سینٹر چوں کہ ان دنوں زیر تعمیر تھا، اس لیے نیلم کو وہاں کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ تب پھر وہ سامنے والے حصے میں گئی ہوگی اور جگہ نہ ملنے کے باعث کار اس طرف پارک کر دی تھی۔ ممکن ہے، وہ شاپنگ کرنا چاہتی ہو یا پھر شاید تنظیم کے کسی ممبر سے ملاقات ملے تھی۔ یہ شرفائش ایبل علاقہ تھا اور یہاں اس کے مطلب کی ہستیوں کی کمی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے، وہ ذہن میں کوئی ایسا ہی خیال لے کر ادھر آئی ہو۔ جہاں کار کھڑی تھی، وہاں قدرے تاریکی تھی۔ میں ڈگی کھول کر باہر آ گیا۔ رات کے دس بجے کا عمل رہا ہو گا... مگر طارق روڈ پر رنگ و نور کا

اس لیے اسے یہ خدشہ بھی نہیں تھا کہ باہر چلتا پھرتا کوئی شخص فائر کی آواز سن لے گا۔ ضروری نہیں تھا۔ میں گیٹ عبور کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ ابھی آدھا گیٹ طے کرتا اور اس دوران ہلاکو ہی واپس آ جاتا۔ ہر چند کہ وہ میری شکل و صورت سے واقف نہیں تھا مگر مجھے گیٹ پر چڑھا ہوا دیکھ کر اسے احساس ہو جاتا کہ مطلوبہ شخص میں ہی ہوں لہذا وہ میری ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ سکتا تھا۔

نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن موت تعاقب میں تھی اور سامنے ہلاکو تھا... مجسم ہلاکت کے روپ میں میں نے ایک بار پھر ذہن دوڑایا تو خیال آیا کہ میں بنگلے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو سکتا ہوں۔ تھوڑی دیر پھر نیلم اندر گئی تھی۔ دروازہ یقیناً کھلا ہوا ہو گا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں کمرے کی اندرونی پوزیشن سے آگاہ نہیں تھا۔ کون سا کمرہ کہاں ہے، کون سی راہداری کس طرف جاتی ہے، کہاں موت چھپی بیٹھی ہے اور کس طرف پناہ مل سکتی ہے۔ جب دوڑتے قدموں کی آوازیں بے حد قریب آ گئیں تو میں نے پور نیلم میں کھڑی ہوئی کار کے قریب پہنچ کر اس کی ڈگی کا ڈھکنا اٹھایا تو خوش قسمتی سے وہ بہ آسانی کھل گئی۔ ممکن ہے اس میں تھوڑی دیر قبل سامان لایا گیا ہو اور نیلم عجلت میں بند کرنا بھول گئی ہو۔

میں نے اس ٹنگ سی جگہ میں داخل ہو کر ڈگی بند کر لی۔ وہ جگہ قبر کی طرح ٹنگ اور تاریک تھی۔ مجھے جیتے جی، مرنے کا عذاب برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

ابھی مجھے وہاں پناہ لیے ہوئے ایک آدھ منٹ ہی ہوا تھا کہ میری توقع کے مطابق وہ ہانپتے ہوئے وہاں آن موجود ہوئے۔ وہ مجھے دکھائی تو نہیں دے رہے تھے مگر میں قدموں کی چاپ سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان میں سے کون کہاں ہے۔

”یہ... یہ تمہارے کپڑوں کو کیا ہوا؟“ ایک انجانی آواز نے پوچھا۔ یہ یقیناً ہلاکو ہی تھا کیوں کہ میں نے پہلے کبھی اس کی آواز نہیں سنی تھی۔

”کپڑوں کی پرواہ مت کرو۔“ راکومن غرایا... ”اسے تلاش کرو۔“
 ”کپڑوں کی پرواہ کیوں نہ کروں۔“ ہلاکو کی آواز آئی۔ ”تمہیں نمونیا ہو جائے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے سو ٹنگ پول میں چھلانگ کیوں لگا دی تھی؟“

”سو ٹنگ پول میں اس نے نہیں بلکہ میں نے چھلانگ لگائی تھی۔“ راکومن کی جھنجھلاہٹ اس وقت عروج پر تھی۔

ہلاکو نہایت اطمینان سے بولا ”اگر وہ چھری کی اولاد قابو میں نہیں آ رہا تو اتنے اشتعال میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، وہ تمہارے ہاتھ آ ہی جائے گا۔ اس وقت حسرت نکال لیتا۔“

”نکو اس بند کرو اور اسے تلاش کرو۔“ راکومن کسی بھیڑیے کی طرح غرایا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ اپنی ہی بوٹیاں نوچ ڈالتا۔

وہ دونوں کار پورج کے قریب کھڑے گفتگو کر رہے تھے اس لیے ان کی آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ میرا دل انجانے دوسوں سے دھڑک رہا تھا۔ یہ اندیشہ بھی رگ و جاں

”او کے پاس۔“ جی نے مسکرا کر کہا۔ ”خادم مہمان ہوٹل اور وہاں سے ڈینس کے نامہاں جگہ تک چلنے کے لیے تیار ہے۔“

تھوڑی دیر بعد ہم اپنے پسندیدہ ٹھکانے مہمان ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔ چونکہ دن بھر کی بھاگ دوڑ اور ہنگامہ آرائی کے بعد بھوک چمک اٹھی تھی۔ اس لیے میں نے قدرے پر تکلف کھانے کا آرڈر دیا جب کہ جی پر سری پائے کا بھوت سوار تھا۔ کھانے کے دوران ہم ڈینس جانے کے سلسلے میں تبادلہ خیالات بھی کرتے رہے۔

میں نے اور جی نے پروگرام بنایا اور اس کے مطابق ہم ڈینس سوسائٹی جا پہنچے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ جس کوٹھی میں تنظیم کا دفتر تھا، وہ مناف میاں کی کوٹھی سے بہت دور اور دوسرے فزیمیں واقع تھی۔ ہم نے کوٹھی کے محل وقوع کا جائزہ لیا۔ عمارت کا بیشتر حصہ تاریک تھا۔ جب کہ اوپر اور نیچے دو کمروں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ کوٹھی کے احاطے میں کوئی کار نظر نہ آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں سوائے چوکیدار کے اور کوئی نہیں ہے۔ جی کی تجویز یہ تھی کہ اطلاعی گھنٹی بجاکر چوکیدار کو بلایا جائے۔ وہ گیٹ پر آئے تو اسے زد میں لے کر اندر چلے جائیں۔ اس کی مشکلیں کس دیں اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیں پھر آنکھوں پر پٹی باندھ دیں۔ دفتر میں اس مخصوص کارڈ، فرسٹ اور تصویروں کو تلاش کریں۔ میں نے جی کی اس تجویز پر اتفاق نہ کیا۔ اس طرح مطلوبہ چیزیں حاصل کرنا انہیں شک و شبہ میں ڈال سکتا تھا۔ مجھے صرف اس مخصوص کارڈ کی تلاش تھی۔ جس سے اس تنظیم کا رکن بنا جاسکے۔ تصویروں اور کارڈ کا ملنا ممکن نہیں تھا کیوں کہ بادشاہ خان کے بے نقاب ہونے کے بعد انہوں نے ان چیزوں کو کہیں اور منتقل کر دیا ہو گا، وہ مزید محتاط ہو گئے ہوں گے کیوں کہ یہ چیزیں ان کے لیے عذاب بن سکتی تھیں۔

ہم دونوں اس کوٹھی سے کسی قدر دور کھڑے کوٹھی میں داخل ہونے کی تدبیر سوچ رہے تھے کہ ایک سفید رنگ کی سرسبز کوٹھی کے گیٹ پر آکر رک گئی۔ مخصوص انداز سے ہارن بجایا گیا تو چند لمحوں بعد گیٹ کھول دیا گیا۔ کار کی روشنی میں چوکیدار کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ چالیس برس کا صحت مند اور توانا شخص تھا۔ لمبا چوڑا تھا۔ چھ فٹ کا قیفاں رہا ہو گا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ کوئی خطرناک بد معاش نظر آ رہا تھا۔ اس کے سر پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسے بادشاہ خان نے زخمی کیا تھا بلکہ قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ کار میں کتنے آدمی تھے، کار میں تاریکی کی وجہ سے نظر نہیں آسکے۔ کار کے شیشے رنگین تھے اور چڑھے ہوئے تھے۔

کار اندر چلی گئی تو چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا۔ میں اور جی سڑک اور برابر والی گلی میں ٹپکتے ہوئے اس انتظار میں تھے کہ کار واپس آجائے تو ہم کوئی کاروائی کریں... پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ کار تو باہر نہیں آئی، البتہ ایک آؤ رکشہ اور آگیا۔ اس میں سے دو آدمی اترے۔ میں اور جی اس رکشا والے سے بات کرنے کے بجائے قریب پہنچے تو میں ان دونوں آدمیوں کو دیکھ کر چمک پڑا۔ میں انہیں خوب پہچانتا تھا۔ یہ دونوں خطرناک مجرم اور پیشہ ور قاتل تھے... جمال اور گلزار... ان پر کئی مقدمات بھی چل رہے تھے۔ وہ خون آشام درجہ تھے، نگ انسانیت تھے۔ انہیں جلدی

سیلاب آیا ہوا تھا۔ آنچل سرسرا رہے تھے اور نکھنیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں اطراف پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا ہوا کیفے لبرٹی میں جا بیٹھا اور چائے کا آرڈر دے دیا۔

چائے پینے سے ذہن پر چھایا ہوا غبار کچھ کم ہوا تو میں ایک رکشا میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچا تو جی میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں گھر کی چابی دروازے کے قریب ایک ایسی خفیہ جگہ رکھتا تھا جو جی کے علم میں تھی اور وہ بوقت ضرورت دروازہ کھول لیا کرتا تھا۔

”کیا رہا استاد؟“ وہ مجھے دیکھتے ہی چکا۔

”موت کے منہ سے بچ کر آ رہا ہوں۔“ میں نے کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت تو جسم کے تمام سپیریٹس ڈھیلے ہو چکے ہیں بلکہ چند نٹ بولٹ گر بھی چکے ہیں۔“

”اوہ... اوہ... بہت تشویش ناک بات ہے۔“ جی نے مصنوعی ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”رواگی کے وقت تمہیں ٹول بکس ساتھ رکھنا چاہئے تھا۔“

میں نے اسے آنکھیں دکھائیں اور کہا کہ وہ اپنی رپورٹ پیش کرے۔

”میں نے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ آپ میری پیٹھ ٹھوکنے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔“

”کو تو نے بغیر ہی ٹھوک دوں“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اس کام میں تو میں ماہر ہوں۔“

”نہیں... نہیں۔“ جی دور ہوتے ہوئے بولا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ اتفاق سے صابر

کیس لبا ہی گیا ہوا تھا، اس لیے مجھے اس کے گھر کی اچھی طرح تلاشی لینے کا موقع مل گیا۔ پہلے تو کوئی کار آمد چیز ہاتھ نہ لگی لیکن واپسی پر اچانک ہی میری نگاہ رومی کی نوکری پر پڑ گئی۔ اس میں چند کاغذات پڑے تھے، پڑوں کی شکل میں۔ میں وہ نوکری خالی کر کے لے آیا تھا۔ کافی دیر سے یہاں بیٹھا کھڑوں کو جوڑ رہا ہوں...“

”کچھ کامیابی ہوئی یا نہیں؟“

”کام ہی کام اور یابی ہی یابی۔ یہ دیکھئے۔“ اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ جس پر وہ پڑے چپکے ہوئے تھے۔ یہ ایک تحریری پیغام تھا... بے حد واضح۔

”آج رات... بارہ بجے... رپورٹ... ڈینس ۷ پارک ایونیو... نیلم۔“

”وہ مارا“ میں جوش مسرت سے اچھل پڑا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ان لوگوں کا کوئی ٹھکانہ

ڈینس میں بھی ہے۔ ممکن ہے وہی ہیڈ کوارٹر بھی ہو۔“

”تو پھر؟“

”بیٹ پوجا کر کے آج ہی چلو۔“ میں نے کہا۔

”مگر پیغام پر جو آج لکھا ہوا ہے ممکن ہے وہ گزشتہ چار روز پہلے والا آج ہو۔“ جی نے

سوچ کر کہا۔

”ہو سکتا ہے... مگر کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ ممکن ہے ہم کوئی سراغ لگانے میں

کامیاب ہو جائیں۔ ورنہ یہ تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ وہ لوگ اپنا گھناؤنا کاروبار ڈینس کے کس جگہ میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔“

سانا تھا بلکہ اندھیرا بھی تھا۔ ہم دونوں بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے اس کوٹھی کی دیوار کے پاس پہنچ کر رکے۔ کوٹھی کی دیوار کوئی چھ فٹ اونچی تھی۔ اس دیوار پر چار فٹ اوپر تک جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم نے جالی سے اندر جھانکا۔ ایسولینس کوٹھی کے عقبی حصے میں کھڑی تھی۔ وہاں لکڑی سی روشنی تھی۔ یہ روشنی ایک کمرے کی کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ ایسولینس میں روشنی نہیں تھی البتہ اس کے پچھلے دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے جیسے کوٹھی کے اندر سے کسی مریض کو لا کر ایسولینس میں رکھا جانے والا ہو۔ گاڑی کے پاس کوئی نہیں تھا۔ چند لمحے بعد سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ دو آدمی کوٹھی کے اندر سے سڑیچر اٹھائے تیزی سے باہر آئے۔ سڑیچر پر جو شخص بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا، اس کا جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا مگر اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ چہرہ صاف اور واضح نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو چہرے کے خدوخال کچھ نمایاں ہو گئے۔ وہ گھرار تھا۔ جی نے میرے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔ ”یہ تو گھرار ہے۔“

اس بد معاش کو سڑیچر پر دیکھ کر مجھے جو شدید حیرت ہوئی تھی، ایسی ہی حیرت جی کو بھی ہو رہی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ گھرار اس حالت کو بھی پہنچ سکتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہو گا۔ یکایک میرے ذہن میں آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ گھرار نے بادشاہ خان کو قتل کرنے، پولیس کے ہتھے نہ چڑھنے اور انعام کی ایک بڑی رقم پانے کی خوشی میں یہاں پہنچ کر مفت کی شراب پی کر جشن منایا ہو اور زیادہ پینے کی وجہ سے اس کی طبیعت خراب ہو گئی ہو۔ میں سوچتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

دونوں آدمیوں نے سڑیچر ایسولینس میں رکھا اور کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ کوئی پانچ سات منٹ بعد واپس آئے تو وہ دوسرا سڑیچر اٹھائے ہوئے تھے۔ اس سڑیچر پر جمال بھی مدہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ دوسرا سڑیچر بھی ایسولینس میں رکھ دیا گیا۔ ان دونوں میں سے ایک شخص تو سڑیچروں کے پاس بیٹھ گیا... اس نے عقبی دروازہ بند کر لیا، جب کہ دوسرا ایک کرسی سڑیچر پر جا بیٹھا۔ جیسے بہت عجلت میں ہو اور ان دونوں کو ہسپتال پہنچانا مقصود ہو۔ ابھی ایسولینس کا انجن سٹارٹ بھی نہیں ہوا کہ اندر سے دو آدمی باہر آئے۔ وہ اپنی وضع قطع سے اعلیٰ شخصیت کے حامل معلوم ہو رہے تھے گویا کوئی اعلیٰ سرکاری افسر یا کمپنی کے ڈائریکٹر ہوں۔ وہ ڈرائیور کے پاس پہنچے اور ان میں سے ایک شخص نے بارعب لمبے میں ہدایت کی۔ ”ہاشم سنبھل کر گاڑی چلانا۔ گھبرانے کی نہیں بلکہ ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ دونوں لاشوں کو ایک ہی جگہ ٹھکانے لگا دینا۔ کسی بھی سنسان راستے کی جھاڑی میں پھینک دینا یا پھر کسی مین بول میں ڈال دینا۔“ پھر وہ استہزائیہ انداز میں بڑبڑایا۔ ”کیہنہ! میں نے کہا تھا، بادشاہ خان سے کاغذات ہی نہیں اسے بھی ساتھ لے آؤ مگر انہوں نے اسے قتل کر دیا اور پھر ہمیں بلک میل کرنے لگے۔ ہونہ پچاس ہزار مانگ رہے تھے، اپنا خون ہمارے سر قحوظ رہے تھے۔ یہ خبیث زندہ رہتے تو ہمارا جینا حرام کر دیتے۔ ان کتوں کا یہی حشر ہونا چاہئے تھا۔ جاؤ لے جاؤ انہیں، اور واپس آ کر رپورٹ دینا۔ ہم لوگ صبح تک بیٹھیں ہیں۔“

ان بد معاشوں کی موت کا معمہ حل ہو گیا۔ ان کا دردناک انجام ہماری نظروں کے سامنے

تھی اور ان پر تکبر سا چھایا ہوا تھا لہذا انہوں نے ہماری طرف دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی... تاہم میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا تھا تاکہ وہ مجھے دیکھ کر پہچان نہ لیں۔ جی نے بھی یہی حرکت کی تھی۔ ایک نے جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکالے اور رکشے والے کی طرف بڑھا دیے۔ دوسرے نے آگے بڑھ کر اطلاع کھنٹی کاٹن دبا دیا۔ جمال ادائیگی کر کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا تو میں نے رکشے والے سے پوچھا۔ ”لانڈھی چلو گے۔ ہم آدھا گھنڈہ رک کر اسی رکشے میں ناظم آباد جائیں گے۔“

”میں پنجاب کالونی میں رہتا ہوں۔ رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ مجھے رکشہ بند کرنا ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔“ رکشہ ڈرائیور نے معذرت کی۔

”پچاس روپے لے لیتا“ جی نے اصرار کیا۔ ”جانا بہت ضروری ہے۔ چلو بھائی! ہم بڑی دیر سے یہاں سواری کے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔“

”اگر آپ سو روپے بھی دیں تو نہیں جاؤں گا۔ آخر ہم بھی انسان ہیں۔ ہمارے بھی بیوی بچے ہیں۔ صبح چھ بجے نکلتے ہیں تو واپسی میں یہ وقت ہو جاتا ہے۔“

ڈرائیور رکشا گھما کر مین روڈ پر نکل گیا۔ ہم بھی اسی طرف بڑھ گئے۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے مڑ کر کوٹھی کی طرف دیکھا تو اس کا گیٹ کھل گیا تھا اور دونوں بد معاش اندر داخل ہو رہے تھے۔ جی نے ایک دم چونک کر کہا۔ ”سکندر بھائی! میرا خیال ہے، بادشاہ خان کو انہی دونوں نے قتل کیا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ...“

”تمہارا خیال درست ہے۔“ میں نے تائید کی۔ ”یہ دونوں پیشہ ور قاتل ہیں۔ انہوں نے بادشاہ خان کو قتل کرنے کے لیے انہی دونوں کو مقرر کیا ہو گا۔“

ہم آپس میں باتیں کرتے ہوئے بڑی سڑک تک پہنچ گئے۔ نصف گھنٹے تک یہ ہوتا رہا کہ ہم مین روڈ اور گلیوں میں ملتے ہوئے اس گلی میں آ جاتے اور کوٹھی کے پاس آ کر اندر جھانک لیتے۔ جب ہم کوٹھی کے پاس سے گزر کر کھڑے پہنچے تو ایک ایسولینس مین روڈ سے گلی میں داخل ہوئی۔ اس کی تمام بٹیاں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ اس کوٹھی کے سامنے جا کر رکی، پھر اندر چلی گئی۔ ہم دونوں تیزی سے چلے۔ ایسولینس کی آمد کا مقصد سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوٹھی کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم نے اندر جھانکا تو ایسولینس نظر نہ آئی۔

”سکندر بھائی! دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسولینس عقبی حصے کی طرف کھڑی ہے۔“

جی کا اندازہ غلط نہیں تھا ہم تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کوٹھی کی عقبی گلی میں آ گئے۔ یہ علاقہ تو دن میں بھی دیران سنسان رہتا تھا، رات میں تو اس کا سناٹا اور گمبیر ہو جاتا... اس وقت بھی یہاں قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور یہاں کی کوٹھیاں اور بنگلے پر ٹکڑے مقبروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ کے وقفے سے اکا دکا کاریں زن زن کرتی اس طرح گزر جاتی تھیں جیسے کوئی عنقریب ان کے تعاقب میں رہا ہو۔ کوٹھی کی عقبی گلی میں نہ صرف گھرا

نیلیم کے بچکے کے سامنے والی قطار میں کار پر جو کوٹھی تھی، اس کے برابر ایک بڑا سا خالی پلاٹ تھا۔ میں اور جی کھڑے باتیں کر رہے تھے، اور اس انتظار میں تھے کہ نیلیم کے بچکے سے کوئی نکلے تو اسے کسی نہ کسی طرح اپنا شکار بنائیں۔ پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس گلی میں ایک کار داخل ہوئی اور نیلیم کے بچکے میں جا رکی۔ کار سے چار پانچ لڑکیاں اتریں۔ یہ کار اور لڑکیاں وہی تھیں جنہیں میں نے سفاری پارک میں دیکھا تھا۔ کار کا ہارن سن کر نیلیم برآمدے میں آگئی۔ اور بڑی گرم جوشی سے لڑکیوں کا استقبال کیا۔ پھر انہیں ساتھ اندر لے گئی۔ فوراً ہی اندر سے اس کی جواں سال خادمہ نے آکر گیٹ بند کر دیا۔

کوئی دس منٹ تک ہم دونوں کھڑے رہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ جی کے خیال میں کوئی نتیجہ برآمد ہونے والا بھی نہیں تھا۔ میرا ایک آپ بڑا دیا گیا تھا اور وقت بھی برباد ہو رہا تھا، مگر میں ابھی ناامید نہیں ہوا تھا۔ ہم دونوں اسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ نیلیم کے بچکے کا گیٹ کھلا تو بجلی سی کوندی۔ ایک لڑکی باہر آئی تھی۔ یہ لڑکی ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو کار میں آئی تھیں۔ کار والی لڑکیاں رنگین ملبوسات میں ملبوس تھیں۔ جب کہ یہ لڑکی سر تا پا سفید لباس میں، منجد چاندنی سی لگ رہی تھی۔ لڑکی بے حد حسین تھی، اس کے خدو خال سبک اور بڑے چل تھے۔ دھان پان سی اور دیماند قد کی تھی مگر تھی بڑی پرکشش۔ سفید لباس میں اس کا سراپا مزید حسین نظر آ رہا تھا۔ اس کی چال میں بڑی دلچسپی اور دل موہ لینے والی نزاکت تھی۔ اس کی نظر ہم پر نہیں پڑی تھی کیوں کہ وہ باہر آکر دائیں طرف چل دی تھی۔ اور اس نے ادھر ادھر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ جی کو میں پہلے ہی اپنا منصوبہ سمجھا چکا تھا۔ اس لڑکی سے مجھے کسی نہ کسی طرح رابطہ قائم کرنا تھا، دوستی پیدا کرنا تھی۔ یہ لڑکی نیلیم کے طبقے اور تنظیم میں معمولی حیثیت کی مالک اور متوسط طبقے کی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس لڑکی کا رخ بس سناپ کی طرف تھا جو فرلانگ بھر کے فاصلے پر تھا۔ جی میرے پیچھے چل رہا تھا۔ لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی جا رہی تھی۔ میں نے بھی اپنی چال تیز کر دی تاکہ اس کے قریب پہنچ جاؤں۔ وہ ایک گلی سے نکل کر سنان گلی کی طرف آئی تو اس کی مخالف سمت سے دو موٹر سائیکلوں پر چار لڑکے چلے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے ایک خالی رکشہ تھا۔ رکشہ والے نے موٹر سائیکل سواروں کو اور ٹیک کرتے ہوئے نکل جانا چاہا۔ لڑکی کسی سوچ میں تھی یا اس نے ان گاڑیوں کا کچھ خیال نہیں کیا تھا۔ وہ سڑک کے بیچ میں چل رہی تھی۔ رکشہ نے موٹر سائیکل سواروں سے آگے نکل کر ابھی موٹر بھی نہیں کاٹا تھا کہ لڑکی سے ٹکرا گیا۔ لڑکی سڑک پر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسا عجیب اتفاق بھی پیش آ سکتا ہے۔ میں لپک کر لڑکی کے پاس پہنچا اور اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ رکشے والا آگے جا کر رک گیا۔ موٹر سائیکل سوار بھی رک گئے۔ فوراً ہی بیجھڑ لگ گئی اور لوگ رکشہ والے کو برا بھلا کہنے لگے۔ رکشے والا میرے پاس آکر معافی مانگنے لگا اور گڑگڑانے لگا۔ ”جناب میری کوئی غلطی نہیں۔ یہ صاحب سڑک کے بیچ میں چل رہی تھیں۔“

تھا۔ انہیں شراب، شربت یا چائے میں زہر ملا کر پلایا گیا تھا۔ ورنہ انہیں راستے سے ہٹانا کھیل نہیں تھا۔ مجھے ان بد معاشوں کی موت پر خوشی ہوئی۔ تاہم اگر خود مجھے موقع ملتا تو میں ان دونوں کو کہیں زیادہ دردناک موت سے ہمکنار کرتا۔ اس لیے کہ ان دونوں نے بادشاہ خان کو جس پر تشدد اور اذیت ناک طریقے سے ہلاک کیا تھا، اس کے مقابلے میں ان کی موت بے حد پرسکون ثابت ہوئی تھی۔ دوسری طرف مجھے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ ہم پولیس کو بروقت اطلاع نہیں دے سکتے اور نہ ہی اس ایسویٹس کا تعاقب کر سکتے ہیں۔ پولیس کو اطلاع دینے سے لاش ٹھکانے لگانے والوں کی گرفتاری عمل میں آتی اور تنظیم کے کچھ لوگ گرفتار ہو جاتے۔ اس طرح تنظیم پر ایک کاری ضرب پڑتی۔ ٹیلی فون کرنے کے لیے کسی گھر سے مدد نہیں مل سکتی تھی کیوں کہ یہاں ہر شخص خود غرضی کا شکار ہوتا ہے۔

ایسویٹس بیک ہو کر تیزی سے کوٹھی کی عمارت کا چکر کاٹ کر بیرونی گیٹ کی طرف بڑھی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور وہاں چوکیدار کھڑا تھا۔ جیسے ہی گاڑی نکلی چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا۔ اب ہمارا وہاں کھڑے رہنا اور کوٹھی میں داخل ہونا بے کار تھا۔ ان لوگوں کی موجودگی میں دفتر میں داخل بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اندر کتنے آدمی موجود ہیں۔ ہم جان بوجھ کر اپنی جان کسی عذاب میں نہیں ڈالتا چاہتے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کورنگی روڈ پر پہنچے تو وہاں ایک خالی رکشا مل گیا تھا۔

ہم نے سوچا تھا کہ اگلی شب پھر قسمت آزمائی کریں گے، لیکن دوسری شب بھی ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دونوں بار اس کوٹھی کے احاطے میں کاریں کھڑی نظر آئیں اور اوپر بیچے کے کئی کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے اور جی نے فیصلہ کیا کہ ہمیں کوئی اور چکر چلانا چاہیے۔ چوتھے روز اخبارات میں جمال اور گلزار کے بارے میں خبر شائع ہوئی۔ پولیس نے کسی کی اطلاع پر دونوں کی لاشوں کو پیش ہائی وے کے قریب جھاڑیوں سے برآمد کر لیا تھا۔ اس خبر میں پولیس کا یہ بیان بھی شامل تھا کہ انہیں کسی نے شراب میں زہر ملا کر پلا دیا تھا۔ ان کی موت واقع ہو گئی تو لاشوں کو اس ویرانے میں پھینک دیا گیا تھا۔ پولیس نامعلوم قاتلوں کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

چوتھے روز کچھ سوچ کر میں عقیل احمد کے ہاں پہنچا تو وہ گھر پر مل گیا۔ اس کے ہاں سے ایک گھنٹے کے بعد نکلا تو میرا حلیہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ میں سیدھا جی کے ہاں پہنچا۔ جی بھی مجھے اس طے میں دیکھ کر بالکل پہچان نہ سکا۔ میں ایک نوجوان کے روپ میں ہی تھا لیکن میرے بالوں اور آنکھوں کا رنگ بالکل بدلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ میری فریج کٹ داڑھی اور مونچھیں بھی تھیں۔ میں مزید سارٹ اور وجیہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے جی کو اپنا منصوبہ بتا کر اسے اپنے ساتھ لیا اور سوسائٹی جا پہنچا۔ نیلیم کی رہائش سوسائٹی کے بچکے میں تھی۔ بچکے کے احاطے میں اس کی کار دیکھ کر تسلی ہوئی کہ وہ گھر پر موجود ہے۔ بچکے کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ جیسے کسی کا انتظار ہو رہا ہو۔ برآمدہ خالی پڑا تھا۔ احاطے میں اس کی کار کے سوا کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔

تھی۔ ایک شناختی کارڈ تھا جس پر اس کی تصویر چسپاں تھی۔ اس کا نام عالیہ لکھا ہوا تھا۔ اور پتہ عزیز آباد کا درج تھا۔

میں کسی سرکاری ہسپتال جاتا تو پولیس عفریت بن کر مجھے سے چٹ جاتی اور سینکڑوں سوال کر کے میرا ناٹھ بند کر دیتی۔ پرائیویٹ ہسپتال میں البتہ جھوٹ بول کر اپنا کام چلا سکتا تھا۔ ہسپتال پہنچنے میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ ہی وقت لگ گیا تھا۔ پھر بھی لڑکی ہوش میں نہیں آئی تھی۔ جیسے ہی رکشہ ہسپتال کے گیٹ کے سامنے رکا، میں نے اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور ایمر جنسی وارڈ میں چلا گیا۔ وہاں دو جونیئر ڈاکٹر موجود تھے۔ ایک ڈاکٹر نے مجھے دوسرے کمرے میں چلے جانے کے لیے کہا۔ میں لڑکی کو لے کر وہاں پہنچا تو سٹریچر موجود تھا۔ میں نے اسے سٹریچر پر لٹا دیا۔ رکشہ والا بھی میرے پیچھے ہی چلا آیا تھا اور بت پریشان ہو رہا تھا۔ دراصل اس کے دل میں ایسے ہی کا خوف سا گیا تھا۔

ڈاکٹر نے عالیہ کی نبض دیکھتے ہی مجھ سے پوچھا۔ ”کیا ہوا تھا ان کو؟ ایکسیڈنٹ کیس ہے؟ کب سے بے ہوش ہیں یہ؟“
”یہ گھر میں پھسل کر گر گئی تھیں۔ شاید سر میں چوٹ آئی ہے۔“ میں نے کہا۔
رکشہ ڈرائیور کا چہرہ خنجر ہو گیا۔

ڈاکٹر نے خوب اچھی طرح معائنہ کیا اور ایک پیڈ پر لکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ان کا نام؟“ میں نے نام بتایا تو اس نے پیڈ پر انجکشن اور دوائیاں لکھ کر دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ انجکشن اور دوائیاں ابھی لیتے آئیں اور کیشئر کے پاس جا کر ایک پرچی بنا لیجئے۔ سر کا ایکسرے بھی ہو گا۔“
”خطرے کی تو کوئی بات نہیں ڈاکٹر؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا انہیں ہسپتال داخل کرنا ہو گا؟“

”نی الوقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”ایکسرے دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہو گا۔ خدا خواستہ کوئی فریکر ہو ا ہے تو انہیں داخل کرنا پڑے گا۔“
رکشے والے کے تو اوسان خطا ہو رہے تھے۔ میں نے اس سے تیز لہجے میں کہا۔ ”جلدی سے جاؤ۔ پچیس روپے جمع کراؤ اور یہ دوائیاں لا کر پلٹے ہو۔“

وہ پانچ منٹ میں پرچی بنا کر اور ہسپتال کی عمارت سے متصل میڈیکل سٹور سے انجکشن اور دوائیاں لے کر آیا تو میں نے اسے رخصت کر دیا۔ اس حادثے میں رکشہ والا اور عالیہ دونوں ہی برابر کے قصور وار تھے۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے نرس سے انجکشن لگانے کے لیے کہا۔ نرس نے پہلے ایک انجکشن لگایا، دس منٹ بعد دوسرا لگایا اور چلی گئی۔ صرف میں اور عالیہ اس کمرے میں رہ گئے۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا کہ جیسے ہی مریضہ ہوش میں آئے تو اسے اطلاع دی جائے۔

میں عالیہ کے سٹریچر کے پاس کھڑا تھا۔ میری نظرس اس کے حسین چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں اس حسین ساحرہ کوچی بھر کے دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر اب کرب کی علامتیں تھیں۔ کسی کسی

”یہ میری کزن ہیں۔“ میں نے راہ گیروں سے کہا اور رکشہ والے کو اشارہ کیا کہ رکشہ لے آئے۔ وہ رکشہ لینے گیا تو میں نے لوگوں سے کہا۔ ”فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ خوف سے بے ہوش ہو گئی ہے۔ میں اسے ہسپتال لے جا رہا ہوں۔ یہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

جی بھی لپک کر پہنچ گیا تھا۔ میں نے جی کو اشارہ کر دیا کہ وہ انجان اور لا تعلق رہے۔ جی میرا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ کہیں لڑکی جلد ہوش میں نہ آجائے۔ اگر فوراً ہوش میں آگئی تو مجھے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ جیسے ہی رکشہ والا اپنا رکشہ لے کر پہنچا میں نے بغیر کسی تاخیر اور جھجک کے اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا۔ وہ کسی پچی کی طرح ہلکی پھلکی تھی۔ ایک راہ گیر نے اس کا پرس اٹھا کر میری طرف بڑھایا جس کا مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ پرس لے کر میں نے رکشہ والے سے کہا۔ ”خالد ہسپتال چلو۔“ میں نے لڑکی کو اپنے ساتھ بٹھا کر اسے سارا دے رکھا تھا۔ اس کا سر ڈھلک کر میرے کندھے سے ٹک گیا۔

”تم نے اسے اوور ٹیک کیا تھا۔“ رکشہ چل پڑا تو میں نے ڈرائیور کو ڈانٹا۔ ”اس حادثے کے ذمے دار تم ہو۔ تم لوگوں کی اس جلد بازی کی وجہ سے ہی حادثے ہوتے پیش آتے ہیں۔“
”صاحب جی معاف کر دیجئے۔“ وہ عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے غالت سے بولا۔ ”ان کے علاج پر جو کچھ خرچ ہو گا، میں ادا کر دوں گا۔ فکر نہ کریں۔ ان کا اچھی طرح سے علاج کرائیں۔“
”اگر اس کے دماغ میں چوٹ آئی ہے تو اس کی ساری زندگی خراب ہو جائے گی۔ اور پھر اس کے علاج پر ہزاروں روپے خرچ آسکتے ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ اس لڑکی کے والد میرے چچا ہیں اور وہ ناظم آباد کے ایس بی ہیں۔ وہ تم جیسے لوگوں کو ٹھیک کرنا خوب جانتے ہیں۔ تم جانو اور وہ جانیں۔“

ایس بی کا سن کروہ مزید خائف ہو گیا اور میری منت سماجت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک غریب آدمی ہوں۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم فرمائیں۔ میرے سات چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اگر میں جیل چلا گیا تو میرے بوی بچے بھوکے مرجائیں گے۔“

”پھر تم ایسا کرو“ میں نے کہا ”ہسپتال میں جو ابتدائی اخراجات ہوں گے تم اپنی جیب سے ادا کرو گے۔ تمہیں سزا دینے اور آئندہ محتاط رہنے کے لیے چھوٹی سی سزا دے رہا ہوں۔ آئندہ کسی کی زندگی سے اس طرح مت کھیلا۔ اس کے بعد تم چلے جانا۔ میں اپنے چچا سے کوئی نہ کوئی بہانہ کر دوں گا۔“

رکشہ سڑکوں پر ہچکولے کھاتا اور فرائے بھرتا ہوا ہسپتال کی طرف جا رہا تھا۔ لڑکی کی رہنمی ہستی کا سارا زور میرے شانے پر تھا۔ اس کے لباس سے ایک عجیب سی محک پھوٹ رہی تھی جس نے میرے حواسوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، لیکن میرے جذبات میں کوئی لاپل نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ میرے دل کے کسی گوشے میں بھی ہوس کی رفق موجود نہیں تھی۔

میں نے ڈرائیور کی نظر پھا کر پرس کا جائزہ لیا تو اس میں سو کے پانچ نوٹ اور دس کے دو نوٹ نظر آئے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا رہنمی پر ٹنڈ رومال، لپ سنک اور غازے کی ڈبیا بھی

سدا ہی خون نچوڑ لیا۔ میری جیب میں چاقو موجود تھا، میرا دوست چاقو... جسے میں کسی بھی قیمت پر خود سے جدا نہیں کر سکتا اور جس نے ہر برے وقت میں میرا ساتھ دیا تھا۔ آج اس دوست کی وجہ سے میں ایک بڑی مصیبت سے دوچار ہونے والا تھا... بہر کیف، میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ میں کوئی تدبیر سوچ رہا تھا تاکہ چاقو سے نجات حاصل کر سکوں۔ انپکڑ میری جامہ تلاشی بھی لے سکتا تھا۔

انپکڑ نے منہ پر کے قریب پہنچ کر نرس اور ڈاکٹر کو ایک طرف ہٹایا۔ اسے شاید اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ عالیہ کس کو قاتل کہہ رہی ہے اور کس شخص سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے چلا رہی ہے۔ انپکڑ کو دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے عالیہ کے قریب پہنچ کر اسے تسلی دی۔ ”گھبراؤ نہیں... ڈرو نہیں... تاکہ وہ کون ہے جو تمہیں قتل کرنا چاہ رہا تھا؟“

عالیہ مزید سمٹ گئی۔ وہ کسی سہمی ہوئی چیز کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ چند ثانیوں تک انپکڑ کو دہشت زدہ نظروں سے گھورتی رہی جیسے اب اسے وہ پولیس افسر قاتل نظر آ رہا ہو۔ پھر اس نے چونک کر متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، اس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کر دیا۔ ”یہ... یہ قاتل ہے۔“

انپکڑ نے تیزی سے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ ”کون یہ؟“ اس نے عالیہ سے تصدیق چاہی۔ عالیہ کی تصدیق پر اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔ اس نے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر حیرت کی جگہ پیشہ ورانہ سختی نے لے لی۔ اس نے میرے قریب پہنچ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”اچھا تو تم اس لڑکی کو قتل کرنا چاہ رہے تھے؟“

معلوم نہیں کیسے، حالات کی سنگینی کے باوجود مجھے انپکڑ کی بات پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میں نے اس کا غصہ نظر انداز کرتے ہوئے شوق لہجے میں کہا۔ ”انپکڑ صاحب! کون ایسا شقی القلب ہو گا جو ایسی حسین و جمیل لڑکی کو قتل کرنا چاہے گا۔ یہ لڑکی تو مجھے قتل کر رہی ہے بلکہ برسوں سے قتل کرتی چلی آ رہی ہے۔“

”کیو اس بندہ کرو۔“ انپکڑ دھاڑا۔ ”یہ لڑکی ابھی چچ کر کیا کہہ رہی تھی؟“

”یہ جو کچھ بھی کہہ رہی تھی، اس میں کوئی صداقت نہیں۔“ میں فوراً سنجیدہ ہو گیا۔ ”یہ لڑکی میری کزن ہے۔ بھائی اسے کیوں قتل کرنے لگا؟“

”لڑکی کی بات میں کتنی صداقت ہے وہ تو تمہیں قاتل چل کر ہی معلوم ہو جائے گا۔ تم اسے کزن بتا کر اپنی جان نہیں چھڑا سکتے۔“ انپکڑ نے عالیہ کی طرف پلٹ کر پوچھا۔ ”کیا یہ شخص تمہارا کزن ہے؟“

”نہیں“ عالیہ نے نفی میں سر ہلا کر خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”یہ قاتل ہے۔ اس نے میرے باپ کو قتل کیا تھا۔ میرے بھائی کو سمندر میں پھینک دیا اور اب مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ یہ مجھے چاقو سے ڈرا رہا تھا۔“

عالیہ کا آخری جملہ مجھ پر بم بن کر پھلا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر سمندر میں گرا دیا گیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی تھی۔ ڈاکٹر

لمحے اس کے عتابی رخساروں پر ایک رنگ سادوڑ جانا حالانکہ وہ بے سدھ پڑی تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا، اس حسین لڑکی نے اپنی زندگی، جوانی، حسن اور مستقبل، نیک کی تنظیم میں شامل ہو کر تباہ کر لیا تھا۔ یہ بھی دوسری سر پھری لڑکیوں کی طرح ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ معلوم نہیں تنظیم میں اس کے لیے کون سی کشش تھی۔ جی معلوم نہیں کہاں رہ گیا تھا۔ شاید اسے رکشا نہیں ملا تھا، ورنہ وہ پہنچ چکا ہوتا۔ مجھے اب ذرا اطمینان سا ہو رہا تھا کہ عالیہ کے ہوش میں آنے کے بعد انسانیت کے جذبے کے تحت ہمارے مراسم بڑھ جائیں گے اور پھر میں عالیہ کی مدد اور تعاون سے نیک کی تنظیم میں شامل ہو کر اس کی جڑیں آسانی سے کاٹ سکوں گا۔

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ عالیہ کو ہوش آ رہا ہے۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور خلا میں گھورتی ہوئی کراہتی رہی۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، اس کا حسین چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر پوچھا۔ ”مس عالیہ اب تم کیسی ہو؟“

”تم...؟“ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ پھر وہ ہڈیانی انداز میں چیخی۔ ”بچاؤ... بچاؤ... اس قاتل سے بچاؤ۔ یہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے... بچاؤ۔“

اس کی چیخوں سے سارا ہسپتال گونج اٹھا۔ چند ہی لمحوں میں وہاں خاصی بھیڑ ہو گئی۔ ان میں نرسیں، ڈاکٹر اور ایسی عورتیں اور مرد بھی شامل تھے جو اپنے عزیزوں سے ملنے آئے تھے۔ ایک پولیس انپکڑ تیزی سے بھیڑ کو چیرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

عالیہ کی اس غیر متوقع حرکت نے مجھے ہراساں کر دیا۔ ایک سردی لہر میری ریڑھ کی ہڈی سے گزر کر پیروں میں اتر گئی۔ میں حیرت سے عالیہ کو دیکھ رہا تھا اور دم بخود کھڑا تھا۔ دل کی دھڑکن ہر لمحے بڑھ رہی تھی۔ سینہ دھوکئی کی طرح چل رہا تھا۔ عالیہ مجھے اس طرح متوجہ پا کر مزید خوف زدہ ہو رہی تھی۔ وہ دیوار سے لگ کر سہمی ہوئی نظری بن گئی، اور اس طرح کانپنے لگی... جیسے لرزے کی مریض رہی ہو۔ پولیس انپکڑ کمرے میں جمع لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا تیزی سے میری طرف چلا آ رہا تھا۔ شاید اسی کمرے پر سدرے کتے ہیں۔

عالیہ نے چیخنا چلانا موقوف نہ کیا۔ جیسے میں ہاتھ میں کوئی تیز دھار خنجر لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اب بھی گلا پھاڑ کر چیخ رہی تھی اور اس کی دل خراش چیخوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ لوگوں کی وجہ سے الگ کمرام سا چھا ہوا تھا۔ تیز و تند، چیخ چلاتی آوازوں کے علاوہ سہمی سہمی سرگوشیاں بھی ہو رہی تھیں۔ ہر سمت سے عجیب عجیب آوازیں اور جملے سنائی دے رہے تھے جو میرے کانوں میں گرم گرم سیسے کی طرح اتر رہے تھے۔ لوگوں کی آنکھوں میں ایک اضطراب اور بے چینی کی لہر سی تھی جو ہر ہستی میں حلول کر گئی تھی۔ ایک طرح سے انپکڑ میرے لیے فرشتہ رحمت بن کر وارد ہوا تھا۔ اگر وہ نہ آتا تو شاید وہ لوگ مجھ پر پل پڑتے اور میرا بھرکس نکال کر رکھ دیتے۔ دوسری طرف وہ میرے لیے کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بھی بن سکتا تھا۔

دھنکا! ایک اور خیال کے تحت میں سن ہو کر رہ گیا اور اس خیال نے گویا میرے بدن کا

تھیں۔ خواتین راستہ بتاتی ہوئی چلی گئیں، مگر لڑکوں اور مردوں نے ڈاکٹر کی بات پر کان نہیں دھرے۔ وہ جیسے ابھی وہاں سے ملتا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں نہ صرف تماشا دیکھنے کو مل رہا تھا بلکہ وہ عالیہ کے حسن و جمال سے بھی سیراب ہو رہے تھے۔ کوئی چادر نہیں تھی ورنہ میں اس سے عالیہ کا بدن ڈھانپ دیتا۔ اس عالم میں لیٹی وہ بے حجاب سی لگ رہی تھی۔ انپکڑ نے دیکھا کہ مجھے پر ڈاکٹر کی درخواست کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اس کے چہرے پر کڑھکی پیدا ہو گئی۔ وہ سخت لمبے میں بولا۔ ”سنا نہیں آپ لوگوں نے، ہٹ جائیں یہاں سے“

انپکڑ کی سخت گیری کام آگئی اور چند ہی لمحوں میں میدان صاف ہو گیا۔ ان لوگوں کے نکلنے ہی انپکڑ نے دروازہ بند کر دیا۔

ڈاکٹر عالیہ کا معائنہ کر رہا تھا اور میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ڈاکٹر کی بروقت مداخلت کی وجہ سے میں ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے سے بچ گیا۔ زیادہ خوف اس وجہ سے بھی تھا کہ میں اپنے اصلی محلے میں نہیں تھا، دوسرے میری جیب میں چاقو تھا۔ بات بڑھتی تو سیدھا حالات کی ہوا کھاتیا۔

ڈاکٹر نے عالیہ کا معائنہ کرنے کے بعد نرس کو کچھ ہدایات دیں تو وہ بھی کمرے سے چلی گئی۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔ ”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایکسے لینا ضروری ہے کہیں گرنے سے کوئی فرق نہ ہو گیا ہو۔ ہڈیاں کی وجہ سے محسوس ہو رہا ہے کہ اندرونی طور پر شدید چوٹ آئی ہے۔ ابھی نرس آکر انجکشن لگا جائے گی۔ اس کے بعد فوراً ایکسے کروالیں۔ جیسے ہی ایکسے مل جائیں، لا کر مجھے دکھائیں۔“

ڈاکٹر چلا گیا مگر انپکڑ نہیں گیا۔ وہ ابھی تک براہمان تھا، جیسے پوری طرح مطمئن نہ ہوا ہو۔ اس نے پہلے تو میری طرف دیکھا، پھر عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جج جج بتائیں، یہ گھر میں گری تھیں یا تمہاری کار سے ٹکرائی تھی؟“

”میرے پاس اور کار...؟“ میں مسکرایا۔ ”میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس تو سکوڑ تک نہیں ہے۔“

انپکڑ پندرہ منٹ تک کمرے میں ہی رہا۔ اس نے مجھے اپنی باتوں اور سوالوں سے گھیرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اسے پوری طرح اطمینان ہو گیا تو وہ رخصت ہو گیا۔

نرس نے دوبارہ انجکشن لگا دیا اور عالیہ کی نبض بھی دیکھی۔ میں نے نرس کی مدد سے عالیہ کو دوسرے سٹریچر پر ڈالا اور بے ہوشی کی حالت میں ہی ایکسے کروالے۔ پھر میں نے ایک پرائیویٹ روم لے لیا۔

نرس مجھے بتا گئی کہ عالیہ کے ہوش میں آنے کے لیے نصف گھنٹہ درکار ہے۔ اب اس کمرے میں ہم دونوں ہی تھے۔ میں عالیہ کے حسین چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ کیا اس کے گھردلوں کو خبر کر دوں۔ میں اسے تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا ٹیلی فون نمبر عالیہ کے پاس سے ملا تھا جہاں میں اس حادثے کی اطلاع دے سکتا۔

میرے اور انپکڑ کے درمیان آگیا اور بولا۔ ”جناب! بات یہ ہے کہ مریض اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔ اس لیے ہڈیاں بک رہی ہے۔ یہ صاحب تو انہیں ہسپتال لے کر آئے تھے۔ اگر لڑکی کو قتل کرنا مقصود ہوتا تو اسے یہاں کیوں لاتے؟“

”ہسپتال لے کر آئے تھے؟“ انپکڑ نے جملہ دہرایا۔ ”کس لیے... لڑکی کو کیا ہوا تھا؟“

”لڑکی پھل کر گر گئی تھی۔ شاید دماغ پر چوٹ آئی ہے۔“ ڈاکٹر نے وضاحت کی۔

”مگر...“ انپکڑ نے عالیہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مگر استعجاب تھا۔ ”یہ تو ٹھیک خاک نظر آ رہی ہے۔“

”بظاہر...“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اس کے دماغ میں اندرونی چوٹیں نظر آئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ یادداشت کھو چکی ہے ذرا اس سے آپ نام پوچھ کر دیکھیں۔“

انپکڑ نے عالیہ کے قریب جا کر پوچھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے...؟“

”میرا نام؟“ عالیہ ذہن پر زور دے کر سوچنے لگی۔ ”میرا کوئی نام نہیں... ہاں ہاں، میرا نام ہے، پولیس۔“

لوگوں کے بیک وقت چہننے سے ایک شور مٹا اٹھا اور کمرے کے ماحول پر چھائی ہوئی تھکن چھٹنے لگی۔ اب انپکڑ کے لیے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ کمرے میں موجود لوگوں کے تاثرات یکسر بدل گئے تھے۔ ڈاکٹر نے پلٹ کر لوگوں سے درخواست کی۔ ”پلیز، آپ لوگ چلے جائیں۔“

”کیا یہ کوئی دورہ تھا؟“ انپکڑ نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”جی ہاں...“ ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ ”شدید خوف اور صدمے کے باعث ایسے دورے پڑنا کوئی انوکھی بات نہیں۔“

”ہائے میرا دل۔“ دفعتاً عالیہ نے ایک ہاتھ سے اپنا دل دبایا اور چلائی۔ ”میرا دل نکل رہا ہے۔ یکایک اسے ابکا ہی آئی تو اس نے دوسرا ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ قریب کھڑی نرس نے فوراً ہی سٹریچر کے نیچے رکھی ہوئی پلاسٹک کی بائنی نکال کر عالیہ کے قریب کر دی۔ عالیہ نے منہ سے ہاتھ ہٹا کر تے کر دی۔ اس نے وقفے وقفے سے تین بار تے کی پھر بڑھال ہو کر بستر پر گر پڑی اور آنکھیں بند کر لیں، پھر اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔

عالیہ بستر پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ نرس اسے سیدھا کر کے بستر پر لٹانے لگی کیوں کہ اس حالت میں وہ نیچے بھی گر سکتی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کی اس لیے کہ وہ ایک دھان پان سی لڑکی تھی۔

ڈاکٹر نے گھوم کر ان بوتلوں کی طرف دیکھا جو ابھی تک کمرے میں کھڑے تھے، پھر بڑے نرم اور شائستہ لمبے میں بولا۔ ”پلیز... آپ لوگ تشریف لے جائیں اور ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔ مریض پر دماغی دورہ پڑا تھا، اب اسے آرام کی ضرورت ہے۔“

کمرے میں موجود لوگوں میں زیادہ تعداد لڑکوں اور مردوں کی تھی۔ خواتین برائے نام ہی

تو سمجھے کہ وہ خطرے سے باہر ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے چند اور دوائیں لکھ دیں۔
میں عالیہ کے کمرے میں پہنچا تو نرس وہاں موجود تھی۔ اور اس کے بازو میں انجکشن لگا رہی
تھی۔ میں نے نرس کے جاتے ہی اسے ڈاکٹر کی تمام باتیں بتائیں تو وہ تشویش سے بولی۔ "مجھے یہاں
مزید تین گھنٹے گزارنا ہوں گے۔"
"زندگی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز قیمتی نہیں ہوتی۔ تین گھنٹے گزرتے دیر بھی کتنی لگتی
ہے۔"

"کیا میں اپنے محسن کا نام پوچھ سکتی ہوں؟"
"میرا نام محسن ہی سمجھئے۔ آپ مجھے محسن کہہ کر مخاطب کر سکتی ہیں۔ لیکن میں آپ کا محسن
نہیں ہوں۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔"
"آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اسے ساری زندگی بھلا نہیں سکوں گی۔"
"کوئی کسی پر احسان نہیں کرتا۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ مصیبت میں دوسروں کی مدد
کرے۔"

"کتنے انسان اپنا فرض پھلتے ہوں گے۔" وہ کہنے لگی۔ "میں یہ بھی نہیں جانتی کہ آپ
کون ہیں؟ میں نہ تو آپ کی دوست ہوں اور نہ ہی کوئی رشتہ دار، مگر آپ نے جو کچھ کیا ہے، اس
نے ہمیں خلوص کے ایک پاکیزہ رشتے میں باندھ دیا ہے۔"
"میں آپ کے لیے یہ انجکشن اور دوائیں لینے جا رہا ہوں۔ آرام کیجئے۔ آپ کے لیے
آرام بہت ضروری ہے۔"

"آپ سارے اخراجات بھی برداشت کر رہے ہیں۔" وہ بولی۔ "آپ جس ہسپتال میں
لے کر آئے ہیں یہ ایک مہنگا ہسپتال ہے۔ آپ نے اب تک جو کچھ خرچ کیا ہے اور مزید جو کچھ
خرچ ہو گا وہ میں ادا کر دوں گی۔ میرا پرس کہاں ہے؟" وہ سراپد ہو گئی۔

"یہ رہا آپ کا پرس۔" میں نے سرہانے رکھا ہوا پرس اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔ پھر
جیب سے اس کی رقم نکال کر بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے احتیاطاً پرس سے رقم نکال لی تھی۔
کیس افزائری میں کوئی پرس سے رقم نہ اڑا لے جائے۔"
"محسن صاحب! پلیز، آپ اس رقم کو اپنے پاس ہی رکھیں۔ زیادہ رقم خرچ ہو تو میں گھر
چل کر وہ بھی ادا کر دوں گی۔" اس نے کہا۔

اس کے شدید اصرار کے باوجود میں نے رقم نہیں لی۔ میں نے اس کی رقم پرس میں ڈال
کر پرس اس کے سرہانے رکھ دیا اور پوچھا۔ "مناسب سمجھیں تو میں آپ کے گھر والوں کو اطلاع
دے دوں؟"

"نہیں، نہیں" اس نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔ "میری امی اور بھائی پریشان ہو جائیں گی۔
یہاں بھی میری امی دل کی مریض ہیں۔ ہسپتال کا نام سننے ہی انہیں دل کا دورہ پڑ جائے گا۔"
میں انجکشن اور دوائیں لے کر آیا تو نرس نے اسے ایک اور انجکشن لگا دیا۔ پھر دوا کی

کوئی میں منٹ بعد آہستہ آہستہ عالیہ کو ہوش آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پوری طرح
ہوش میں آگئی۔ میں دانستہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھا تھا اور اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ وہ
آنکھیں کھول کر چھت کی طرف دیکھتی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خالی اندھن ہو کر خلا میں گھو رہی
ہو۔ ادھر میرے رگ و پے میں اس خیال سے سنسنی کی لہر دوڑ رہی تھی کہ کہیں وہ مجھے دیکھ کر
دوبارہ شور و غل نہ شروع کر دے۔

وہ چند ثانیوں تک خلا میں گھورتی رہی۔ پھر اس نے نیکی پر ہنسا کر میری طرف دیکھا تو
ہماری نظریں چار ہوئیں۔ میری نس نس میں ایک سردی لہراتی گئی۔ میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔
سینے میں سانس بھی یکھت رک گئیں۔

عالیہ کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھر آئے۔ پھر اس نے چونک کر شدید حیرانی سے مجھے
اور کمرے کو دیکھا۔ اس نے اٹھ بیٹھنا چاہا لیکن شدید کمزوری کے باعث وہ جھٹکے سے اٹھ بھی نہ
سکی۔ اس کے چہرے سے کرب اور اذیت جھلکنے لگی۔ اس نے بے رون لہجے میں پوچھا۔ "آپ کون
ہیں...؟ میں کہاں ہوں؟"

میں نے محسوس کیا کہ وہ اب نارمل ہے تو اٹھ کر اس کے پاس پہنچا۔ "آپ ہسپتال میں
ہیں۔" میں نے کہا۔

"لگ... کیوں؟" وہ متحش ہو گئی۔ اس نے دوبارہ بیٹھنے کی کوشش کی تو میں نے سارا
دے کر تکیوں کے سارے اسے بٹھا دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا جیسے اس کے سر
میں درد کی لہریں اٹھ رہی ہوں۔ "ہسپتال میں...؟ مگر میں ہسپتال میں کیسے؟ مجھے کیا ہوا تھا؟"

"کیا آپ کو وہ حادثہ یاد نہیں جو کچھ دیر پہلے پیش آیا تھا؟"

"کیسا حادثہ...؟" اس کے چہرے پر گہرا استعجاب بکھر گیا۔ اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے
دیکھا۔ "مجھے تو کوئی حادثہ یاد نہیں۔"

"سوسائٹی کی ایک گلی سے گزرتے ہوئے ایک ٹو رکشہ نے آپ کو ٹکرا مارا تھی۔"
عالیہ سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ نڈھال ہی ہو کر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند
ثانیوں کے بعد اس نے پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "کچھ کچھ یاد تو آ رہا ہے۔ صرف اتنا یاد ہے کہ مجھے
کسی چیز نے زور دار ٹکرا مارا تھی۔"

میں نے بتایا کہ کس طرح حادثہ پیش آیا تھا اور وہ کیسے بے ہوش کر کر پڑی تھی... میں
اسے ہسپتال لے آیا۔ ہسپتال والوں کو بتایا کہ وہ گھر میں پھسل کر گری ہے تاکہ پولیس کیس نہ بنے
اور ایکسرے لیا جا چکا ہے وغیرہ...

"میں ابھی جا کر ایکسرے رپورٹ لے آتا ہوں۔" میں نے کہا اور اسے کمرے میں چھوڑ کر
باہر آیا تو نرس راجداری میں ہی مل گئی۔ اسے عالیہ کے ہوش میں آنے کا بتا کر میں آگے بڑھ گیا۔
ایکسرے رپورٹ لے کر میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر ایکسرے رپورٹ دیکھ کر بولا۔ "خوش قسمتی
سے کوئی فریکچر نہیں ہے۔ مریض کو تین گھنٹے ہسپتال ہی میں رہنے دیں۔ اگر دو گھنٹے تک ٹھیک رہیں

ناپود کر دیں تو ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں۔“

”آپ ساتھ دینے کی بات کر رہی ہیں میں تو اپنا حق من دھن اس تنظیم پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے بڑے عزم سے کہا۔

وہ میرے جذبے سے بڑی متاثر نظر آ رہی تھی اور دل ہی دل میں خوش بھی ہو رہی تھی۔ اس کی دلی کیفیات اس کی آنکھوں میں پڑھی جاسکتی تھیں۔ اور اس کے چہرے پر بھی عیاں تھیں۔ اس نے پرشوق اور پر خیال انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تو محسن صاحب! کیا آپ ہماری تنظیم کے رکن بننا پسند کریں گے؟“

”کیوں نہیں۔“ میں کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر اس کے پاس جا بیٹھا۔ یہ سمجھنے کہ میں ابھی اور اس وقت آپ کی تنظیم کا ممبر بن گیا ہوں، بلکہ پہلے ہی سے اس تنظیم کا رکن ہوں۔ میں کئی برس سے اس انداز میں سوچ رہا ہوں کہ اس ملک کی تعمیر بنیادی غلطی ہے۔ ہم سے دھوکا کیا گیا ہے۔ ہم پہلے بھی غلام تھے اور آج بھی غلام ہیں۔ ہماری نجات، ہماری سلامتی اور عزت و آبرو اسی میں ہے کہ ہم اپنا ایک انگ دیکھ بنائیں۔ یہ دیں خود بخود نہیں بنے گا بلکہ یہ دیں ہمیں بنانا ہو گا۔“ میں جذباتی ہو گیا تھا۔ میرا لہجہ اس قدر پر جوش ہو گیا کہ میری آواز کمرے میں گونجنے لگی تھی۔ میں نے قدرے توقف کر کے ایک گہرا سانس لیا اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری باتوں سے بے حد متاثر نظر آ رہی تھی۔ بڑی توجہ اور انہماک سے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے فضا میں مکا لہراتے ہوئے عزم و حوصلے کا اظہار کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”وہ دن بہت جلد آئے والا ہے جب ہم زنجیریں توڑ دیں گے۔ ہمارا صوبہ دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک کی حیثیت سے ابھرے گا۔ یہ دیکھ ہمارا اپنا ہو گا۔“

”محسن صاحب!“ اس نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کے سینے میں بھی اپنی سرزمین کی آزادی کے لیے لاوا پک رہا ہے۔ ہمیں تو ایسے جذبے، عزم اور دلولے کی ضرورت ہے۔ آپ سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔“

”اگر میں اس تنظیم کا ممبر بننا چاہوں تو کیا مجھے ممبر بنایا جائے گا؟“

”کیوں نہیں۔“ عالیہ نے جواب دیا۔ ”ہمیں تو آپ جیسے نوجوانوں اور ساتھیوں کی شدید ضرورت ہے۔ جن کے دلوں میں آزادی کا جذبہ ٹھانسیں مار رہا ہو۔ جو اپنے آپ کو اس تحریک کے لیے وقف کر دیں۔“

”تنظیم کا ممبر بننے کے لیے کچھ شرائط وغیرہ بھی ہوں گی؟ اس کا دفتر کہاں ہے؟“

”شرائط کچھ بھی نہیں ہیں۔ البتہ آپ کو ممبر بننے کے لیے ایک خاص جگہ جانا ہو گا جہاں ہماری تنظیم کا صدر دفتر ہے۔ وہاں جا کر آپ کو رکنیت کا ایک فارم پر کرنا ہو گا اور حلف اٹھانا ہو گا۔ ممبر بن جانے کے بعد آپ کے ذمے کوئی کام لگا دیا جائے گا۔“

”کیسا کام؟“ میں نے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”ایسے کام جو حکومت کی چولیس ہلا سکیں۔ ایک نہیں، سینکڑوں کام ایسے ہیں جس کی مدد

چند گولیاں بھی اسے نرس ہی نے کھلائی تھیں۔ عالیہ سے مزید بات چیت نہ ہو سکی۔ بار بار اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔

کوئی نصف گھنٹے کے بعد یہ اطمینان کر کے کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے، میں کمرے سے نکلا اور نرس سے کہہ دیا کہ عالیہ کا خیال رکھے۔ میں نے بخشش کے طور پر پچاس کا ایک نوٹ دے دیا۔ ”میں چائے پی کر آتا ہوں۔ پندرہ بیس منٹ میں واپس آ جاؤں گا۔“ میں بے حد تھک گیا تھا۔ چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے ہسپتال سے باہر آ کر جی کو تلاش کیا مگر وہ نظر نہیں آیا۔ اسے فوری طور پر کوئی سواری نہیں ملی تھی، ورنہ وہ میرے پیچھے ہی یہاں پہنچ جاتا۔ میں نے ایک قریبی ریستوران میں جا کر چائے اور سینڈویچز منگوائے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد کمرے میں پہنچا تو عالیہ کو گہری نیند میں ڈوبے ہوئے پایا۔

تقریباً دو گھنٹے کی گہری نیند کے بعد عالیہ بیدار ہوئی تو بڑی ہشاش بشاش اور تروتازہ نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے جس خطرے کا اشارہ کیا تھا وہ مل چکا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھ کر اس کے لیے ہوٹل سے جوس کے دو پیکٹ اور بسکٹ کے دو ڈبے خرید لیے۔ عالیہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے دو چار بسکٹ کھائے اور جوس پیا۔ میں نے چند منٹ تک ادھر ادھر کی باتیں کیں، پھر سیاست کے موضوع پر آ گیا اور حکومت کے خلاف بولنے لگا تو عالیہ بے قابو ہو گئی، اس کا اصل چہرہ سامنے آ گیا۔ اس کی زبان ملک کے خلاف زہر اگلنے لگی۔ جب میں نے اس سے یہ کہا کہ... ہمیں اس صوبے کو ایک ایسا صوبہ بنانا چاہیے جو کسی آزاد مملکت کی طرح خود مختار اور اپنے آئین و پرچم کے ساتھ قائم ہو، تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ وہ مسرت آمیز لہجے میں بولی۔ ”ہاں محسن صاحب! بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے میں بھی ایسا ہی چاہتی ہوں، بلکہ میرے بہت سے ساتھی ایک ایسے ہی صوبے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ دن ضرور آئے گا جب ہمارا صوبہ فوج اور جاگیرداروں کے پنجوں سے آزاد ہو جائے گا۔“

”سوچنے اور خواب دیکھنے سے کیا ہوتا ہے، ہمیں مل کر جدوجہد کرنا ہو گی۔ ایک تنظیم بنانا ہو گی۔“

”اگر کوئی ایسی تنظیم بن جائے تو کیا آپ اس میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں؟ آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟ کیا آپ...؟“

”اگر کوئی ایسی تنظیم بنی تو میں سب سے پہلا رکن ہوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے تعلق سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں اسی صوبے میں پیدا ہوا ہوں۔ یہیں پلا بڑھا ہوں۔ یہاں کی دھرتی اور فضا سے مجھے پیار ہے۔ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جو میرے وطن اور اس کے باسیوں کا استحصال کر رہے ہیں۔“

”ایک ایسی تنظیم پہلے سے یہاں موجود ہے جو علیحدگی کی تحریک چلا رہی ہے۔“ عالیہ نے سرگوشی کی۔ ”میں اس تنظیم کی رکن ہوں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم استحصال پسندوں کو نیست و

اتنی ہوشیار ہوتے ہوئے بھی وہ اتنی آسانی سے بے وقوف بن گئی تھی۔ اس نے مجھ پر بھروسہ کرنے میں بڑی جلد بازی۔ کام لیا تھا۔ میں نے اسے اعتماد میں لے کر اس سے تنظیم کے بارے میں جو کچھ پوچھا تھا، اس نے اس سے کہیں زیادہ بتا دیا تھا۔ یہ باتیں معلوم کرنے کے لیے مجھے نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنا پڑتے۔ اس تنظیم کے بارے میں عالیہ کی زبانی جو کچھ بھی میرے علم میں آیا، وہ میرے لیے حیران کن تھا۔ یہ لوگ علیحدگی پسندی کے اندھے جنوں میں جلا ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنی قدریں کو بھی بالائے طاقت رکھ دیا تھا۔ وہ دولت حاصل کرنے کے لیے قانون کو ہاتھ میں لے رہے تھے۔ دوسری طرف حسین و جمیل لڑکیاں کام کر رہی تھیں اور ان لڑکیوں کی وجہ سے لڑکے بھی شامل ہو رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ عالیہ تنظیم کے لیے بہت دور تک جانے کے لیے تیار ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئی، جہاں اس کی ماں، بھابی اور بچے رہتے تھے۔ عالیہ کا باپ اس کے بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ اس کا ایک بڑا بھائی ان دنوں مسقط میں ملازمت کر رہا تھا۔ عالیہ کی ماں بھی پڑھی لکھی تھی اور اس کی بھابی ایک مقامی کالج میں ٹیچر تھیں۔ میں وہاں کوئی دو تین گھنٹے رہا۔ میں نے ان کی باتوں سے صاف محسوس کیا کہ ان کے ذہنوں میں بھی نفرت کا زہر بھرا ہوا ہے۔ انہیں کچھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کس راستے پر جا رہے ہیں۔

عالیہ نے مجھے زرد رنگ کے دو کارڈ دیے۔ ان پر کسی کے دستخط چھپے ہوئے تھے۔ یہ کس کے دستخط تھے، کچھ پتہ نہ چل سکا۔ عالیہ کو بھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ کبھی اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ دستخط کچھ ایسے تھے کہ میں باوجود کوشش کے نام نہیں سمجھ سکا۔

میں گھر پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

دوسرے دن صبح سویرے جی آگیا۔ وہ میرے بارے میں بہت فکر مند تھا اور رات کے بارہ بجے تک میری انتظار کر کے گھر گیا تھا۔ میں نے اسے عالیہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ پھر ہم نے طے کیا کہ ایک ہفتے بعد تنظیم کے جلسے میں شرکت کرنے کے لیے ضرور جائیں گے۔ وہاں جانے سے بہت سے چرے سامنے آجائیں گے۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ عالیہ سے میل جول بڑھا کے تنظیم کے اراکین کی فہرست حاصل کر لوں گا... پھر یہ سوچ کر، یہ خیال ذہن سے نکال دیا کہ کہیں عالیہ کا حشر بھی بادشاہ خان جیسا ہی نہ ہو۔ بادشاہ خان کے واقعے کے بعد وہ لوگ زیادہ محتاط اور چوکس ہو گئے ہوں گے۔

میں لالو کھیت سے بس میں سوار ہوا۔ پہلے تو سوچا کہ عالیہ کے ہاں ہو آؤں۔ عالیہ کے ہاں جانے کے لیے مجھے میک اپ کرنا پڑتا اور ویسے بھی فی الحال اس کے ہاں جانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں تھا... میرا جو مقصد تھا، وہ پورا ہو چکا تھا۔ چار دن بعد مجھے جی کے ساتھ تنظیم کے جلسے میں شریک ہونا تھا۔ اس جلسے میں تنظیم کے اراکین کراچی اور سندھ کے کونے کونے سے شرکت کرنے والے تھے۔ میں نے سوچا کہ جانے سے پہلے کچھ رقم ہی پیدا کر لی جائے۔ میرے پاس مال و دولت کی کمی نہیں تھی، اس کے باوجود میں جیب تراشی کا کام دفتری امور کی مانند بڑی باقاعدگی سے کرنے کا

ہم ضروریں لگاتے ہیں۔ اس تنظیم کا ہر ممبر حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کرنے پر تیار ہوا ہے۔ تاکہ ہم جلد از جلد آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں۔

”کیا تم لوگ ہر کسی کو ممبر بنا لیتے ہو؟“

”ہاں... مگر اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کے دل میں آزادی کا جذبہ موجزن ہو۔“ عالیہ نے کہنا شروع کیا۔ ”ہم لوگ اچھی طرح دیکھ، سمجھ اور پرکھ کر ہی ممبر بناتے ہیں۔ ہم نے آج کل ممبر بنانے کی رسم شروع کر رکھی ہے۔ اس مقصد کے لیے اس تنظیم کے بہت سارے لڑکے اور لڑکیاں سرگرم عمل ہیں۔ ہم نے صرف چھ ماہ میں تین سو ممبروں کا اضافہ کیا ہے۔ ہم زیادہ تر دولت مند گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیوں کو ممبر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ان سے بڑی رقمیں بھی وصول کی جاسکیں۔ تنظیم کو اور زیادہ مضبوط بنانے کے لیے ہمیں ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔“

”تو کیا تنظیم میں آپ جیسی حسین و جمیل لڑکیاں اور بھی موجود ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ اس کے رخساروں پر حیا کی سرفی پھیل گئی۔

”تین سو ممبر بنانا کوئی مذاق نہیں بلکہ بہت مشکل ہے۔ یہ تو آپ جیسی حسین لڑکیاں ہی انجام دے سکتی ہیں۔“

”آپ سچ کہتے ہیں۔“ اس نے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔ ”جب سے حسین لڑکیاں نوجوانوں کو اس تنظیم کا ممبر بنانے کے لیے نکلی ہیں تب سے ممبروں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لڑکیوں کی وجہ سے لڑکے بہت جلد ممبر بن جاتے ہیں۔“

”آپ بہت حسین ہیں۔“ میں نے اس کا خوشنما اور نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”تو آپ مجھے کب ممبر بنا رہی ہیں؟“

”میں آپ کو ایک کارڈ دوں گی، اسے لے کر آپ اس خاص مقام پر جائیں گے جہاں ہمارا دفتر ہے۔“ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ ”اور ہاں یاد آیا... ایک ہفتے بعد وہاں تنظیم کا بہت بڑا جلسہ ہو رہا ہے۔ کراچی شاخ کے تمام ممبر وہاں پہنچ رہے ہیں... آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔ آپ چل رہے ہیں نا؟“

”کیوں نہیں۔“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”ساتھی حسین ہو تو سفر بھی حسین ہو جاتا ہے۔ ساتھ چلوں گا محترمہ، ضرور چلوں گا۔“

کوئی ایک گھنٹے بعد عالیہ کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ ڈاکٹر نے جو دو انس پبلے تجویز کی تھیں وہی استعمال کرتے رہنے کو کہا اور کچھ ہدایات نوٹ کروائیں۔ ہسپتال میں عالیہ کے علاج معالجے پر کوئی دو ہزار روپے خرچ آئے تھے۔ لیکن مجھے ان کا کوئی ملال نہیں تھا۔

عورت چاہے کتنی ہی ذہین اور شاطر کیوں نہ ہو، وہ عورت ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت ناقص التحصن ہوتی ہے۔ عالیہ پڑھی لکھی، روشن خیال اور مذہب تھی، تیز طرار اور ذہین بھی تھی، دنیا کو دیکھ رہی تھی اور ایک علیحدگی پسند تحریک کی سرگرم کارکن بھی تھی۔

ماہر معلوم ہوتی تھی، اس کے ہاتھ میں کسی چوڑے کی سی نری تھی۔ میں خود بھی ماہر فن تھا لیکن اس کے ہاتھ کی صفائی دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ دراصل پہلے کبھی میری نظروں سے کوئی پاکستان مار عورت نہیں گزری تھی۔ میں اس کی فن کارانہ مہارت پر عیش عیش کر اٹھا۔

گرومند کا سناپ قریب آتے دیکھ کر لڑکی کی آنکھوں میں اضطراب کی ایک لہری اٹھی۔ بھر جھوم کو چیرتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی تو میں بھی بس میں بھرے ہوئے مسافروں کا جھوم چرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ اس کی ہنرمندی ہی تھی جو مجھے کشاں کشاں اس کی طرف کھینچ کر لے جا رہی تھی۔ اس نے اپنا کارنامہ بڑی خوبصورتی سے انجام دیا تھا۔

بس گرومند کے سناپ پر رکی تو میں اتر گیا۔ وہ بھی بس سے اتری اور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی کاروائی پر اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے پتلے پتلے عاتلی ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور گوشوں میں ڈوب گئی۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس ایک فحش پر اکتفا نہیں کرنا چاہتی۔ وہ اپنی فتوحات کا سلسلہ شاید اور آگے تک لے جانا چاہتی تھی۔ شاید اسی لیے وہ سناپ پر کھڑی کسی اور بس کا انتظار کر رہی تھی۔ ادھر میرے دل میں اس کی فتوحات کو دیکھنے کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کا تعاقب اس وقت تک جاری رکھوں گا جب تک وہ اپنے گھر نہیں پہنچ جاتی۔ اس دوران میں اگر اس پر کوئی آج آئی تو اسے بجا دوں گا۔

جیسے ہی صدر جانے والی بس آئی، وہ اس میں پڑھ گئی۔ میں بھی اسی بس میں سوار ہو گیا۔ اس بس کے زنانہ حصے میں رش نہیں تھا، البتہ مردوں کے حصے میں خاصی بھڑھڑ تھی۔ صرف درمیانی راستے میں کھڑے رہنے کی گنجائش تھی۔ میں ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے لوگوں کو بہ آسانی اپنی نظروں کی گرفت میں رکھ سکتا تھا۔ وہ بائیں جانب کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ بس تیز رفتاری سے فاصلہ طے کر رہی تھی۔ کھڑکی میں شیشہ نہیں تھا۔ وہ چہرے پر نقاب ڈالے بیٹھی تھی۔ جس کی جالی سے اس کا حسن اجاگر ہو رہا تھا۔ میں مبہوت سا اسے دیکھتا رہا، تیز ہوا سے نقاب اڑتا تو اس کے حسین چہرے کی لمحاتی جھلک بے چمن کر جاتی۔ اس کے رخساروں کا گلابی پن دل پذیر تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نبھانے کس الجھن کا شکار تھی یا شاید یہ بھی اس کی کوئی اداسی تھی۔

ایمپریس مارکیٹ کا سناپ آیا تو وہ خود کو سمیٹ کر اتر گئی۔ اس کا رخ بوہری بازار کی طرف تھا۔ میں اس کے تعاقب میں ہو لیا۔ وہ متناسب جسم کی مالک تھی اور کسی نازک شاخ کی طرح چبکٹی، لہرائی اور بل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ سیاہ بھنور جیسے کالے رنگ کے برقعے میں اس کا حسن بڑا دل نواز تھا، جو اس کے چلنے کے انداز سے بڑھ رہا تھا کیوں کہ اس کے برقعے پر ابھرنے اور مٹنے والی لہروں میں دریا کی سی لطیفائی تھی۔ وہ اک شان بے نیازی سے کسی شہزادی کی مانند چلی جا رہی تھی۔ اسے اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ کتنی نظریں اس کا طواف کر رہی ہیں۔

وہ بوہری بازار سے ہوتی ہوئی، محبوب بخش مارکیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ میں نے اس عرصے میں اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی تھی کہ وہ ایک پڑھی لکھی، آزاد خیال، مازوق اور

عادی تھا۔ اس کے دو فائدے تھے۔ ایک تو مزید دولت ہاتھ آتی تھی، دوسرے انگلیاں رنگ آلود ہونے سے محفوظ رہتی تھیں۔ ویسے بھی فن پیشہ پریشانی سے جلا پاتا ہے۔

میں بس میں سوار ہو کر جامع کلاخ مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ تو رش کی وجہ سے اور کچھ اپنی پیشہ ورانہ مجبوری کے تحت لیڈر پارٹیشن کے پاس جا کھڑا ہوا... لڑکیاں اور عورتیں بھی بس میں کچھ بھڑکی ہوئیں تھیں۔ ان میں زیادہ تر بے پردہ تھیں۔ جو پردے میں تھیں، ان کے چہرے بھی پردے میں نہیں تھے۔ ان کے بے نقاب چہرے، بے پردہ چہروں سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔

ڈاک خانے کے سناپ سے ایک لڑکی اور دو عورتیں سوار ہوئیں۔ اس سناپ پر صرف دو عورتیں اتری تھیں۔ سوار ہونے والی دونوں عورتیں بے پردہ تھیں۔ میں نے باری باری ان کا جائزہ لیا... لڑکی سیاہ برقعے میں تھی وہ ان عورتوں کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ عورتوں کی صف کو چیرتی ہوئی ایک طرف سٹ کر کھڑی ہو گئی۔ میری نظریں لڑکی کے نقاب پر کسی خدی بچے کی طرح چل گئیں اور پھر اس کے ملفوف سراپا پر کسی سیاہی کی طرح ڈٹی رہیں۔ لڑکی کا چہرہ نقاب میں کسی شمع کی طرح روشن تھا۔ حسن پردے میں ہو تو ابہام کی کیفیت اس کی کشش میں اضافہ کر دیتی ہے۔ میری نگاہ بھی اسیر ہو کر رہ گئی۔ اچانک ہی لڑکی نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹائی تو ایسا لگا جیسے چاند بدلیوں سے نکل آیا ہو۔

بس تیزی سے سفر طے کر رہی تھی۔ میں مختلف چیلے بہانوں سے اس چاند سے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈھبلا ڈھالا برقع پن رکھا تھا لیکن وہ ایک جیتی جاگتی قیامت تھی۔ دھنسا میں نے اپنی نظروں کے سامنے ایک کوند سا لپکتا ہوا دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس چاند سے چہرے والی لڑکی کی مخروطی انگلیاں بڑے غیر محسوس انداز میں اپنے سامنے کھڑی ہوئی عورت کے پرس کی زپ کھول دی تھیں۔ اور وہ اپنی ساحر آنکھوں سے اپنے شکار کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی لڑکی کی حسین آنکھوں نے جیسے عورت کو چٹانائز کر دیا تھا۔

میں نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے مسافروں کا جائزہ لیا۔ میرے برابر ایک بڑے میاں کھڑے تھے، وہ کہیں اور دیکھ رہے تھے۔ میرے پیچھے دو مرد کھڑے کسی سیاسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ جو مرد پارٹیشن کے پاس بیٹھے تھے، وہ یہ منظر نہ دیکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ زنانہ حصے میں جو لڑکیاں اور عورتیں کھڑی تھیں، ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ حسین لڑکی اپنے فن کا کیسا اعلیٰ نمونہ پیش کر رہی ہے۔ صرف ایک ہی لمحے کی بات تھی کہ لڑکی نے اپنی دونوں انگلیوں کی مدد سے اس عورت کے پرس کی رقم پر ہاتھ صاف کر دیا۔ میں نے سو سو کے نوٹ دیکھے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ رقم ایک ہزار روپے سے کسی بھی طرح کم نہیں تھی۔

لڑکی تیزی سے مگر اس قدر احتیاط اور اس انداز سے اپنا ہاتھ برقعے میں لے گئی کہ عورت کو کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہوا۔ میں نے ہاتھ کی حرکت سے اندازہ لگایا کہ اس نے رقم اپنے گریبان میں ٹھونس لی ہے۔ اس نے بڑے سکون اور اطمینان سے ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔ وہ اس فن میں

خوش لباس لڑکی ہے۔ شالٹ اور قمیص مزاج کی بھی لگ رہی تھی۔ اس میں کسی اعلیٰ گھرانے والی لڑکی جیسا وقار تھا اور پھر حسن کے رعب نے اس کی شخصیت کو مزید پروقار بنا دیا تھا۔

محبوب بخش مارکیٹ کی عمارت میں داخل ہو کر وہ دائیں طرف مڑ گئی۔ دو روڈیا بھی ہوئی دکانوں کے درمیان سے گزرنے لگی تو ان دکانوں کے سٹیلز میں جن پر کوئی گاہک نہیں تھا اسے بڑے تپاک و احترام سے اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے، لیکن اس نے کسی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دکان پر اچھٹی سی نگاہ ڈال کر چلتی ہی رہی۔ مجھے حیرت ہونے لگی کہ وہ اس مارکیٹ میں کس لیے آئی ہے۔ کوئی خریداری کرے گی یا کسی کو اپنا شکار بنائے گی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے لیے کوئی اچھا سا کپڑا خریدے گی۔

کارنر کی ایک وکان پر بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ لڑکیاں اور عورتیں گویا ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ بہت سی خواتین سنوٹوں پر بیٹھی کپڑا دیکھ رہی تھیں۔ غیر ملکی پارچہ جات بڑے دیدہ زیب اور خوش نما تھے۔ ان کے نت نئے ڈیزائنوں میں دل فریبی تھی اور وہ دیکھنے والوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتے تھے... طاقت ور برقی بلبوں کی تیز روشنیوں میں ان کا جادو سرچڑھ کر بول رہا تھا اور یوں ان کی کشش بڑھ گئی تھی۔ اس دکان پر خریداروں کا جو جھوم تھا، ان میں اکثریت لڑکیوں اور عورتوں کی تھی۔ مرد بے چارے تو اقلیت میں تھے۔ پندرہ بیس خواتین میں دو مرد تھے جو چپ چاپ ایک طرف کھڑے تھے، جیسے نوی نمائشی شے رہے ہوں۔

پاکت مار لڑکی نے ایک عورت کی پشت پر کھڑے ہو کر رقم نکالی۔ یہ وہی رقم تھی جو اس نے بس میں مسافر خاتون کے پرس سے اڑائی تھی۔ وہ رقم گنتے لگی۔ میں اس کے عقب میں چند قدم دور کھڑا تھا۔ اگر وہ اپنے بائیں طرف گردن گھما کر دیکھتی تو میں اپنی حرکات و سکنات سمیت اس کی نظر میں آ جاتا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ رقم گنتے لگا۔ نو سو اسی روپے تھے۔ اس نے رقم گن کر واپس رکھ لی۔ اس دوران میں ایک عورت نے خریدے ہوئے کپڑے پیک کرانے اور دکان دار کو پانچ ہزار کی رقم ادا کر کے پیکٹ سنبھالتی ہوئی اسی تو اس کی جگہ خالی ہو گئی۔ لڑکی نے اس جگہ پر قبضہ جمانے میں تاخیر نہیں کی۔ وہ فوراً ہی سنوٹ پر بیٹھ گئی اور اپنی طرف متوجہ سٹیلز میں کو ہاتھ کے اشارے سے ایک کپڑا دکھانے کے لیے کہا۔ میں اپنی جگہ سے ہٹ کر ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے اس کی حرکات و سکنات پر آسانی سے نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ بظاہر تو کپڑے دیکھ رہی ہے مگر اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں جیسے وہ کسی خاص چیز کی تلاش میں ہو۔ وہ کپڑا دیکھتے دیکھتے کبھی ساتھ بیٹھی ہوئی خواتین کے کپڑوں کو دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے لگتی... پھر دوسرے سٹیلز میں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ اس طرح دس منٹ گزر گئے۔ اسے کوئی کپڑا پسند نہیں آیا۔

اس سٹیلز میں نے جو لڑکی کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کے سامنے، بہت سارے کپڑوں کا ڈھیر لگا چکا تھا، انہیں سمیٹنے لگا۔ ان کپڑوں کے سمیٹنے ہی عورت کا بھورے رنگ کا چری پرس نظر آیا جو کپڑوں میں چھپ گیا تھا، عورت نے پرس اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور سٹیلز میں سے کوئی اور تھان

دکھانے کے لیے کہا۔ سٹیلز میں آٹھ دس تھان اٹھا کر دیا اور ایک ایک کر کے کھولنے اور کپڑا عورت کے سامنے پھیلانے لگا۔ عورت نے بے دھیانی میں گود سے پرس اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور کپڑے کو چھو کر دیکھنے لگی۔ اب وہ اپنے پرس کی طرف سے غافل ہو گئی تھی۔ پاکت مار لڑکی نے جو اپنے سٹیلز میں کو اٹھائے ہوئے تھی، جیسے ہی پرس کو اپنے ہاتھ کے قریب پایا، اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے سٹیلز میں کو اشارہ کر کے وہ تھان دکھانے کے لیے کہا جو دوسرا سٹیلز میں دوسری لڑکیوں کو دکھا رہا تھا۔ سٹیلز میں آٹھ کر دوسرے کے پاس جا کھڑا ہوا کہ اگر وہ کپڑا ان لڑکیوں کو پسند نہ آئے اور بات نہ بن سکے تو وہ تھان اٹھا کر لے آئے... جیسے ہی وہ سٹیلز میں بٹا، لڑکی نے اس پاس کا جائزہ لے کر اطمینان کیا اور پھر سب کی نظریں بچا کر پرس اٹھایا اور تیزی سے اپنے برقعے کے اندر کر کے بغل میں اس طرح دبایا کہ اب وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ پھر وہ اپنے سٹیلز میں کو متوجہ نہ پا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اٹھنے اور نکلنے میں کسی قسم کی غفلت نہیں دکھائی تھی۔ جس عورت کا پرس اس نے اڑایا تھا، وہ کپڑوں کی چکاچوند میں کھو کر اپنے پرس اور دنیا و مافیہ سے بے نیاز لگ رہی تھی۔

لڑکی اطمینان سے چلتی ہوئی مارکیٹ سے باہر آ گئی۔ وہ اس گیٹ کی طرف بڑھی تو اس کی چال میں تیزی آ گئی... جہاں لفٹ لگی ہوئی تھی۔ میں اس کے پیچھے لگا رہا۔ وہ لفٹ کے دروازے پر پہنچ کر رکی۔ وہاں بہت سے مرد اوپر جانے کے لیے کھڑے تھے۔ جیسے ہی ایک لفٹ آئی، اس کا دروازہ کھلا، اندر سے آٹھ آدمی باہر آئے۔ لفٹ میں نے اسے اور سات مردوں کو لفٹ میں سوار ہونے دیا۔ میں کوشش کے باوجود لفٹ میں سوار نہ ہو سکا اور اسے لفٹ میں اوپر جاتے دیکھتا رہ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کس منزل پر اور کس مقصد کے تحت گئی ہے، اس عمارت میں، اوپر صرف دفاتر تھے۔

چند لمحوں کے بعد مجھے ایک تدبیر سوچھی۔ دیر تو ہو چکی تھی تاہم میں مایوس نہیں ہوا۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ لفٹ تیسری منزل پر پہنچ چکی تھی۔ پھر میں نے ایک پل بھی ضائع نہیں کیا اور زینے کی طرف لپکا۔ زینہ دو قدم پر تھا۔ میں تیزی سے میڑھیاں پھلا لگتا ہوا پانچویں منزل پر پہنچا تو لفٹ چھٹی منزل کی طرف جا رہی تھی، میں نے چھٹی منزل پر تو نہیں البتہ ساتویں منزل پر لفٹ کو جا لیا... لفٹ میں سے جو لوگ نکلے، ان میں وہ لڑکی نہیں تھی۔ وہ کس منزل پر گئی تھی، یہ پتہ چلانا اب مشکل ہو گیا تھا۔ ساتویں منزل سے ایک آدمی لفٹ میں سوار ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے لفٹ کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک لیا۔ اور لفٹ میں سے پوچھا۔ ”میں لفٹ میں سوار نہیں ہو سکا۔ میری کزن ابھی اوپر آئی تھی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کس منزل پر اتری ہے؟“

”انہوں نے کالا برقع پہن رکھا تھا؟“

میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”وہ پانچویں منزل پر اتری تھیں۔“

میں برق رفتاری سے پانچویں منزل پر آیا۔ اس منزل پر بہت سارے دفاتر تھے۔ یہ معلوم

کرنا دشوار تھا کہ لڑکی کس دفتر میں گئی ہے یا میز میوں سے اتر کر واپس جا چکی ہے۔ میں نے پانچویں منزل کا کوٹا کوٹا چھان مارا۔ کچھ ایسے دفاتر میں جھانک بھی لیا، جن کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور جہاں اس کی موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ صرف ایک کوٹا دیکھنا باقی رہ گیا تھا جہاں ڈاکٹروں کے کلینک تھے... وہاں مریض آ جا رہے تھے۔

میں نے اس صبح کی راہ داری میں قدم رکھا تو ٹھک کر رہ گیا۔ وہ ایک ماہر امراض چشم کے کمرے سے ایک جواں سال آدمی کے ساتھ باہر آ رہی تھی۔ اگر اس کی موہنی صورت کے خدوخال میرے دل پر نقش نہ ہوتے تو شاید میں اسے پہچان بھی نہ پاتا۔ اب وہ برقعے میں نہیں تھی۔ اس نے برقع اتار دیا تھا۔ اس کے ساتھی کے ہاتھ میں جو پیکٹ تھا، اس میں برقع اور وہ پرس پیک کیا ہوا لگ رہا تھا۔ لڑکی نے جو کارنامہ انجام دیا تھا وہ باقاعدہ منصوبے کے تحت تھا۔ میں نے اس کے ساتھی کو بس میں نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ مجھے مارکیٹ میں کہیں نظر آیا تھا۔ گویا وہ طے شدہ پروگرام کے تحت آنکھوں کے ڈاکٹر کے استقبالیے میں پانچویں منزل پر اس کا منتظر تھا۔

اس سے پہلے میں نے لڑکی کو دیکھا تھا تو اس نے پوری آستین کا برقع پہن رکھا تھا، اس لیے پتہ نہ چل سکا کہ اس نے کیا لباس پہنا ہوا ہے۔ بدن سے برقع اتار تو معلوم ہوا کہ وہ کالج یونیفارم میں ملبوس ہے۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں بھی تھیں جنہوں نے اسے ایک کالج گرل بنا دیا تھا۔ وہ لگ بھی کوئی طالبہ ہی رہی تھی۔ اس کی دو چٹیاں گندھی ہوئی تھیں اور ان میں سفید ربن بندھے ہوئے تھے۔ اس نے تاریک شیشوں کا چشمہ بھی پہن لیا تھا۔ اس پر اب واقعی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ جو مرد تھا، اس کی اور لڑکی کی شکل و صورت اور رنگت میں بڑی مشابہت تھی۔

میں آگے بڑھتا رہا، وہ میری ہی سمت چلے آ رہے تھے۔ میری تیز نظروں نے لڑکی کے ساتھی کی ایک پھولی ہوئی جیب سے اندازہ لگا لیا کہ پرس کی ساری رقم اس کی جیب میں منتقل ہو چکی ہے۔ لڑکی کا دھکا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے لبا ہاتھ مارا ہے۔ میں نے قریب سے گزرتے ہوئے ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کی۔ لڑکی اپنے ساتھی سے کہہ رہی تھی۔ ”تم ٹیکسی لے کر گھر پہنچو، میں بعد میں آ جاؤں گی۔“

لڑکی کا یہ جملہ سننے ہی میں دو تین قدم آگے جا کر تیزی سے پلٹا اور انہیں اور ٹھیک کرنا ہوا زینے پر پہنچا اور تیزی سے نیچے آگیا، پھر عمارت کے صدر دروازے پر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور ان دونوں کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں لفٹ سے نکل کر باہر آنے لگے تو میں تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ پاس پہنچ کر میں مرد سے پوچھا تو اس کے ہاتھ سے پیکٹ چھوٹ کر گر گیا پیکٹ گرتے ہی اس کا کانڈ پھٹ گیا اور اندر سے سیاہ برقع جھانکنے لگا۔ اسی برقعے میں وہ پرس لپٹا ہوا لگ رہا تھا جسے لڑکی نے دکان پر پہنچا خریدنے والی عورت کے پاس سے اڑایا تھا۔ چشم زدن میں میرے دونوں ہاتھوں نے کمال دکھا دیا۔ نوجوان کو خبر نہ ہو سکی۔ وہ تو پیکٹ گرتے اور اس کا کانڈ پھٹنے ہی ہراساں سا ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور لڑکی بدحواس ہو گئی۔ لڑکی مجھ پر گہری تو اس کی آواز مرتعش ہو گئی... ”اندھے ہو کیا؟ دیکھ کر نہیں چل سکتے؟“

”تمیز سے بات کیجئے۔“ میں نے تند لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ اندھا دھند باہر آ رہے تھے۔ میں نہیں، بلکہ آپ کے بھائی جان مجھ سے کرائے ہیں۔“

میرا جملہ جیسے ان دونوں پر بجلی بن کر گرنا۔ لڑکی کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ نوجوان کے چہرے پر بھی ہوائیاں سی اڑنے لگیں لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ اس نے بڑی سرعت سے جھک کر پیکٹ اٹھایا اور اس طرح کہ کیا کہ برقع دوبارہ چھپ گیا، پھر اس نے پیکٹ بائیں ہاتھ میں لے کر دایا اور دوسرے ہاتھ سے لڑکی کا بازو پکڑ کر بولا ”نرسن چلو، ہمیں دیر ہو رہی ہے، کہیں انکل کی فلائیٹ نہ نکل جائے۔“

نرسن نے مجھے خشکیں لگا ہوں سے گھورا اور اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ وہ تیر کی طرح سیدھے اس تیزی سے گئے کہ انہوں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے باہر آ کر دیکھا تو وہ زیب القاسم کی طرف جا رہے تھے۔

میرے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ان کے تعاقب میں جاؤں اور لگے ہاتھوں نرسن کا گھر بھی دیکھ لوں۔ آخر وہ ایک فن کارہ تھی، ایک عظیم فن کارہ۔ اس کی قدر و قیمت کا کچھ میں ہی اندازہ کر سکتا تھا۔ میں نے کپڑوں کی دکانوں کے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے اپنی جیب تھپتھپائی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری جیب میں اس وقت کتنی رقم آ چکی تھی۔

میں نے جیسے ہی مارکیٹ میں قدم رکھا، سامنے ایک بھیڑ نظر آئی۔ لوگ اسی دکان کے سامنے جمع تھے جہاں واردات ہوئی تھی۔ دو مسلح پولیس مین لوگوں کو منتشر کر رہے تھے۔ میں نے جھوم سے نکل کر آتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔ ”کیا ہوا بھائی صاحب! خیریت تو ہے اس دکان پر چھاپہ پڑ گیا ہے کیا؟“

”چھاپہ!“ اس نے مجھے حیرت سے نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کس کی مجال ہے کہ یہاں کسی دکان پر چھاپہ مارے معلوم ہوتا ہے پردہسی ہو، بھائی چھاپہ نہیں بلکہ ڈاکہ پڑا ہے۔“

”کیا کما ڈاکہ پڑا ہے؟“ اس دکان پر؟“ میں نے دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔ ”دن دہاڑے، حد ہو گئی ہے۔“

”دکان پر نہیں بلکہ پرس پر ڈاکہ پڑا ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”کراچی کے ایک مشہور ماہر امراض قلب کی بیگم کے پرس پر... بے چاری، اپنی بیٹی کے ساتھ اس کی شادی کے لیے خریداری کرنے نکل تھی... ایک برقع پوش لڑکی اس کے ساتھ بیٹھی کپڑے دیکھ رہی تھی، چپکے سے پرس لے اڑی۔ سلیزمن بتا رہا ہے کہ لڑکی بہت خوبصورت تھی، نوجوان تھی اور اس نے سیاہ برقع پہن رکھا تھا۔“

”یہ عورتیں کس قدر بے پرواہ ہوتی ہیں۔“ میں نے تبصرہ کیا۔

”ارے صاحب، پرواہ تو اس عورت کو ہو گی جس کا شوہر محنت کر کے اور دن بھر جھک مار کے، کما کر لاتا ہو گا۔ ایک ماہر امراض قلب کی بیوی کو فکر کیوں ہونے لگی۔ اور پھر اس طرح لٹ

ہوئے ایک ہزار روپے بھی معاف کر دیے تھے۔

ڈاکٹر چکرا گیا۔ اس کا چہرہ کہہ رہا تھا ”تم ایک ہزار کی بات کر رہے ہو“ میں نے بھی کسی مریض کو ایک روپیہ بھی معاف نہیں کیا“ وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔

میری تیز اور آواز ہو جانے والی نظروں نے مال تلاش کر لیا تھا، پھر میں بغیر کسی تاخیر کے ڈاکٹر سے بغل گیر ہو گیا۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ کس قدر عظیم انسان ہیں۔ آپ نے ہم پر جو احسان کیا ہم اسے ساری زندگی فراموش نہیں کر سکیں گے۔“ میں نے اپنا کارنامہ انجام دینے کے بعد ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور چوم لیا۔ ہاتھ چومتے وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان ہاتھوں سے بے شمار انسانوں کے خون کی بو آرہی ہو۔

”اچھا... اچھا“ ڈاکٹر نے ناگوار انداز میں اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ ”مجھے جلدی ہے۔ ایک جگہ ضروری کام سے جانا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مارکیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے بھی لمبے بھر کی تاخیر نہیں کی۔ سڑک پار کر کے دوسری سمت پہنچ گیا۔ یہ میری اچانک اور غیر متوقع کامیابی تھی۔ اگر وہ بریف کیس میں رقم رکھ کر لاتا تو پھر کامیابی ذرا مشکل ہو جاتی۔ جیب کھینچنے پر ڈاکٹر کے دل پر کیا جیتی ہوگی، اس کی نہ تو مجھے فکر تھی اور نہ میں اس بارے میں سوچنا چاہتا تھا کیوں کہ وہ بھی تو اپنے مریضوں کی مجبوریوں کے بارے میں نہیں سوچتا تھا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹر کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہوگی۔ اور غالباً وہ دل کا مریض بن گیا ہوگا۔ میاں بیوی دونوں پر زبردست چوٹ پڑی تھی۔ آج کا دن ان دونوں کے لیے منحوس ثابت ہوا تھا۔ لیکن میرے لیے خوش قسمتی کا دن تھا۔

میں نے جب گھر پہنچ کر وہ لفافہ جیب سے نکالا جسے میں نے نسرین کے بھائی کی جیب سے اڑایا تھا، اس لفافے میں نہ صرف پچاس ہزار کی رقم تھی بلکہ وہ رقم بھی موجود تھی جو نسرین نے بس میں ایک خاتون کے پرس سے پار کیا تھا۔ ڈاکٹر کے لفافے میں بھی پچاس ہزار کے نوٹوں کی بنی گڈی تھی۔ ایک ہی وقت میں اتنا شاندار ہاتھ مارنے پر میں خوشی سے پھولا نہیں سا رہا تھا۔ لیکن اس کارنامے اور عظیم کامیابی کا سرا اس عظیم فن کارہ کے سر نہ باندھنا انصافی تھی۔ میری کامیابی اس کی مرہون منت تھی۔ میں نے نئے نوٹوں کی گڈیوں کو اس جگہ چھپا کر رکھ دیا جہاں میں اپنی دولت کو چھپا کر رکھتا تھا۔ اس خفیہ جگہ کی میرے فرشتوں کے علاوہ کسی اور کو خبر نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔

میں بستر پر لیٹ گیا تو میرے تصور میں نسرین کی موہنی صورت ابھر آئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ گھر پہنچ کر ان دونوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ انہوں نے سوچا ہوگا کہ ان سے تو استادوں کا استاد نکلا گیا تھا۔ نسرین کا غصے اور صدمے سے برا حال ہو رہا ہوگا۔ اور وہ کسی چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح پھنکار رہی ہوگی۔ وہ غضب ناک ہو کر سوچ رہی ہوگی کہ اگر میں اسے مل جاؤں تو کیا ہی چبا ڈالے... اس کے بھائی جان بھی سر پکڑ کے بیٹھ گئے ہوں گے۔ اب ان دونوں کو یاد آ رہا ہوگا کہ یہ حرکت میری ہی ہوگی۔

جانے سے ان پر کیا فرق پڑے گا؟ ڈاکٹر مریضوں کو لوٹتے ہیں اور ڈاکو ان کو لوٹ لے جاتے ہیں۔ اس نے گردن گھما کر دکان کی طرف دیکھا۔ ”ذرا بیگم صاحبہ کی صورت تو دیکھیں۔ اس کی صحت اور چہرے پر کوئی اثر نظر نہیں آتا۔“

”ماہر امراض قلب کی بیوی تو یقیناً دل کی بہت مضبوط ہوگی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ وہ شخص بہت باتونی تھا یا پھر ڈاکٹروں سے زخم خوردہ تھا۔ میں آگے بڑھتے ہوئے ٹھک گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ ڈاکٹر بھی تو ڈاکو ہی ہوتے ہیں... مذہب ڈاکو، دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں اور انہیں پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔“

”ہر ڈاکٹر لٹیرا نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔“ ”ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن مجھے تو بیوی کا علاج کرانے کے لیے مکان بچنا پڑا تھا۔ پھر بھی میری بیوی صحت یاب نہ سکی... آخر وہ ایک حکیم کے دو دن کے علاج سے ٹھیک ہو گئی۔ اسے مرض کیا تھا۔ گیس! ڈاکٹر نے تشخیص کیا کیا تھا، عارضہ قلب! بیوی کا علاج کراتے کراتے خود مجھے عارضہ قلب ہو گیا۔ آج جو عورت پرس سے محروم ہوئی ہے میں اسی کے ڈاکٹر شوہر کا نشانہ بنا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس ڈاکٹر کو بھی کسی نے لوٹ لیا۔“

میں نے غور سے اس شخص کو دیکھا، وہ خاصا پریشان حال لگ رہا تھا۔ بیوی کے علاج معالجے نے اس کی کمر خیدہ کر دی تھی۔ وہ مجھے اپنی داستان غم سناتا رہا اور میرا خون کھولتا رہا۔ واقعی اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی تھی۔ آخر میں وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”کاش! وہ ڈاکٹر ہمیشہ اسی طرح لٹیرا رہے۔“

اچانک اس کی نگاہ سڑک کی طرف اٹھ گئی جہاں ایک کار آ کر رکی تھی۔ ”لیجئے، ڈاکٹر صاحب مزید رقم لے کر آئیے۔“ اس نے کار والے آدمی کی طرف اشارہ کیا اور بوڑھاتا ہوا ایک طرف روانہ ہو گیا۔

میں نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ گول مٹول آدمی تھا اور نظر کا چشمہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔

میں تیزی سے اس کی کار کی طرف بڑھ گیا۔ ڈاکٹر کار کا دروازہ مقفل کر کے فٹ پاتھ پر آیا تھا کہ میں اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر نے رک کر حیرت اور قدرے ناگواری سے میری صورت دیکھی۔ ”کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟“ اس کے لبے میں تکبر نمایاں تھا۔

”آپ نے مجھے پہچانا نہیں ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے زبردستی اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ابو القاسم ہوں۔ آپ نے میرے والد ابو الحسن کا علاج کیا تھا اور وہ ٹھیک ہو گئے تھے۔“ ”کون ابو الحسن...؟“ ڈاکٹر نے ایک لمبے لمبے کو ذہن پر زور دیا۔ ”مجھے تو یاد نہیں آ رہا، کب کی بات ہے؟“

”تین چار مہینے ہو گئے۔ آپ نے ان کا آپریشن کیا تھا اور ہماری مالی حالت پر ترس کھاتے

منصوبہ تھا، میں کچھ اندازہ نہ کر سکا۔ میں نے دکان میں داخل ہونے سے پہلے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ہر طرف نظریں دوڑائیں کہ کہیں اس کا بھائی تو ادھر ادھر موجود نہیں۔ اطمینان کر کے میں بھی دکان میں داخل ہو گیا۔ دکان کے اندر بہت بھیڑ تھی۔ گاہکوں میں لڑکیوں اور عورتوں کی ہی اکثریت تھی۔ مرد تو اکا دکا ہی نظر آ رہے تھے۔ لڑکیوں اور عورتوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہیرے جواہرات کی نہیں بلکہ سبزی گوشت کی دکان رہی ہو۔ میری نگاہیں نسرین کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ ایک کاؤنٹر پر کھڑی ہیرے جواہرات دیکھ رہی تھی... وہ ایک ایک ہیرا اٹھا کر دیکھتی اور پھر اسے کاؤنٹر پر رکھ دیتی۔ وہ چند لمحوں تک ہیرے اٹھا کر دیکھتی رہی پھر چشم زدن میں اس نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں ششدر رہ گیا۔ دل میں اس کی ہمارت پر عیش عیش کر اٹھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسی دیدہ دلیر بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے سبزین سے معذرت کی اور واپسی کے لیے گھومی، لیکن اس نے دو قدم بھی طے نہیں کیے تھے کہ سبزین نے اسے آواز دی۔ ”مس سننے!“

نسرین نے ایک دم رک کر شانے پر چادر درست کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بڑے پرسکون لہجے میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”آپ نے شاید بھولے سے دو ہیرے اپنے پرس میں رکھ لیے ہیں۔“ سبزین نے قدرے جھجک کر کہا۔

”کیا کہا...؟“ نسرین ایک دم بھڑک اٹھی۔ اس نے کاؤنٹر کے قریب جا کر اپنا پرس بیچ دیا۔ ”پرس دیکھ لو۔ تمہیں شرم نہیں آتی مجھ پر الزام لگاتے ہوئے۔ میں تمہیں کوئی چور لگ رہی ہوں۔“ اس نے اس قدر تیز لہجے میں کہا کہ فوراً ہی سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ دکان اڑکنڈیشہ تھی، اس کے باوجود سبزین کے چہرے پر پینہ آ گیا۔

”میں نے کاؤنٹر پر بارہ ہیرے رکھے تھے، ان میں سے دو غائب ہیں۔“ سبزین نے گھبرا کر کہا۔ ”یہ ہیرے آپ کے علاوہ کسی اور نے نہیں دیکھے۔“

”تم نے مجھے وہ ہیرے پرس میں رکھتے ہوئے دیکھا تھا؟ اگر دیکھا تھا تو یقیناً“ ہیرے اسی میں ہوں گے... انہیں نکال لو۔“ وہ برہمی سے بولی۔

بات معقول تھی، سبزین بظاہر جھانکنے لگا۔ اس سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ادھر نسرین آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرف دھک رہا تھا۔ دکان میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ سبزین نے اپنے حواس مجتمع کر کے نسرین سے کہا۔ ”آپ اس طرح دکان سے نہیں جاسکتیں۔ ایک منٹ ٹھہریے۔ میں میٹھر کو بلاتا ہوں۔“

”میرا پرس یہ پڑا ہے۔ اس کی تلاشی لے کر اطمینان کر لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ تم ایک شریف خاتون پر الزام لگا رہے ہو۔ میں تمہیں بخشوں گی نہیں۔ اس دکان پر ہنک عزت کا دعویٰ کروں گی۔“ وہ چراغ پا ہو گئی۔

ایک سبزین میٹھر کو بلا لایا جو کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آکر سبزین سے سارا ماجرا

چند دنوں بعد اس کی موہنی صورت اور سراپا کی دل کشی مجھے اس کی تلاش میں بوہری بازار لے گئی۔ میں سہ پہر سے شام تک اس کی تلاش میں بوہری بازار اور زیب التنا سٹریٹ کی خاک چھانٹا پھرا۔ پھر خیال آیا کہ وہ گرفتاری کے خوف سے کچھ دنوں تک ادھر کا رخ نہیں کرے گی۔ کچھ سوچ کر میں طارق روڈ پہنچ گیا۔ اس بات کا امکان تھا کہ وہ کسی شکار کی تلاش میں طارق روڈ بھی آتی رہتی ہوگی۔

میں طارق روڈ پہنچا تو سورج ڈوب چکا تھا... طارق روڈ روشنیوں میں نما رہا تھا۔ اس کی رونق چودھویں کے چاند کی طرح اپنے شباب پر تھی۔ میں نے اس کوٹے سے اس کوٹے تک دو چکر کاٹے۔ کتنی ہی لڑکیوں اور عورتوں پر نسرین کا گمان ہوا، انہیں گھورا، ان کا تعاقب بھی کیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے مایوس ہو کر سوچا کہ نسرین کی تلاش ترک کر کے کسی شکار کو تلاش کرنا چاہئے۔ ”معا“ ایک رکشا آکر سڑک کے کنارے رک۔ اس میں سے ایک لڑکی اتری جس نے سبز رنگ کا بڑا قیمتی اور بھڑکیلا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اور سفید چادر سے اپنے شانے چھپا رکھے تھے۔ کھلے پال پشت پر کھمرے بادلوں کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ اپنا منہ چلا رہی تھی۔ اس کے منہ میں چوگم یا ہل گم تھی۔ آنکھوں پر چشمہ تھا، ہاتھ میں پرس تھا۔ اس کا چہرہ مجھے مانوس سا لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نسرین تھی۔

وہ چہرے مڑے اور اپنی وضع قطع سے کسی اعلیٰ گھرانے کی بیگم لگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرا رواں رواں خوشی سے جموم اٹھا، جیسے مجھے اپنے خواب کی تعبیر مل گئی ہو۔ میرے دل میں اشتیاق اور تجنّس پیدا ہوا کہ دیکھوں تو سہی یہ آج کیا کارنامہ سرانجام دیتی ہے۔

نسرین نے اپنے پرس سے دس کا ایک نوٹ نکال کر رکشے والے کو دیا اور آگے بڑھ گئی تو میں رکشے والے کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ”تم یہ سواری کہاں سے لے کر آئے ہو؟“ میں نے لہرا کر جاتی نسرین کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”کیوں؟ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ رکشے والے نے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔

آپ کون ہیں؟“

”میں سی آئی اے کا آدمی ہوں۔“ میں نے رعب ڈالا۔

”فیڈرل بی ایریا سے...“ رکشے والے نے جواب دیا۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ ”اس لڑکی نے رکشہ بس سٹاپ سے لیا تھا۔“

دھٹا“ دو نوجوان لڑکیاں لہراتی ہوئی آئیں اور رکشہ میں بیٹھ گئیں۔ رکشہ والے نے ان لڑکیوں سے یہ تک نہیں پوچھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ اس نے فوراً ہی مجھے سلام کیا اور رکشہ کا انجن شارت کر کے تیزی سے کھل گیا۔ میں نے اس طرف دیکھا جس طرف نسرین جا رہی تھی، پھر میں اس کی طرف لپکا اور اس سے چند قدم پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ ایک جیولری کی دکان کے سامنے پہنچ کر رکی پھر دکان میں داخل ہونے سے پہلے چادر ٹھیک سے اوڑھ لی۔

وہ آج ہیرے جواہرات کی دکان کو لوٹنے کے ارادے سے آئی تھی۔ آج اس کا کیا

طوعاً و کرہاً" ادھیڑ عمر عورت نسرین کو ساتھ لے کر دفتر میں چلی گئی۔ اس دوران میرا دل شدت سے دھڑکتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ نسرین کے پاس سے میرے برآمد ہو جائیں گے۔ لیکن دس منٹ بعد دونوں خواتین کمرے سے باہر آئیں تو نسرین کے پاس کوئی میرا موجود نہیں تھا۔ مجھے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے ہیرے پکڑنے اور انگلیوں کی مخصوص حرکت سے ہتھیلی تک لے جاتے اور پھر آستین چڑھانے کے لیے ہاتھ اوپر لے جا کر انہیں آستین کے اندر ہی اندر اپنی بغل میں گراتے دیکھا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ گرا کر بغل دہالی تھی۔ اس نے یہ عمل بڑی مہارت سے پورا کیا تھا۔ دکان میں موجود کسی بھی فرد کو احساس تک نہیں ہوا ہو گا کہ ایک حسین لڑکی نے محض بازو کی خفیف سی حرکت سے کتنی بڑی واردات کر ڈالی ہے۔ یہ دَاؤ دیکھنے میں نسرین نے یقیناً "بست محنت اور مشق کی ہو گی ورنہ میں نے پہلے کبھی کسی کو اتنی کامیابی سے اس پر عمل کرتے نہیں دیکھا تھا۔ میں خود بھی یہ گر استعمال کرنے سے پرہیز کرتا تھا کیوں کہ اس میں معمولی سی چوک، سچ چوراہے میں بھانڈا پھوڑنے کے مترادف ہوتی ہے۔ بہر حال نسرین کی بغل میں دونوں ہیرے دبے ہوئے تھے۔ شاید اس ادھیڑ عمر اور سادہ لوح عورت کو اس مقام پر ٹٹولنے کا خیال ہی نہیں آیا ہو گا۔ اس لیے وہ ہیرے تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔

دکان کے میئنجر نے نسرین سے معذرت کر لی اور معاملہ رفع دفع کر دیا۔

نسرین دکان سے نکل گئی۔ جاتے وقت وہ بڑبڑا رہی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس بد مزگی پر کڑھ رہی ہو۔ میں اس کی اداکارانہ صلاحیتوں اور فن کاری پر عیش عیش کر اٹھا۔ وہ باہر چلی گئی تو میں نے اس ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھا جو چند عورتوں کے ساتھ کاؤنٹر پر کھڑی زیورات دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو اچانک میرا پاؤں اس کے پاؤں سے الجھ گیا۔ میں نے کسی پرندے کی ناکام پرواز جیسا انداز اختیار کر لیا۔ میرے دونوں بازو لہرا گئے۔ میں منہ کے بل گر پڑا لیکن اس دوران میں اسی خاتون کا ایک بازو میری گرفت میں آ گیا۔ کرتے کو کوئی تو سارا چاہئے تھا میں نے اسے ہی جکڑ لیا۔ "بیٹھا" ہم دونوں ہی فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

عورت کے حلق سے ایک دل دوز چچ نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی میں بھی چچ پڑا۔ "یقیناً میرے چہرے پر بے پناہ اذیت ظاہر ہو رہی ہو گی جسے دیکھ کر سب ہی متاثر ہوئے" حتیٰ کہ وہ خاتون بھی قائل ہو گئی کہ غلطی میری نہیں بلکہ اسی کی تھی۔ وہ سٹول پر یوں بیٹھی تھی کہ اس کا ایک گھٹنا باہر نکلا ہوا تھا۔ اس کی وہی ٹانگ میرے آڑے آئی تھی۔ غلطی میری نہیں تھی، اس کے باوجود میں نے معذرت کی، جسے اس نے بڑی فراخ دلی سے مسکرا کر قبول کر لیا بلکہ مجھے بست سی دے گئیں بھی دے ڈالیں۔ میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ نسرین ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ میں اس کے پیچھے لپک پڑا۔

چلتے چلتے وہ ایک دکان پر رکی اور وہاں سے بیل گم خریدنے لگی۔ بیل گم خرید کر اس نے ایک پیس تو منہ میں ڈال لیا، دو پیس پرس میں رکھ کر آگے بڑھ گئی۔ اب اس کا رخ طارقی روڈ سے علامہ اقبال روڈ کی طرف تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اسے ایک اور جیولرز شاپ میں داخل

میں دکان پر اسے کاؤنٹر پر الٹ دیا۔ پرس میں دو ہزار کی رقم، میک اپ کا سامان، ایک چمک بک اور بال پوائنٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میئنجر اور سلیزمین نے پرس کی اچھی طرح سے تلاشی لی۔ ہیرے پرس میں ہوتے تو ملتے۔ آخر میئنجر نے نسرین سے کہا۔ "ہم کسی خاتون کے ذریعے آپ کی جامہ تلاشی لیں گے۔"

"ضرور... لیکن ایک شرط پر۔" وہ تنک کر بولی۔

"کیسی شرط...؟" میئنجر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اگر ہیرے برآمد نہ ہوئے تو آپ کو دس ہزار روپے ادا کرنا ہوں گے۔"

"یہ کیا شرط ہوئی۔" میئنجر بولا۔ "آپ ہم پر کوئی شرط عائد نہیں کر سکتیں۔ ہم اپنا شک

دور کر رہے ہیں۔"

"اور میں جواباً" وہ ذلت دور کرنا چاہتی ہوں، جو اس دکان میں آنے کی وجہ سے مجھے برداشت کرنا پڑی ہے۔"

"ہمارا مقصد یہ نہیں ہے، جو آپ سمجھ رہی ہیں اور نہ ہی اس میں ذلت کی کوئی بات ہے، ہم صرف اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں، جس کا ہمیں پورا پورا حق حاصل ہے۔ اگر آپ نے ہم سے تعاون نہ کیا تو ہم پولیس کی مدد لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

پولیس کا نام سن کر نسرین فوراً "نرم پڑ گئی۔" ٹھیک ہے، آپ اپنا اطمینان کر لیں۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

جیولرز شاپ میں موجود خواتین میں سے ایک ادھیڑ عمر خاتون نے آگے بڑھ کر کہا۔ "لڑکی! اگر تمہارے پاس وہ ہیرے موجود ہیں تو واپس کر دو، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"مگر آئی... " نسرین رو ہانسی ہو گئی۔ "میرے پاس ہیرے نہیں ہیں۔"

"خوب سوچ سمجھ لو۔" ادھیڑ عمر خاتون نے اسے سمجھایا۔ "انسان سے غلطی ہو جاتی ہے۔ ہیرے واپس کر کے معذرت کر لو۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔"

"مگر میں قسم کھا سکتی ہوں کہ... " نسرین کی آنکھوں میں آنسو چل آئے۔

ادھیڑ عمر خاتون نے ہاتھ اٹھا کر اس کا جملہ کاٹ دیا۔ "تمہیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو تمہیں اپنی بیٹی سمجھ کر سمجھا رہی تھی۔"

"دیکھئے خاتون۔" میئنجر نے جلدی سے کہا۔ "ممکن ہے کہ سلیزمین کو غلط فہمی ہو گئی ہو۔ تاہم آپ میرے آفس میں چلی جائیں اور اس مہربان خاتون کو تلاشی دے دیں۔"

"میرا خیال ہے آپ کو یہ کام کسی لیڈی کانسٹیبل سے کروانا چاہئے۔" ادھیڑ عمر خاتون نے مشورہ دیا۔

"نہیں... ہم اپنے معزز گاہکوں کے، قار اور اپنی دکان کی ساکھ کا خیال رکھتے ہیں۔ پولیس آئے گی تو ہماری بھی بدنامی ہو گی۔ آپ کو زحمت تو ہو گی، ذرا ان کی تلاشی لے کر اطمینان کر لیں۔"

ہوتے ہوئے دیکھا۔

میں بھی اسی دکان میں داخل ہو گیا۔ یہ دکان کافی بڑی تھی اور اس میں رش بھی بہت تھا۔ ایک کامیاب دلیرانہ واردات کی کامیابی کے بعد نسرین کے حوصلے جیسے بڑھ گئے تھے۔ اس دکان میں بھی اپنے اسی منصوبے پر عمل کیا، جسے وہ پہلی دکان میں آزما چکی تھی۔ یہاں بھی وہی کچھ ہوا جو پہلی دکان میں ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس دکاندار نے فیروز پور تھانے سے ایک لیڈی کانشیل کو بلا لیا۔ اس نے نسرین کی جامہ تلاش لی۔ میں نے اس دکان میں بھی سلیزین سے کہا تھا کہ مجھے اپنی معنی کے لیے انگوٹھی خریدنا ہے۔ اس نے مجھ سے دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا۔ میں دکان میں انتظار کرنے کی بجائے باہر آکر انتظار کرنے لگا۔ فٹ پاتھ پر ایک پھان چادر بچھا کر نقلی میرے موتی، پتھر اور انگوٹھیاں بیچ رہا تھا۔ میں اس کے پاس کھڑا اپنا وقت کاٹا رہا۔

نسرین کوئی ایک گھنٹے بعد باہر آئی تو مضطرب اور پریشان سی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک قریبی ریسٹوران کے فیملی روم میں جا بیٹھی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی جا بیٹھا۔ اس نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ پہلے تو وہ میری اس بدتمیزی اور جرات پر حیران و پریشان ہوئی پھر تنک کر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”ایک انسان ہوں تم جیسا...“

”اگر انسان ہوتے تو یہاں بیٹھنے کی جرات نہ کرتے۔“

”یہ بات آپ نے اس دن محبوب بخش مارکیٹ میں لفٹ کے پاس تو نہیں کہی تھی۔“

”اوہ...“ نسرین چونک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری صورت دیکھنے لگی۔ ”اچھا تو وہ تم ہی تھے، بد معاش! تم نے میرے بھائی کی جیب...“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا کیوں کہ ویٹر آگیا تھا۔

میں نے فوراً اسے چائے اور سینڈوچ لانے کے لیے کہہ دیا۔ ویٹر چلا گیا تو اس نے اپنی بات پوری کی۔ ”میرے بھائی کی جیب کاٹی۔ اچھا ہوا تم مل گئے۔ میں ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کرتی ہوں۔“

”میں نے تمہارے بھائی کی جیب کاٹی تھی مگر تم نے کس کی جیب صاف کی تھی؟“

”کون... میں نے؟“ وہ بوکھلا گئی۔ ”میں بھلا کسی کی جیب کیوں کاٹنے لگی۔ میں ایک

شریف لڑکی ہوں۔ پاکت مار نہیں ہوں۔“

”جھوٹ بولنے سے حقیقت نہیں چھپ سکتی۔ نجات اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں ہے۔

یہ حقیقت نہیں کہ تم دراصل...“

”پاکت مار ہوں“ وہ یک لخت ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی پھیل سی تھی۔ ”کیس تم نے چرس تو

نہیں پی رکھی ہے؟“

”اگر میں بکا ہوا دکھائی دیتا ہوں تو اس کی وجہ چرس نہیں بلکہ تمہارا سراپا ہے۔ جب سے

دیکھا ہے حواس باختہ ہوں۔“

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے اپنی چہل قدمی پر نہیں آزمائی تھی۔“

”یقیناً“ نہیں آزمائی تھی۔“

”سچ سچ بتاؤ کہ وہ رقم کہاں ہے؟“ وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ ”ورنہ ابھی پولیس کو بلاتی ہوں۔“

”پولیس ثبوت مانگتی ہے۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے تمہارے بھائی کی جیب کاٹی تھی؟“

”ثبوت!“ وہ گزبوا سی گئی۔ ”میں اور میرا بھائی تمہارے خلاف گواہی دیں گے کہ تم نے اس کی جیب سے پچاس ہزار کی رقم اڑائی تھی۔“

”پولیس اس گواہی پر مجھے گرفتار کر لے گی مگر یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہو جائے گا کہ وہ رقم آپ ہی کی تھی۔“

”وہ رقم ہماری نہیں تو کس کی ہو سکتی ہے؟“ ”کسی کلاتھ شاپ پر شاپنگ کے لیے آنے والی کسی خاتون کی... جس کا پرس تم نے اڑا لیا ہو۔“ میں نے خیال آرائی کی۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا میں نے دیکھا کہ اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے پھوٹ آئے ہیں۔ تاہم اس نے فوراً ہی سنبھل کر کہا۔ ”وہ رقم میرے بھائی نے اسی روز بینک سے نکلوائی تھی۔“

”اگر تمہارے بھائی جان یہ ثبوت فراہم کر دیں تو میں وہ رقم خود ہی تمہاری خدمت میں پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”ثبوت، ثبوت، ثبوت۔“ وہ چڑ سی گئی۔ ”میں کیا ضرورت پڑی ہے کہ تمہیں ثبوت پیش کرتے پھریں۔“

”اگر آپ ثبوت پیش نہیں کر سکتے تو نہ سہی مگر میں یہ ثبوت پیش کر سکتا ہوں کہ وہ رقم آپ لوگوں کی نہیں بلکہ اس مشہور ماہر امراض قلب کی بیوی کی ہے جو اپنی بیٹی کی شادی کی خریداری کے سلسلے میں ایک کپڑے کی دکان پر شاپنگ کر رہی تھی کہ اس کا پرس اڑا لیا گیا، بعد میں وہ پرس میں نے آپ کے بھائی جان کے ہاتھ میں اس سیاہ برقعے سمیت لپٹے ہوئے ایک پیکٹ میں دیکھا تھا جو آپ گھر سے پن کر نکلے تھیں۔“

نسرین کی بڑی بڑی ہڈی ہڈی پر حد پر کشش آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ اپنی جگہ پتھر کی مورتی بنی، ساکت بیٹھی تھی۔ اگر اس کی سانسیں دھوکنی کر طرح نہ چل رہی ہوتی تو مجھے اس کے زندہ ہونے پر بھی شبہ ہونے لگتا۔ میں نے لوہا خوب گرم دیکھ کر ایک اور ضرب لگائی۔ ”مس نسرین!“ میری زبان سے اپنا نام سن کر وہ اچھل سی پڑی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ ”آپ نے بس میں بھی ایک عورت کے پرس سے ہزار روپے نکالے تھے۔ کیا آپ کو اس سے بھی انکار ہے؟“

نسرین کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ میرے الفاظ نے جیسے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر لبو کی ایک بوند بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ چند لمحے بعد اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اسی لمحے ویٹر ایک ٹرے میں پانی، چائے اور کھانے کا سامان لے آیا۔ وہ رات میں پڑ

تھی۔ میں نے اس کی تعریف یوں کی تھی کہ یہ عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ اس نے ہلکوں کی چلن نیچے گرائی پھر اسے اٹھا کر بولی تو اس کے چہرے پر مگر استعجاب چھایا ہوا تھا۔ ”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں آؤں گی... میں کہیں اور بھی تو جاسکتی تھی؟“

”دل کو دل سے جو براہ پیدا ہو جاتی ہے“ اسی کو تو کہتے ہیں۔ ”میں نے شوخی سے جواب دیا۔ ”میرے دل نے...“ میری بات درمیان ہی میں رہ گئی۔ کیوں کہ کین کا پردہ ہلا اور نسرین کے بھائی کا اترا ہوا چہرہ نظر آیا جو مجھے دیکھ کر چونک پڑا۔ اس نے دوسرے ہی لمحے مجھے پہچان لیا۔ اس کے چہرے پر نفرت اور غصے کی لکیں ابھر آئیں۔ وہ مجھے نسرین کے ساتھ دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے کچھ کہتا، نسرین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”پلیز بھائی جان! ایک منٹ...“

پھر وہ فرانسیسی زبان میں نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی کہ اس کی نفرت اور غصہ ایک دم جھاگ کی طرح بجھ گیا۔ آخر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ”میرا نام خیاف عارف ہے۔“

میں نے بھی بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ ”مجھے سکندر کہتے ہیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔“

”آپ سکندر نہیں بلکہ سکندر اعظم ہیں۔“ اس نے مجھے تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بڑے سے بڑے جیب تراش کے ہاتھ میں بھی ایسی صفائی نہیں دیکھی۔ آپ کے ہاتھوں میں تو شاید بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔“

”شکریہ“ میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ”آپ نے تو کچھ زیادہ ہی تعریف کر دی۔“

”ہیرے کی قدر ایک جوہری ہی کر سکتا ہے۔ کیوں نہ ہم تینوں مل کر کام کریں!“ اس نے تجویز پیش کی۔

”مجھے افسوس ہے کہ کسی سے مل کر کام نہیں کرتا۔“

”وہ کیوں؟“ نسرین نے حیرت سے پوچھا۔ ”ایک چھوٹا سا مگر منظم گروہ کسی تنہا شخص کے مقابلے میں ہمیشہ بہتر رہتا ہے۔ کیوں کہ...“

”مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے مگر میں اس قسم کا جیب کترایا جیب تراش نہیں ہوں جیسا کہ عام طور پر ہوتے ہیں۔ میں ایک مختلف قسم کا پاکٹ مار ہوں۔ میرے اپنے کچھ اصول ہیں۔ میں ہر شخص کے جیب پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ صرف اس کی جیب کاٹتا ہوں جو دوسروں کی جیب کاٹتا ہے یا مجھ کو زیادتی سے دوسروں سے رقم وصول کرتا ہے۔“

”گویا آپ رائن ہڈ ہیں جو امیروں کا بال لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کرتا ہے۔“ نسرین میری بات پر شوخی سے بولی۔

”میں رائن ہڈ نہیں، صرف ایک ایسا انسان ہوں جسے انسانوں سے محبت ہے اور جو انسانوں کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ خیال کرتا ہے۔“

رکھ کر چلا گیا تو میں نے اس کی طرف پانی کا ایک گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑا سا پانی پی لیں۔ ان لمحوں میں یہ بہترین ٹانک ثابت ہو تا ہے۔“

اس نے کسی معمول کی طرح گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور اسے ایک ہی سانس میں پی گئی۔ اس کے اوسان قدرے بحال ہو گئے تو اس نے فیملی روم کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ وہ شاید اپنے بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے پردہ چھوڑ کر خود پر قابو پاتے ہوئے لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر مرتقل آواز میں پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں آپ کا ایک حقیر سا قدر داں ہوں۔ آپ واقعی ایک عظیم فن کارہ ہیں۔“

میرا جواب سن کر وہ جڑبڑی ہو گئی۔ اس نے کھٹار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ ”میں نے آپ کے بارے میں دریافت کیا تھا۔“

”کل کے واقعے کے بعد بھی کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔“ میں نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی، پھر ایک پیٹری اٹھا کر اس کی حیرت سے منجمد آنکھوں میں جھانکا۔ ”ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔“

”آپ تو استادوں کے استاد ہیں۔“ اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔ ”کل آپ نے جس خوبصورتی اور مہارت سے بھائی جان کی جیب صاف کی، اس کی داد نہ دینا نا انصافی ہوگی۔ نیکی میں بیٹھ کر کچھ دور جانے کے بعد ہی بھائی جان کو احساس ہوا... کہ ان کی جیب صاف ہو گئی ہے... میرے بھائی جان بھی بہت بڑے فنکار ہیں مگر آپ کے مقابلے میں تو شاید ابھی طفل کتب ہی ہیں۔“

”زہ نوازی کا شکریہ!“ میں نے انکار سے کہا۔ ”آپ دونوں نے یہ فن کہاں سے سیکھا تھا؟“

”فرانس میں...“ اس نے پیٹری اٹھاتے ہوئے کہا۔

”فرانس میں؟“ میں نے تعجب ہو کر پوچھا۔ ”کیا فرانس میں جیب تراشی کا کوئی سکول کھلا ہوا ہے؟“

”ہر ملک میں جو جیلیں ہوتی ہیں، وہ جرائم کی تعلیم و تربیت کے سکول نہیں تو اور کیا ہوتی ہیں۔ ہم نے جیب تراشی وہاں کی ایک جیل میں سیکھی تھی۔“

”جیل میں... کیا آپ دونوں فرانس کی جیل میں رہ چکے ہیں؟“

”ہاں“ اس نے سر ہلایا۔ ”ہم ہیروئن لے کر جیلز میں پہنچے تو ایک خبر کی اطلاع پر ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔ پھر واپسی کے سفر میں ہم نے کئی مسافروں کی جیبیں صاف کر دی تھیں۔ حتیٰ کہ کسٹم کے افسران بھی ہم سے محفوظ نہیں رہے۔“

میں نے اس کے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ان نازک مخروطی انگلیوں کی مہارت دیکھ چکا ہوں۔ آپ سے ملنے کی خواہش مجھے کشاں کشاں یہاں لے آئی۔ آپ جتنی خوبصورت ہیں اتنی ہی بڑی فن کارہ ہیں۔“

میرے آخری جملے پر اس کا چہرہ فطری حیا سے سرخ ہو گیا۔ آخر وہ ایک عورت ہی تو

”آپ کی آنکھوں میں انکسری کی خصوصیت ہے۔“ عارف مسکرا کر بولا۔ ”یہی بات ہے

”؟“

”شاید ایسا ہی ہو قدرت نے مجھے ایک مخصوص حس عطا کی ہے جس کی وجہ سے کسی کی جیب کا حال میری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ میں بتا سکتا ہوں کہ نسرین کے پاس میں ایک ہزار روپے ہوں گے۔ آپ کی جیب میں پانچ سو کی رقم کے علاوہ ایک بھرا ہوا ریوالتور بھی موجود ہے۔“ یہ سن کر وہ بڑی بری طرح اچھل پڑے۔ انہوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور اثبات میں سر ہلا کر رہ گئے۔ اس دوران ویٹر آیا تو اسے مزید چائے کا آرڈر دے دیا۔ وہ چلا گیا اور میں ان کی حیرت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ان کے چہرے بڑے دل چسپ لگ رہے تھے۔

”سکندر صاحب! کہیں آپ جادوگر تو نہیں؟“ عارف سنبھل کر بولا۔

”جادوگر ہوتا تو ہر اس ہستی یا شے کو مکھی بنا کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے جو مجھے پسند آتی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ میرا اشارہ نسرین کی طرف تھا۔ وہ میرا مفہوم سمجھ گئی۔ اس کا چہرہ گلزار ہو گیا۔ پھر وہ گفتگو لمبے میں بولی۔ ”مگر آپ کسی جادوگر سے کم بھی نہیں ہیں۔ ہمیں فرانس میں آپ جیسے کسی ذہین آدمی سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ آپ بلاشبہ ایک حیرت انگیز انسان ہیں۔“

”چائے تو بنا دو۔“ عارف نے نسرین سے کہا۔ ”باتوں باتوں میں چائے ٹھنڈی ہو رہی

ہے۔“

ویٹر چائے رکھ کر جا چکا تھا۔ نسرین نے چائے بناتے ہوئے پھر فرانسیسی میں گفتگو شروع کر دی۔ عارف نے اس کے کسی سوال کے جواب میں کوئی بات کہی، جسے سن کر نسرین اپنی جگہ سے اچھل پڑی اس کا چہرہ تاریک ہو گیا اور وہ ایک لمحے کے لیے نڈھال سی ہو گئی... جیسے اسے بھائی کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔ ان کی گفتگو میں ایک لفظ کی بار بار تکرار ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس موضوع پر بات کر رہے ہیں۔

اب تو دونوں کے چہرے ہی مجھ گئے تھے اور مایوسی نے ان کی زبانوں پر خاموشی کی مہر لگا دی تھی۔ نسرین نے بڑی بے دلی سے چائے بنا کر میری طرف بڑھائی۔ میں ان دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ان دونوں کے سامنے اپنی بند مٹھی کھول دی۔ ”کیا آپ ان ہیروں کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے؟ یہ وہی ہیرے ہیں نا جن کی آپ کو تلاش تھی؟“

میری ہتھیلی پر تین ہیرے چمک دکھ رہے تھے وہ ان ہیروں کو دیکھ کر اچھل پڑے۔ نسرین کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ”ہاں یہ وہی ہیرے ہیں، مگر آپ کے پاس کہاں سے آ گئے؟“ نسرین نے اپنی پیٹھ کرسی کی پشت گاہ سے لگا دی۔ ”کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟“

”یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ یہ وہی ہیرے ہیں جو آپ نے دو دکانوں سے ہاتھ کی

مٹائی دکھا کر...“ میں نے دانستہ اپنا جملہ ادا ہو کر اچھوڑ دیا۔

”مگر آپ وہاں موجود نہیں تھے، اگر ہوتے تو بھی اس سے کوئی فرق پڑتا ہے۔“

”یہ تو ہم دونوں کا منصوبہ تھا۔ بے عیب اور نادر مگر آپ نے معلوم نہیں کیسے...“ اس کی زبان لڑکھرائی۔

میں نے مسکرا کر اپنی مٹھی بند کر لی۔ ”لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں یہ ہیرے آپ کو نہیں دے سکتا۔“

ان کے چہرے مجھ گئے۔ مسلسل دو دنوں سے وہ کامیاب ہاتھ مارنے کے باوجود ناکام ہو رہے تھے۔ دکھ سے بی فاختہ اور کوئے اڑے کھائیں والا معاملہ ہو گیا تھا۔ میری نظریں ان کے چروں کا طواف کرتی رہیں۔ جن پر ہر لمحے ایک نیا ہی رنگ نمودار ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد عارف سنبھل گیا۔ اس کے ہونٹوں پر پھمکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”مسٹر سکندر!“ اس نے دوستانہ لمبے میں کہا۔ ”میں اب بھی حیران ہوں کہ آپ ان ہیروں کو حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہو گئے؟“ اس نے یہ کہہ کر نسرین کی طرف دیکھا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس معاملے کو میری اور نسرین کی ملی بھگت سمجھ رہا ہو۔

”سیدھی سی بات ہے۔“ میں عالمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”پہلی دکان سے واپس آتے وقت، ہیرے نسرین کے پاس نہیں تھے، اس لیے یہ وہاں سے بچ کر نکل آئیں۔“

”اودہ تو تم وہاں موجود تھے؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”سایہ کہاں ساتھ نہیں ہوتا!“ میرا لہجہ ذومحانی تھا۔

”پھر آپ کے پاس ہیرے کہاں سے آ گئے؟“ عارف بڑبڑایا۔ وہ الجھ کر رہ گیا تھا۔

”وہاں سے جہاں نسرین نے انہیں رکھا تھا۔“

”اودہ... مگر کہاں؟“ نسرین بے چہن ہو گئی۔

”آخری جان کے پاس۔“ میں نے دھماکہ کر ہی دیا۔ نسرین کا چہرہ کسی لاش کے چہرے کی طرح سفید پڑ گیا۔

”تم لوگوں کا ڈرامہ کافی جاندار تھا۔ لیکن سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا اس لیے ہیروں کے بارے میں دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ تم نے بظنی گرا استعمال کر کے ہیرے اس بڑھیا کی دست برد سے محفوظ کر لیے ہوں گے، دوسرے وہ تلاشی لینے والی بڑھیا بھی تمہاری ساتھی ہو سکتی تھی۔ کیا وہ آپ دونوں کی امی جان ہیں؟“

”شٹ اپ۔“ نسرین غصے سے بولی۔ ”وہ ایک معمولی مرہ ہے۔“

”اودہ...“ میں نے ایک طویل سانس لی۔ ”میں سمجھا تھا، شاید آپ تمام گھر والوں کے ساتھ واردات کرنے نکلی ہیں۔“

دونوں کے منہ بن گئے... لیکن وہ ایسی صورت حال سے دوچار تھے کہ انہیں یہ کڑوی کسلی باتیں مجبوراً برداشت کرنا پڑ رہی تھیں۔

”آئی کے پاس سے تم نے کتنے ہیرے اڑائے تھے؟“ نسرین نے پوچھا۔
”دو۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور تیسرا ہیرا؟“

”یہ وہ ہیرا ہے جسے تمہاری آمد کے بعد مسٹر عارف کو جا کر وہاں سے لانا تھا۔ یہ ہیرا لینے گئے تھے مگر مطلوبہ جگہ ہاتھ مارتے رہے اور بے نیل و مرام واپس آ گئے کیوں کہ میں اس سے پہلے ہی ہیرا وہاں سے حاصل کر چکا تھا۔“

”ہیرا کہاں تھا؟“ عارف نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کاؤنٹر کے حاشے کے نیچے... بیل گم سے چپکا ہوا۔“

دونوں کے حلق سے بیک وقت لمبی لمبی سانسیں نکل گئیں۔

”بہر حال۔“ میں نے انہیں حوصلہ دلاتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں کارنامے سرانجام دے

سکتے ہو اور تمہیں دل میلا نہیں کرنا چاہئے۔ بلاشبہ یہ دونوں وارداتیں بے داغ، ماہرانہ اور فقید المثال تھیں۔“

”اور اس کارنامے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ عارف نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک دم ریوالتور نکال لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ جدید طرز کا ریوالتور تھا۔ خوبصورت لیکن بے حد خطرناک... سائینسز لگا ہوا ریوالتور۔ ”بہتر ہو گا کہ تم یہ تینوں ہیرے ہمارے حوالے کر دو۔“ عارف نے سفاک لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر وحشت برسنے لگی۔ ”ورنہ...“ اس نے جملہ ادھر چھوڑ دیا۔

”یہ کارنامہ نہیں بلکہ بزدلی ہے“ میں نے کہا۔ ”البتہ تم اپنی ران پر جو چھین محسوس کر رہے ہو اسے میرا کارنامہ ضرور کہہ سکتے ہو۔“

اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر اپنا مخصوص چاقو نکال لیا تھا اور اس کی نوک، میز کے نیچے سے اس کی ران پر رکھ دی تھی۔

عارف کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ ایک ساعت کے لیے اس کی آنکھوں میں تشویش کا سایہ لہرایا پھر وہ سنبھل گیا اور اس کے ہونٹوں پر تھنک آمیز مسکراہٹ بھیل گئی۔

”چاقو ہٹا لو۔“ وہ دھیمی آواز میں غرایا۔ ”میں نے آج تک کسی ایسے چاقو کے بارے میں نہیں سنا جو گولی سے زیادہ تیز رفتار ہو۔“

”تم نے ایسے سرج الاثر زہر کے بارے میں تو ضرور سنا ہو گا جو پلک جھپکنے میں آدمی کا کام تمام کر دیتا ہے۔“ میرا لہجہ طعنیہ تھا۔ ”چاقو اسی زہر میں بچھا ہوا ہے اگر نسرین چاہے تو میں یہ تجربہ دکھانے کے لیے تیار ہوں۔ کیوں کہ صرف ہم دونوں ہی اس منظر کو دیکھ سکیں گے جب کہ تم گولی چلانے کی حسرت دل ہی میں لیے ملک عدم سدھار چکے ہو گے۔“ یہ کہہ کر میں مسکرا دیا۔

وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

نسرین کا چہرہ سپید پڑ گیا۔

”کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟“ وہ بڑبڑایا۔

”میرے اندر ایک خولی یہ بھی ہے کہ میں جھوٹ ناگزیر حالات میں ہی ہوتا ہوں۔“

”کس لیے موقع بھی ناگزیر حالات میں سے ایک تو نہیں ہے؟“

”اس کے لیے آزمائش شرط ہے۔“ میرا لہجہ ٹھوس تھا۔

یہ قوت ارادی کا کھیل تھا... اعصاب کا تماشا جس میں کمزور اعصاب والے بیش مات کھا جاتے ہیں اور اس سلسلے میں میری برسوں کی مشق مجھے ان پر فوقیت دے رہی تھی کیوں کہ میرے سامنے تو وہ ابھی کل کے بچے تھے۔

”آخر تم یہ ہیرے ہمارے حوالے کیوں نہیں کر دیتے۔“ نسرین زچ ہو کر بولی۔

”اس لیے کہ ان پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔“

”حق تو تمہارا بھی نہیں ہے۔“ عارف غرایا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ اسی لیے یہ ہیرے حق داروں کو واپس مل جائیں گے۔“ میں نے

وضاحت کی۔ ”جن دکانوں سے تم نے ہیرے اڑائے ہیں، اگر انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا تو ٹھیک ورنہ... ہیرے انہیں واپس دے دیے جائیں گے۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ عارف نے کہا... پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پردے کے اندر کھڑے

کھڑے اس نے دوبارہ ریوالتور نکال لیا۔ اس دوران میں نسرین اس کے پلو میں پہنچ گئی تھی۔ اب وہ دونوں میری زد سے باہر تھے جب کہ میں عارف کے ریوالتور کی زد میں تھا۔ ”کیا خیال ہے سکندر“

کوئی کارنامہ انجام دینے کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہو یا ہمیشہ کی نیند پسند کرو گے؟“

”مجھے زندگی چاہئے۔“ میں نے زیر لب کہا۔

”زندگی خیرات میں نہیں ملتی، اس کا تادان ادا کرنا پڑتا ہے۔“

”کیا قیمت ہے؟“

”صرف تین ہیرے۔“ وہ زیر لب مسکرا کر بولا۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا کچھ دیر جیب ٹوٹا رہا، پھر ہیرے نکال کر آگے بڑھا دیے۔

عارف نے نسرین کو اشارہ کیا۔ اس نے ہیرے لے لیے اور پردہ ہٹا کر باہر چلی گئی۔

”اب تم نے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کی تو میں کوئی رعایت نہیں کروں گا۔“ عارف

نے وارننگ دی اور پلٹ کر کہیں سے باہر نکل گیا۔

میں کچھ دیر تو ساکت بیٹھا رہا، پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ جگہ ایسی تھی کہ میں وہاں کوئی ہنگامہ نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم مجھے خوشی تھی کہ جیت میری ہی ہوئی ہے۔ ان لوگوں کو گھر جا کر ایک بار پھر اپنی ناکامی کا ماتم کرنا پڑے گا۔

دس منٹ بعد میں ہوٹل سے باہر آ گیا اور اس دکان کی جانب چل دیا جہاں سے نسرین نے ایک ہیرا غائب کیا تھا۔ میں نے راستے میں ایک دکان سے بیل گم خریدے۔ ایک بیل گم منہ میں ڈالا

خوشی سے بچ پڑا۔ ”ہیرا مل گیا... ہیرا مل گیا۔۔۔“

دکان کے ملازم اور تمام گاہک حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ فرط مسرت سے چٹخا ہوا دفتر کی طرف بڑھا جہاں جوہری بیٹھا ہوا تھا سب اس کی طرف متوجہ تھے۔ میں نے اس ہنگامے سے فائدہ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ اسے دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہو رہی تھی۔ میں خوشی کی دولت لیے اس دکان کی طرف چل دیا۔ جہاں سے نسرین نے دو ہیرے غائب کیے تھے لیکن وہاں ہیرے واپس کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی کیوں کہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہیرے جس شخص کے ہاتھوں غائب ہوئے تھے وہ سلیزین نہیں بلکہ دکان کے مالکان میں سے تھا۔ میں دکان کے باہر آ کر اس پٹھان کے پاس پہنچ گیا۔ جس سے میں نے نقلی ہیرے خریدے تھے جو ان تین ہیروں سے ملتے جلتے تھے۔ اور جنہیں میں نے عارف کے حوالے کر کے اپنی زندگی کا آوان ادا کیا تھا۔

”بابا تمہارے ان نقلی ہیروں نے کسی کو ایک بوے عذاب سے بچا لیا۔ اس کا اجر تمہیں بھی ملے گا۔“ میں نے کہا

پٹھان میری بات نہ سمجھ سکا اور مسرے لگا۔

میں واپس گھر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ جب انہیں نقلی ہیروں کا پتہ چلا ہو گا تو ان دونوں کے دلوں پر کیا گزری ہو گی۔ سکندر اعظم سے نکلے کر ان دونوں کو منہ کی کھانا پڑی تھی۔ اب ان دونوں کا رد عمل کیا ہو گا؟ کیا عارف میرے خون کا پیاسا ہو کر میری تلاش میں نکل کھڑا ہو گا؟

میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ان دونوں سے مل بیٹھوں جو جائے تاکہ کم از کم ان دونوں کا حلیہ دیکھ کر اپنا دل تو خوش کر لی لوں۔

تین روز بعد میں شام کے وقت گھر سے نکلا... میں ذیبت التماس ٹریٹ پر ٹہل رہا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے اپنے لیے ایک جوٹا خریدنا ہے۔ میں انگلش بوٹ ہاؤس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میں جوٹا پسند کر رہا تھا کہ اچانک ہی اپنے شانے پر ایک نرم و نازک ہاتھ کا لمس محسوس کر کے چونک پڑا۔ ساتھ ہی مسور کر دینے والی سینٹ کی منک نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے شانے کی طرف دیکھا تو ایک خوش نما ہاتھ وہاں موجود تھا۔ میں لمبی لمبی محرومی اٹھوں کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ نسرین کا ہاتھ تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

☆☆☆

کل کی نسرین اور آج کی نسرین میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ آج تو شاید وہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں سے لیس ہو کر آئی تھی۔ راہ چلتے لوگ بھی کچھ ٹھک کر اور کچھ باقاعدہ رک کر اسے دیکھ رہے تھے۔ کئی آدمیوں پر تو مجھے رحم بھی آیا۔ بے چارے دود تک گردن گھما کر اسے دیکھتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ بعض سامنے سے آنے والوں سے ٹکرا بھی رہے تھے۔ اور بعض کے بارے

اور اسے چپاتا ہوا جوہری کی دکان میں داخل ہو گیا۔ میں اس کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا جہاں سے نسرین نے ہیرا اڑایا تھا۔ وہی سلیزین کاؤنٹر پر کھڑا تھا۔ مگر اس کا چہرہ تو کسی مردے کے چہرے جیسا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کوئی اچھی سی انگوٹھی دکھاؤ۔“ وہ میری بات سن کر ادھر بڑھ گیا جہاں انگوٹھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اس دوران دکان کا جائزہ لیا۔ دکان میں رش پہلے سے ذرا کم تھا۔ مگر تمام سلیزین مصروف تھے۔ وہ سلیزین ایک کیس لے آیا جس میں بہت سی انگوٹھیاں تھیں جوئی تھیں۔ میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ تمہارا چہرہ دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ تم برسوں کے مریض ہو۔“

”جج... ججی“ اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ ”آج میرے ساتھ زندگی کا بدترین حادثہ پیش آیا ہے۔“

”اوہ... کیا ہوا؟“ میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا تو اس نے مختصراً ”ایک ہیرا غائب ہونے کا قصہ سنایا۔“

”اب مجھے پینتیس ہزار روپے ادا کرنا ہوں گے۔“ اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ”وہ ہیرا چالیس ہزار روپے میں فروخت کرنے کے لیے رکھا گیا تھا۔ لیکن مالکان نے مجھے رعایت دی ہے کہ میں صرف اصل قیمت ہی ادا کروں۔“

”اگر وہ ہیرا تمہیں واپس مل جائے تو مجھے کیا دو گے؟“

”ذائق مت کیجئے جناب۔“ اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے میری طرف دیکھا۔ پھر زیر لب بولا ”میں آپ کو ساری زندگی دعائیں دوں گا۔“

”ایک قیمتی ہیرے کے بدلے صرف دعائیں... میں خالی خالی دعائیں لے کر کیا کروں گا؟“

”سچے دل سے دی گئی دعا سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔“ وہ جذباتی ہو گیا۔ ”بہر حال میں آپ کو سونے کی ایک انگوٹھی پیش کر دوں گا۔“

”ان میں سے کوئی سی بھی انگوٹھی لے لوں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”ضرور جناب۔“ اس نے سر ہلا دیا۔ ”میں چھوٹا آدمی ضرور ہوں لیکن چھوٹے دل کا نہیں۔“

”وہ ہیرا چوری نہیں ہوا بلکہ اسی دکان میں موجود ہے۔“

”کیا کہا... ہیرا دکان میں ہی موجود ہے۔“ اس نے ہانگوں کی طرح مجھے دیکھا۔ ”کہاں ہے وہ ہیرا؟ دکان میں کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ادھر آؤ“ میں نے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ میری طرف کھوم کر آیا تو میں نے اس سے کہا کہ ”کاؤنٹر کے نیچے دیکھو۔“

اس نے فرش پر دونوں گھٹنے ٹیک دیے۔ پھر جیسے ہی اس کی نظر ہیرے پر پڑی جو وہاں بیل گم سے چپکا ہوا تھا تو اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے پکڑ لیا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر

”کس سوچ میں ڈوب گئے؟“ اس نے کار اشارت کرتے ہوئے کہا۔
 ”سوچ رہا ہوں کہ تم خوشبو لگا کر آئی ہو یا خوشبو کے شب میں غوطہ لگا کر آئی ہو۔“
 جواباً ”وہ تقریباً کھنٹی بن گئی جو بجتی ہوئی روح تک اترتی چلی گئی۔ بڑا ہی مترنم قہقہہ تھا۔
 ”معلوم نہیں جواں سال عورتیں خوشبو استعمال ہی کیوں کرتی ہیں۔“ میں نے زیر لب کہا۔
 ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“
 ”پڑتا ہے۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”اگر تم گلاب کے پھول پر چنبیلی کا عطر چھڑک دو تو کیا ہو گا۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔“
 ”بجتی ہر پھول کی اپنی ایک مک ہوتی ہے۔ فطری خوشبو جو مصنوعی خوشبو کی وجہ سے زائل ہو جاتی ہے۔“
 ”میں سمجھی تھی تم صرف انگلیوں کے فن کار ہو... مگر تم انگلیوں سے زیادہ زبان کے فنکار ہو۔“

”خاک فن کار ہوں۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔ ”بس فن ہی فن ہے جب کہ تمہارے پاس فن کے ساتھ ساتھ یہ شاندار کار بھی موجود ہے۔“
 کار تیزی سے کھنٹن کی طرف دوڑی تھی اور اس سے کہیں زیادہ تیزی سے میرا دماغ کام کر رہا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی آج کیا سوچ کر آئی ہے۔ میں کسی زخمی ناگن سے مروت کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ ماضی میں نیلم کا تجربہ اس بات کا شاہد بھی تھا۔ میں نے کن انکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے سرور انداز میں کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ ”بھائی جان کسی دوسری کار میں پیچھے چلے آ رہے ہیں یا پہلے سے وہاں موجود ہیں۔“ میں پوچھتے بغیر نہ رہ سکا۔
 ”آج ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”کسی اسپتال میں ہیں؟“
 ”اسپتال میں کیوں ہونے لگے۔“ وہ برہم ہو گئی۔ ”گھر میں ہی ہیں۔ ان کے سر میں تکلیف تھی۔“

کار ایک موڑ سے گھومی تو وہ ذرا سی میری طرف سرک آئی۔ میں فوراً ہی کڑکی کی طرف سٹ گیا۔ ”ذرا آہستہ موڑ کاٹو۔“ میں نے کہا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہاری قربت کی آگ میں جل جاؤں۔ اگر ایسا ہوا نرسن تو وعدہ کرو کہ مجھے میری پسند کی جگہ دفن کرو گی۔“
 ”معلوم ہوتا ہے آج تم پر فضول گوئی کا دورہ پڑ گیا ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”ایسی بات ہے تو لو ایک بے فضول بات سنبھالو۔“ میں نے کہا۔ ”کہیں تم کسی انتہائی کاروائی کا ارادہ لے کر تو نہیں آئیں؟“

”اوہ نہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”سکندر خدا کی قسم یہ بات نہیں ہے۔ تم نے کل بھائی جان کے کلا ٹمکس کی جس طرح دھجیاں کھیری ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم ایک بے مثال آرٹسٹ

میں مجھے شبہ ہونے لگا کہ اب زندگی بھران کی گردنیں سیدھی نہیں ہو سکیں گی۔ حسین چہرے پیش سے میری بھی کمزوری رہی ہیں، مگر عورت اپنی ہو یا پرانی، اس وقت بالکل اچھی نہیں لگتی جب آپ کے ساتھ دوسروں کی نظریں بھی اس کا طواف کر رہی ہوں۔ ان لمحوں میں تو اپنی عورت بھی پرانی پرانی سی لگنے لگتی ہے۔

”آج تو شاید مجھے جان سے مار ڈالنے کی قسم کھا کر آئی ہو۔“ میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔
 ”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور میں نے اس کے گال میں پڑنے والے پرکشش گڑھے کو دیکھ کر سانس روک لی۔ ”چلو، یہاں سے تو بٹو۔“ وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ”چلو کہیں اور چلتے ہیں۔“

”کہاں لے کر چلتے کا ارادہ ہے۔ کو تو افق کے اس پار چلیں۔“
 ”یہ جگہ ایسے ڈائیلگ بولنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔“ وہ شوشی سے بولی۔
 ”بولنے میں کوئی کمی رہ گئی ہو گی۔ ورنہ یہ ڈائیلگ تو ہر جگہ چل جاتا ہے۔ معمولی جھگی سے لے کر علوں تک سبھی جگہ بولا اور قبول کیا جاتا ہے۔“
 اس نے جواباً ”روشنے کا تاثر دیا لیکن ہونٹوں پر پھیلا ہوا عجم، اس تاثر کی نفی کر رہا تھا۔
 ”جیسی...“ میں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک جیسی کو اشارے سے روکنا چاہا تو وہ جلدی سے بولی۔ ”نہیں... جیسی کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس گاڑی موجود ہے۔“
 ”چلتا کہاں ہے؟ یہ تو بتا دو۔“ میں نے وضاحت چاہی۔
 ”ڈر رہے ہو؟“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”نہیں... لیکن میں اندھا دھند کسی کنویں میں کودنا پسند نہیں کرتا۔ البتہ ایک کنواں ایسا بھی ہے جو اس احتیاط سے مستثنیٰ ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے اس رخسار کے چاہ زخموں پر نگاہ ڈالی تو وہ میری نظروں کی تاب نہ لا کر جھینپ سی گئی۔

”میں تم سے کسی پر سکون جگہ، اطمینان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“
 ”تو پھر کھنٹن کی طرف نکل چلو۔“ میں نے کار کی طرف بڑھتے ہوئے تجویز پیش کی۔
 تمہاری رفاقت میں سمندر پر غروب آفتاب کا منظر بہت لطف دے گا۔ ادھر سورج ڈوبے گا ادھر چاند نکلے گا۔“

نئی کروڑا دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ دونوں بہن بھائی لہجے ہاتھ مارنے کے عادی تھے۔ ہاتھ تو میں بھی خوب لہجے لہجے ہی مارتا تھا لیکن میں نے درپردہ دولت مند ہونے کے باوجود اپنا معیار زندگی بلند نہیں کیا تھا۔ میں جن لوگوں میں پیدا ہوا تھا، انہی لوگوں میں زندگی گزارنا پسند کرتا تھا۔ چھوٹا سا محلہ، جہاں گھر سے گھریوں ملا ہوا تھا جیسے جسم کے تمام اعضا ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے والے لوگ وہاں رہتے ہیں۔ جہاں مکانوں میں فاصلہ نہ ہو وہاں دلوں میں فاصلہ کیوں ہونے لگا۔ اور جہاں مکان ہی ایک دوسرے سے دور ہوں، وہاں دلوں کا فاصلہ کیوں نہیں بڑھے گا۔

اس نے پلو اپنی بغل سے نکال کر کلائی پر پیٹ لیا۔ ”ہم بہت دور نکل آئے ہیں۔“ اس نے پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ دور آنا اس دور نکل جانے سے بہت بہتر ہے۔“

”یہاں سے تو جب جی چاہے واپس جایا جاسکتا ہے۔“

”چلو واپس چلیں...“ یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی واپس چل دی۔ میں بھی اس کے ساتھ چلتے لگا۔

”تھوڑی دیر قبل تم مجھے کولیس یا واسکوڈی گاما بننے کا مشورہ دے رہی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”پھر بات ادھوری ہی رہ گئی۔“

”اور تم نے میری بات کا فوراً غلط مطلب نکال لیا تھا۔“

”عقل مند آدمی وہی ہوتا ہے جو عورت کی باتوں کا ہمیشہ غلط مطلب سمجھتا ہو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پھر یہ ماحول تو ایسا ہے کہ آدمی لاکھ صحیح مطلب نکال رہے، وہ ہو گا غلط ہی...“

اس بار وہ کچھ نہیں بولی۔ بس ساڑھی کا پلو ہی سنبھالنے میں لگی رہی۔

”چلو میں چپ ہو جاتا ہوں۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تم بولنا شروع کر دو، لیکن عورتوں کا ردائی ہو جانا مجھے پسند نہیں ہے۔ سیدھے سادھے لفظوں جو کچھ کہنا ہے، کہہ ڈالو۔ سب سے پہلے تو میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم ایک عدد ناگ کو دعوت دے کر اس ویرانے میں کیوں لائی ہو؟“

اس وقت ہم واپس ساحلی دیوار کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس نے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں بیٹھیں کچھ دیر؟“

”وہاں چلو۔ یہاں لہروں کے شور میں کچھ سنائی نہیں دیتا اور وہاں تمہاری آنکھوں کے شور میں کچھ سنائی نہیں دے گا۔“

”تمہاری باتیں واقعی کسی عام سی لڑکی کو پاگل بنا سکتی ہیں۔ اور یہ جو تم خود کو ناگ کہہ رہے تھے تو میں تمہیں ناگ سمجھ کر ساتھ نہیں لائی تھی۔ میرے نزدیک تم ایک اچھے کردار کے نوجوان ہو۔“

”اچھا... جب کہ میں سمجھ رہا تھا کہ تمہیں کسی سپرین کی طرح ناگوں سے ڈر ہی نہیں لگتا۔“

”میں نے مغرب کے آزاد ماحول میں آنکھ کھولی تھی سکندر۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی ”میں آئس کریم نہیں ہوں جو ذرا سی آج سے پھل جاتی ہے۔ یقین کرو، قدرت نے ہر عورت کو

ایک خاص حس سے نوازا ہے، جس کے ذریعے وہ مردوں کی فطرت کا پتہ چلا لیتی ہے۔“

”اور یہ جو سینکڑوں کی تعداد میں جا ہی کے گڑھے میں گر جاتی ہیں، ان کی حس کیا رنگ آلود ہوتی ہے؟“

”وہ اپنی اس حس سے کام نہیں لیتی ہیں۔ بس آنکھیں بند کر کے اندھا اندھ گڑھے میں کود

ہو۔ استادوں کے استاد ہو۔ اگر تم ہمارے ساتھ یورپ نکل چلو تو ہم وہاں دولت کے ڈھیر لگا سکتے ہیں۔ ایک مہینے میں کروڑ پتی بن جاؤ گے۔“

میں نے ایک طویل سانس لی۔ ”مس نرسن...“ میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں اپنی ضرورت کے مطابق کماتا ہوں اور سکون کی نیند سو جاتا ہوں۔ مجھے زیادہ کی ہوس نہیں۔ اب مجھے لکچر مت دینا کہ دولت آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ساری دنیا دولت کے پیچھے بھاگ رہی ہے مگر میں دولت کے آگے آگے چلنا پسند کرتا ہوں۔“

”تمہاری باتیں اپنی جگہ لاکھ خوب صورت سی مگر میرا فلسفہ یہ ہے کہ دولت حاصل کرنے کا جہاں بھی اور جیسا بھی موقع ملے، اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

میں خاموش رہا۔ کار کفٹن کے ساحل پر پہنچ گئی تھی۔ میں نیچے اتار آیا۔ سورج ڈوبنے کا منظر بے حد دلچسپ تھا۔

”آؤ گیلی ریت پر چلیں۔“ اس نے تجویز پیش کی۔

ہم نرم نرم اور گیلی ریت میں، ٹخنوں تک دھنستے ہوئے دور تک نکل گئے۔ نرسن کچھ چپ سی تھی۔ شاید کچھ سوچ رہی تھی۔ میں اس ماحول کی مناسبت سے حسین باتیں کرنا چاہتا تھا، لیکن ساتھی کو سنجیدہ دیکھ کر انسان پر خواہ مخواہ سنجیدگی طاری ہو جاتی ہے۔ شام کا دھندلا پھیل گیا تھا اور لہروں کی موسیقی روح پرور محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے بے اختیار خنیم یاد آگئی۔ اس کی آنکھوں میں سمندر کی سی گہرائی تھی۔ ایسی ہی لہریں ان سمندر سی آنکھوں میں بھی ابھرتی ہیں اور دیکھنے والوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ان لہروں کی موسیقی سمندر کی ان لہروں سے زیادہ مسحور کن ہے۔ سمندر کی لہریں تو پیروں سے ٹکرا کر اور ٹوٹ کر واپس چلی جاتی ہیں جب کہ ان لہروں کو نہ تو ٹوٹنا آتا ہے اور نہ ہی وہ ناکام واپس جاتی ہیں... اس لیے اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا، تنہا ساحل پر ٹھل رہا ہوں۔ نرسن مجھے اپنا متحرک سایہ لگ رہی تھی۔ ایک ایسا سایہ جو ذرا سی تاریکی بڑھنے پر تحلیل ہو جائے گا۔

”دراصل میں چاہتی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو دریافت کر لیں۔“ یکایک وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

”آں...“ میں چونک پڑا۔ ”کیا مطلب؟“

”ہمارے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہے تو ہم...“

میں نے جلدی سے اس کی ساڑھی کا پلو تھام لیا۔ جو بار بار اڑ کر میرے چہرے سے ٹکرا رہا تھا۔

آخر وہ ایک عورت ہی تو تھی۔ میری اس حرکت پر چونک پڑی۔ میں نے اس کی سانہوں میں تیزی محسوس کی۔ ویسی ہی تیزی جو کسی خوف کے باعث پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے فوراً ہی پلو چھوڑ دیا۔ ”اپنا پلو سنبھال کر رکھو۔“ میں نے گہری تنانت سے کہا۔ ”یہ بے جان سا کپڑا ہوا کے شریر جھوٹوں سے کبھی کبھی گمراہ کن اشارہ بھی بن جاتا ہے۔“

”اور اگر ناکام رہے تو سرکاری سمان خانے میں ہوں گے۔“ میں نے لقمہ دیا۔ ”بہر حال“ تمہارا مطلب ہے کہ وہ اس بار تخت یا تختہ والا موڈ بنا چکے ہیں۔ اس بڑے کام میں تم ان کا ساتھ کیوں نہیں دیتیں۔ آخر ان چھوٹے چھوٹے کاموں میں کیا رکھا ہے؟“

”چھوٹی مچھلی، بڑی مچھلی سے زیادہ لذیذ ہوتی ہے“ سکندر۔ ”وہ مسکرا کر بولی۔ ”یہ باورچی خانے کا ایک گر ہے جسے عورت، مرد سے زیادہ جانتی ہے۔“

”گویا اس نے معاملے میں تم بہن بھائی ایک دوسرے سے متفق نہیں ہو؟“

”ہاں... میرا کہنا ہے کہ آدمی کو ہمیشہ ناکامی کا پہلو پیش نظر رکھ کر خطرہ مول لینا چاہیے۔ اگر وہ کوئی ایسا کام یہاں کرنا چاہے۔۔۔ تو میں یقیناً ان کا ساتھ دیتی۔ غیر ممالک میں نہیں...“

”کوئی خاص وجہ؟“

”کئی وجہ ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ وہاں کا ہر دوسرا آدمی ہمارے ہاں کی طرح رشوت خور نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میں تمہارے ساتھ رہ کر زندگی انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ اگر تم پسند کرو تو ہم مل کر کام کریں گے اور تم پسند نہیں کرتے تو ہم الگ الگ کام کریں گے۔“

”... لیکن رہیں گے ساتھ ساتھ؟“

”ہاں“ اس نے جواب دیا۔

”اس کرم فرمائی کی کوئی خاص وجہ؟ میرا خیال ہے کہ کراچی میں تمہیں مجھ سے بھی زیادہ احقر مل سکتے ہیں۔“

”ایسا مت کہو سکندر۔ تم اپنی قدر و قیمت نہیں جانتے۔ میں تم سے کچھ سیکھنا چاہتی ہوں۔“

”اوہ“ تو یوں کہنا شاگرد بننا چاہتی ہو۔ ”میں ہنس پڑا۔“

”دوسرے لفظوں میں تم یہی سمجھ سکتے ہو۔“ وہ بولی۔ ”بھائی جان چلے جائیں گے تو میں تمہارا رہ جاؤں گی۔ مجھے تمہارا سارا چاہیے سکندر۔ دیکھو، پلیز انکار مت کرنا۔“

”اور وہ خالہ جان... کیا ان کا انتقال ہو گیا ہے؟“

”نہیں... لیکن وہ تو محض ایک مرہ ہے جسے ہم کبھی کبھی استعمال کر لیتے ہیں۔ ان سے کوئی رشتہ داری توڑی ہے۔“

میں خاموش رہا۔

”بس اب تم جلد! سے ہاں کہہ دو“ سکندر تم۔ تم میرا سارا بن جاؤ، میں تمہارا سارا بن جاؤں گی۔ اگر میں اندر ہوئی تو میرے لیے بھاگ دوڑ کرنا اور اگر تم کبھی پکڑے گئے تو میں تمہاری ضمانت بن جاؤں گی۔“

”کیا اس شرم میں تمہارا کوئی بھی رشتہ دار نہیں ہے۔“

”ہیں تو سہی مگر ہمارا میل جول نہیں ہے۔ وہ ہمیں پسند نہیں کرتے مجبوراً ہم نے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔“

جاتی ہیں۔“

میں خاموش ہو گیا۔ باتوں کے زور میں ہمہ کر مجھے یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کوئی خاص بات کہنے کے ارادے سے مجھے یہاں لائی ہے، لہذا میں اسے مقصد کی طرف آنے کی سہولت دینا چاہتا تھا۔ ہم دیوار پر بیٹھ گئے۔ اس پاس درجنوں افراد تھے، لیکن کسی کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ سب فطرت کے اس حسین منظر سے اپنے اپنے ظرف کے مطابق حسن کشید کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے نسرین کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں دور سمندر کے سینے پر کسی بہت بڑے تنے کی طرف چبکتے ہوئے چاند میں ابھی ہوئی تھیں۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی غالباً اپنے ذہن میں الفاظ کی ترتیب درست کر رہی تھی۔

”کل بھائی جان نے تم سے جو سلوک کیا تھا، میں اس پر تادم ہوں۔“ اس نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

”حالانکہ شرمندہ بھائی جان کو ہونا چاہیے تھا۔“

”وہ بے حد شرمندہ ہیں“ سکندر! ”

”لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ ان کی طبیعت ناماز ہے۔ سر میں درد ہے۔ شرمندگی سے ایسا تو نہیں ہوتا۔“

”ہمیں اوپر تلے دوبار تمہاری وجہ سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔“ وہ میری بات پر برہم ہوئے بغیر بولی۔ ”بھائی جان کا سلوک لاکھ انصاف پر مبنی سہی لیکن ایک ہی میدان کے کھلاڑیوں کو اسپورٹس میں اسپرٹ سے کام لینا چاہیے، اس لیے ہمیں ندامت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم، تم سے بھی اعلیٰ ظرفی کی توقع کرتے ہیں۔“ وہ اپنی روشن آنکھوں میں دیپ جلائے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہے۔ لیکن میں موم کا بنا ہوا کوئی پتلا نہیں تھا جو اتنی آسانی سے پگھل جاتا۔ تاہم میں نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالینے میں کوئی غار نہیں سمجھا۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر وہ سمجھی کہ شاید میں اس کے تیر کا نشانہ بن گیا ہوں۔ اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ”ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے ہیں“ سکندر لیکن اس کے لیے تمہیں کل والی تجویز پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہو گا۔“

”دیکھو نسرین، میں نے کل ہی صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ میں کسی سے پار ٹر شپ نہیں کر سکتا۔ میرے اپنے کچھ اصول ہیں جنہیں میں کسی قیمت پر توڑنا پسند نہیں کرتا۔“

”تم سمجھ نہیں سکندر۔“ اس کی سرگوشی مزید بوجھل ہو گئی۔ ”اس کا دوبار میں اب بھائی جان ہمارے پار ٹر نہیں ہوں گے۔ صرف تم اور میں.... ہم دونوں مل کر بہت سے کارنامے سر انجام دے سکتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میری بے خبری میں نہ جانے کب میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”کیوں“ تمہارے بھائی جان اس دھندے سے تائب ہو گئے ہیں کیا؟“

”نہیں... وہ کچھ دنوں کے لیے یورپ جا رہے۔ وہ کوئی لمبا ہاتھ مارنا چاہتے ہیں۔ اگر کامیاب ہو گئے تو وہ کروڑوں کے مالک ہوں گے۔“

”گویا بھائی جان کے جانے کے بعد تم واقعی تیارہ جاؤ گی۔ میں تو خیر ازل سے ہی تیار ہوں“ اسی لیے میں نے ایک ایسے محلے میں رہائش اختیار کر لی ہے، جہاں کے سب لوگ مجھے اپنوں کی طرح چاہتے ہیں۔ تم بھی کوئی ایسا ہی محلہ ڈھونڈ لو۔“

”میں نے اس کا محل ڈھونڈ لیا ہے۔“

”مجھے نہیں بتاؤ گی؟“

”ہم کسی ایسے سے علاقے میں ایک فلیٹ لے لیں گے۔“ وہ اس طرح بتانے لگی جیسے میں نے اس کے ساتھ رہنے کی ہائی بھری ہو۔

”تم میرے ساتھ رہو گی، ایک گھر میں، ایک چھت کے نیچے، شادی کر کے؟“

”شادی...“ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ”کیا ہم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے؟“

”یہ یورپ نہیں ہے نسرین بیگم۔ اس وقت تم مشرق کی فضا میں سانس لے رہی ہو۔ یہاں بغیر شادی کے کوئی جوڑا رہے گا تو لوگ باتیں بنا بنا کر اس کا بیٹا حرام کر دیں گے۔“ میں نے کہا۔

”کن لوگوں کی بات کر رہے ہو تم؟“

”میں لیاقت آباد کی بات کر رہا ہوں، جہاں میں رہتا ہوں۔“

”میں لیاقت آباد کی بات نہیں کر رہی ہوں۔“ وہ بھنا کر بولی۔ ”ہم سوسائٹی میں رہیں گے۔ وہاں کوئی ہمارے ہاں جھانکنے نہیں آئے گا۔ کسی کو بزنسوں... پتہ نہیں چلے گا کہ ہم کون ہیں اور کیا کرتے ہیں یا ہمارے درمیان کیا رشتہ ہے۔“

”ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہو گا تو ہم ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکیں گے۔ میں خود بھی تو اس بات کو پسند نہیں کرتا۔ میں پاکٹ مار ضرور ہوں لیکن میرے چند اصول ہیں جنہیں میں کبھی نہیں توڑتا۔ حسین چروں کو پسند کرنا اور بات ہے اور کسی حسین لڑکی کے ساتھ کسی رشتے کے بغیر رہنا دو سری بات ہے۔ مغربی معاشرہ ایسی لڑکیوں کو چاہے کچھ نہ کہتا ہو مگر میں ایسی لڑکیوں اور بازاری عورتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھتا۔“ میں نے ایک ہی سانس میں ساری نفرت اگل دی۔

اس کے چہرے پر غصے کی سرخی اٹھ آئی۔ چاندنی میں اس کا تھمتا ہوا چہرہ بہت حسین لگ رہا تھا۔ وہ مجھے ایسی حساس لڑکی نہیں لگتی تھی لیکن اسے حساس بننا پڑا تھا۔ میں نے چوٹ بھی تو براہ راست اس کی نسوانیت پر لگائی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں جل تھل شروع ہونے والا ہو لیکن وہ اس پر بند باندھنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔

”تم نے مجھے سمجھنے میں بہت غلطی کی ہے، سکندر۔“ کالی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی تو اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ”میں کوئی آوارہ لڑکی نہیں ہوں۔ یورپ میں سینکڑوں جوان لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں اور برسوں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اچھے دوستوں کی طرح... اور وہ کبھی ایک دوسرے پر میلی نگاہ بھی نہیں ڈالتے۔“

”ضرور رہتے ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ وہ ترقی یافتہ لوگ

ہیں۔ آزاد خیال ہیں۔ ان کے نزدیک جذبوں کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن میں آگ اور تیل کو قریب قریب کیسے رکھ سکتا ہوں۔ فطرت نے ہمیں جذبوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ میں ان کے سامنے بند نہیں باندھ سکتا۔ آخر چوہے اور ملی کی دوستی کتنی دیر کے لیے پائدار ہو سکتی ہے؟ تم یورپ کی مثال مت دو۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ اگر نوجوانوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی حسین و جمیل لڑکی کے ’لو‘ کے پاڑ کی طرف تھام گئی ہے تو وہ اس سے بھی پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔“

”تم خود کو بہت کمزور کردار کا آدمی ظاہر کر رہے ہو سکندر!“

”کردار تو ایک کچا دھاگہ ہے، جب تک کوئی اس کی مضبوطی نہیں آزماتا، اس کی طاقت کا بحرم قائم رہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بہر حال، میں موم کی مورتی نہیں ہوں۔ تم آزما سکتے ہو۔“ اس نے کہا۔

یہ گویا ایک چیلنج تھا، لیکن میرے لیے اس چیلنج میں کوئی کشش نہیں تھی۔ میں نہ جانے کس توقع میں اس کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اب مجھے بے زاری محسوس ہونے لگی تھی۔ ”سنو نسرین۔“ میں نے کہا۔ ”تم قدرت کی منافی کا بہترین شکار ہو، اس لیے میرا دل تمہاری طرف متوجہ ہوا۔ تم ایک بہترین فنکارہ ہو اس لیے میری آنکھیں تمہاری طرف متوجہ ہوئیں۔ بس اتنی سی بات ہے جسے تم نے افسانہ بنا دیا۔“

وہ تھملا کر میرے طرف دیکھنے لگی۔

”میں کوئی جلتے یا سٹگے والی لکڑی نہیں ہوں جسے تم لالچ کی چنگاریوں سے سلا سکو۔ میں موم کا مجسمہ بھی نہیں ہوں۔ جسے ہوس کی آگ بجھلا سکے۔ میں تو برف کی ایک ایسی ڈلی ہوں جو ہوا کے لطیف جھوکوں سے آہستہ آہستہ پگھلتی ہے اور وہ بھی ایک خاص موسم میں۔ ابھی وہ موسم نہیں آیا اور جب وہ موسم آئے تو تمہاری سانسوں میں لطیف ہوا کے جھوکوں والا تاثر باقی نہیں رہے گا۔“

”تو تم نہیں مانو گے؟“ اس نے ٹکست خوردہ لہجے میں پوچھا۔

”جب تک ہمارے اصول ایک دوسرے سے متصادم ہیں، یہ ناممکن ہے۔“

”اور وہ اصول کیا ہے؟ ذرا وضاحت تو کرو۔“

”یہی کہ میں صرف پاکٹ ماروں کی جیب تراشتا ہوں۔ خون پسینے سے کمائے ہوئے چند سو روپوں کے لیے جیب کاٹنا میری طرف کے خلاف ہے۔“

”چلو، میں اس اصول سے اتفاق کرتی ہوں اور پھوٹی موٹی وارداتوں سے تو یہ کر لیتی ہوں لیکن کھونٹے سے بندھنے والی گائے نہیں بن سکتی۔“

”یہی نہیں، تمہارے لیے اور بھی بہت سی چیزیں ناممکن ہیں لہذا یہ کتاب بند کرو اور اٹھ جاؤ۔“ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور دیوار سے اتر کر کار کی طرف چل دیا۔

”میں عورت کو صرف عورت دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ شرم و حیا کا مجسمہ اور چراغ خانہ...“

وہ کود کر دیوار سے اتری اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ ہم دیوار کے جس حصے سے

تمہارا فون بکاڑ دیں گے... اور ایسا بکاڑیں گے کہ تمہارا ماں بھی تم کو پینا نہیں بولیں گی۔
میں نے غور سے اس شخص کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں رول نما ڈنڈا ہوا تھا۔

اچانک میں نے اپنے ہاتھ پر کسی کی گرفت محسوس کی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نرسن کا ہاتھ تھا۔ وہ میرا ہاتھ سختی سے تھامے کھڑی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں گہرا خوف سمٹ آیا ہے۔ اس کی گرفت میں التجا تھی۔ وہ خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اسے سکن غنڈوں کے حوالے کر کے نہ جاؤں۔ یہ میرا احساس تھا ورنہ تو اسے اپنی زبان سے یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں اتنا کم ظرف بھی نہیں تھا کہ ایک بے بس، تنہا اور کمزور لڑکی کو درندوں کے کسی قول کے حوالے کر کے، بزدلوں کی طرح اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ جاتا۔ میں انسانیت کا پیروکار ہوں اور اس سلسلے میں میرے اصول بہت سخت ہیں۔ میں نرسن کو بے یارو مددگار چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔

”تم نے سنا نہیں، ہم نے کیا بولا؟“ ڈنڈے والا غرایا۔

”یہ لڑکی میری دوست ہے۔ میں اسے مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا“ میں نے سختی سے کہا۔

”تم شاید اس کی شکل دیکھ کر اس پر عاشق ہو اے۔“ ڈنڈا بردار بولا۔ ”تم اسے جانتا ہوتا تو اس کی دوستی کا دم بھرنے کے واسطے ہم سے نہ نکلنا۔ اس چھوکر اور اس کے بھائی نے ہمیں بے وقوف بنایا ہے۔“ وہ لفظوں کو چپا چپا کر بول رہا تھا۔ ”اب ہماری باری ہے۔ ہم اس کا پندرہ لاکھ وصول کرے گا۔ ماں قسم اس کو ابھی مل ایسٹ بھیج دے گا۔ نہیں تو اس کا بھائی دس لاکھ لائے اور اسے لے جائے۔“

”تمہیں اس کے پندرہ لاکھ مل سکتے ہیں یا پچاس لاکھ“ مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ میں نے کرفت لہجے میں کہا۔ ”یہ لڑکی اس وقت میرے ساتھ ہے۔ یہ تمہیں کسی قیمت پر نہیں مل سکتی۔ میری غیر موجودگی میں چاہے تم اسے مفت لے جانا۔“

”اوتے تم ہم کو نہیں جانتا۔“ اس نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ ”ہم قادر بخش ہے۔“ اس نے ڈنڈا دوسرے ہاتھ میں منتقل کر لیا۔ ”سنو، ایتنا بھ بچے کے بچے، تم اس وقت شوٹنگ پر نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے تھپڑ مارنے یا پھر میرا گریبان تھانسنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”میں نے اپنا ہاتھ نرسن کے ہاتھ کی گرفت سے نکال لیا تھا۔ اسی لمحے میرا ہاتھ حرکت میں آیا۔

گھونسا اس کی ناک پر پڑا، وہ ہلکا اٹھا اور اپنی تھو تھنی تمام کر اول فول بکتے لگا۔ میرا یہ گھونسا ایک طرح سے اعلان جنگ تھا۔ اچانک ہی یوں محسوس ہونے لگا جیسے کئی موٹی ایک دوسرے سے بھڑ گئے ہوں۔ میں قادر بخش پر پل پڑا تھا۔ بات چیت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خالی خولی دھمکیاں دے کر کام نکالنے والا بد معاش ہے۔ میرے گھونسنے نے اس کے اوسمان خطا کر دیے تھے۔ اور میری خواہش تھی کہ باقی غنڈوں کے ہتھے چڑھنے سے پہلے کم از کم اس کا تو بھر کس بنا ہی دوں

اترے تھے، وہ اب سنان ہو گیا تھا۔ رات خاصی بیت گئی تھی۔ باتوں میں احساس ہی نہیں رہا تھا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور چمکیلے غبار کی طرح چاندنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے ٹھک جانا پڑا۔ میں دو ہیولوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا۔

ان میں سے ایک ہیولے کے خدوخال فوراً ہی میرے ذہن میں اجاگر ہو گئے۔ وہ عالیہ تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ وہ ساحل کے ویران حصے کی طرف سے چلے آ رہے تھے۔ عالیہ کی چال میں لڑکھاہٹ سی تھی۔ نوجوان اسے ایک ہاتھ سے سنبھالے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ وہ ہمارے قریب سے گزر گئے۔ عالیہ اس نوجوان سے سرگوشی میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں یہ تو نہ سن سکا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، لیکن میں اندازہ ضرور لگا سکتا تھا کہ ان کی باتوں کا موضوع کیا ہے۔

نوجوان اس سے بے حد متاثر لگ رہا تھا، اس کا مطلب تھا کہ عالیہ اپنی تنقیم کے لیے ایک نیا مہر تیار کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ قریب سے گزرتے وقت اس نے ایک اچھتی سی نگاہ مجھ پر بھی ڈالی تھی۔ میں اس وقت اپنے اصلی طے میں تھا، لہذا وہ پہچان نہیں سکی۔

”کتنا پیارا اور خوش قسمت جوڑا ہے۔ کاش! یہ ہمیشہ اسی طرح ایک دوسرے کا سارا بنے رہیں۔“ نرسن نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

تم ان دونوں کو دعا نہیں دے رہی ہو۔ میں نے بھڑک کر سوچا۔ اس طرح تم اپنی محرومیوں کا اظہار کر رہی ہو۔ مجھے گالیاں دے رہی ہو۔ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ضرور بد قسمت ہے۔ میں سوچتا رہا لیکن میں نے اپنی سوچوں کو لفظوں کی زبان عطا نہیں کی۔

میں نے ساحل پر ادھر ادھر دیکھا۔ اب ساحل پر ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ جا چکے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک کار کھڑی تھی جس کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ میں نرسن کی کار کی طرف بڑھ گیا۔ اچانک نہ جانے کہاں سے نکل کر چھ آدمی ہمارے چاروں طرف آکھڑے ہوئے۔ انہوں نے دائرہ بنا لیا تھا اور آہستہ آہستہ یہ دائرہ سمٹ کر ہمیں اپنے اندر سمیٹ رہا تھا۔ ان خطرناک آدمیوں کو دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہ پیدا ہوا کہ نرسن کے بھائی نے مجھے سبق دینے کے لیے چند غنڈوں کی خدمات حاصل کی ہیں اور یہ لوگ اس وقت میرے مزاج ٹھکانے لگائے آئے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ نرسن مجھے یہ سوچ کر اس ویران جگہ پر لائی تھی کہ اگر میں اس کا ہم خیال بن گیا تو ٹھیک ورنہ دوسری صورت میں وہ ان غنڈوں کو میری مرمت کی اجازت دے دے گی... لیکن جب میں نے نرسن کی طرف دیکھا تو مجھے اپنا یہ خیال غلط معلوم ہونے لگا۔

وہ بے حد خوف زدہ تھی، ہشت کا زیادتی سے اس کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ میرا ہاتھ آہستہ آہستہ اپنی جیب میں رینگ گیا۔ میں نے اپنا مخصوص چاون نکال کر ہاتھ میں لیا۔ یہ سن سے ہر نہیں کیا

... مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان چھ بد معاشوں کے سرغہ نے مجھے حکم دیا کہ میں لڑکی کو چھو کر الگ ہٹ جاؤں یا پھر وہاں سے رخصت ہو جاؤں۔

”خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔“ اس نے مجھے متحیر دیکھ کر کہا۔ ”ورنہ ہم

اکہ اگر میرا کوئی ہاتھ پاؤں اس جنگ میں ٹوٹ بھی جائے تو اس کا زیادہ ملال نہ ہو۔
اچانک میں نے ایک کراہ سنی۔

میں نے پلٹ کر ایک لمبے کے لیے آواز کی جانب دیکھا۔

حیرت سے میری آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ نسرین تین آدمیوں سے الجھی ہوئی تھی۔ مجھے قادر بخش سے نیرو آزما دیکھ کر غالباً ان لوگوں نے یہ سوچا ہو گا کہ اس دوران میں نسرین کو اغوا کر لے جائیں۔ قادر بخش خود ہی آجائے گا یا اگر وہ بے ہوش ہو گیا تو اسے کسی وقت بھی واپس آکر لے جایا جاسکتا ہے... لیکن میری آنکھیں اپنی زندگی کا تیز نظر دیکھ رہی تھیں۔ پانچ آدمی نسرین کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن اسے پکڑنا تو درکنار اسے چھوئے میں بھی کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔

نسرین کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں چل رہے تھے۔ میں نے جس شخص کی کراہ سنی تھی، وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے یوں جھکا ہوا تھا جیسے قوت کی شدت نے اسے دہرا ہونے پر مجبور کر دیا ہو۔ باقی چار اب بھی بار بار نسرین پر جھپٹ رہے تھے لیکن اسے پکڑنا تو درکنار وہ اسے چھوئے میں بھی کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔

اس لڑکی کے ہاتھوں پٹے سے غالباً وہ بد معاش بھی بدحواس ہو گئے تھے، جسے وہ ترنوالہ سمجھ کر اغوا لے جانے والے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خوش فہمی میں جھلا ہو کر مار کھا گئے تھے اور اب بھی کھا رہے تھے۔

میں نے آخری ہاتھ قادر بخش کی کھوپڑی پر رسید کیا تو وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گیا۔ اب میرے پاس ہاتھ بھاڑ کر کڑے تماشا دیکھنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔
اچانک نسرین نے ایک فلائنگ لنگ لگائی۔

ٹھوکر ایک کی ناک سے ٹکراتی ہوئی دوسرے کی طرف مچی اور میں نے اس شخص کو دونوں ہاتھوں سے اپنا پہلو دبا کر پیچھے سنا۔ جس کی ناک پر ٹھوکر لگی تھی، وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسی لمحے باقی دو آدمی ایک ساتھ نسرین پر جھپٹ پڑے لیکن وہ ان دونوں کے درمیان سے کسی چٹکی چھل کی طرح پھسل کر نکل گئی اور وہ دونوں جھونک میں ایک دوسرے سے متصادم ہو گئے۔

وہ نقشے میں چور شرابیوں کی طرح ٹوکڑا کر گرے۔ پہلے ایک گرا اور دوسرا اس پر ڈھیر ہو گیا۔

”چلو... نکل چلو۔“ نسرین نے کہا اور کار کی طرف دوڑ پڑی۔

میں بھی اس کے پیچھے بھاگ اٹھا۔ اگرچہ میں دوڑنے میں خاصا تیز تھا لیکن نسرین مجھ سے پہلے کار تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے میرے پیچھے سے قتل نہ صرف کار کا دروازہ کھول لیا تھا بلکہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے اشارت بھی کر چکی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ابھی بیٹھ کر ٹھیک سے دروازہ بھی بند نہیں کر پایا تھا کہ

کار کسی وحشی درندے کی طرح اچھل کر آگے بڑھ گئی تھی۔ دھچکا لگنے سے دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔

میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔

میں نے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑکی سے اس میدانی حصے کی طرف دیکھا چند انسانی ہونے متحرک دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہی غنڈے تھے جو نسرین کو اغوا لینے آئے تھے اور اس وقت یا تو وہ ایک دوسرے کے زخموں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یا پھر خود اپنے ہی بال نوچنے میں مصروف تھے۔

”اب مجھے یقین آگیا کہ سلطان راہی قلموں میں کئی کئی آدمیوں کو کیسے بچھاڑ لیتا ہو گا۔“ میں نے کن آنکھوں سے نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کار آندھی اور طوفان کی طرح چلی جا رہی تھی۔ کلفٹن کے علاقے سے نکل آنے کے بعد اس نے رفتار قدرے کم کی اور میں نے اسے اطمینان کی ایک طویل سانس لیتے ہوئے سنا۔

”مزہ نہیں آیا سکندر صاحب!“ وہ دانت کچکا کر بولی۔ ”میرا تو خیال تھا کہ اس مقابلے میں چند ڈرامائی مناظر بھی آئیں گے اور مجھے ایک عرصے بعد ہاتھ پیروں کا زنگ اتارنے کا موقع مل جائے گا۔“

”زنگ تو خیر کافی اتر گیا ہو گا بلکہ ان میں سے بعضوں کے منہ پر بھی لگ گیا ہو گا... لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم آخر چیز کیا ہو؟ ہمیں چھپا رستم کون کہ چھپی رستم؟“

وہ ہنس پڑی۔ ”کچھ بھی کہہ لو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کسی سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو بدلنے والوں میں سے نہیں ہو۔“

”تمہارا خیال کسی حد تک درست ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے یہ پانچ لاکھ لاکھ لاکھ پکڑے اور یہ کون لوگ تھے؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”یہ بھائی جان کے چلائے ہوئے چند چکروں میں سے ایک چکر ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ اس معاملے کو راز رکھنا چاہتی ہے۔ اس لیے میں نے موضوع بدل دینا مناسب خیال کیا۔ ”ایک بات تو بتاؤ نسرین!“

وہ کن آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”جب لڑائی شروع نہیں ہوئی تھی تو میں نے تمہیں کسی سہمی ہوئی چیز یا کے روپ میں دیکھا تھا۔ بعد میں بیک وقت تم شیر کی پٹی بن گئیں۔ کیوں؟“

”اس کی دو وجوہ ہیں۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”ایک وجہ کا تعلق نفسیات سے ہے۔ دشمن کے سامنے دم خم ظاہر کیا جائے تو وہ محتاط ہو جاتا ہے۔ مجھے خوف زدہ دیکھ کر انہوں نے ترنوالہ سمجھا۔ اور بے سوچے سمجھے مجھ پر جھپٹ پڑے جس کے نتیجے میں میں ہر ایک کو پہلی کار آمد چوٹ لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے بعد انہیں سنبھالنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔“

سیکھوں گی۔ اگر تم اس کا معاوضہ چاہتے ہو تو میں معاوضہ ادا کروں گی ورنہ تم فن کے بدلے مجھ سے فنی تعلیم حاصل کر سکتے ہو۔ یقین کرو، تمہیں اس فن میں بھی مہارت ہونی چاہیے۔“

میں ہنس پڑا۔

”ذرا سے ہاتھ پاؤں چلانے آگے ہیں تو اتنا مت اتراؤ۔“ میں نے طوہرہ کہا۔ ”جیب تراشی اور جوڈو کرانے میں بہت فرق ہے۔ میں اپنی حفاظت کے لیے چاقو زنی جانتا ہوں اور میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

”تو پھر اس بات کا ایک اور طرح سے فیصلہ کر لیتے ہیں۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”وہ کیا طریقہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ اپنے دفاع میں کون بہتر ہے۔“ اس نے کہا۔

”گویا تم مجھے چیلنج کر رہی ہو۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں... اسے چیلنج مت سمجھو۔“ اس نے کار کی اندرونی جی بجھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم اسے اپنی صلاحیتوں کی آزمائش سمجھیں گے۔ میرا خیال ہے، تم اپنی چاقو زنی پر خاصے نازاں ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے کار ایک طرف گھمادی۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔ بڑی ہی عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے کبھی کسی عورت سے ہاتھ پائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ دوسرے میں اسے بیک وقت تین چار آدمیوں سے الجھتے اور انہیں سبق دیتے دیکھ چکا تھا... لیکن بات انا کی آپڑی تھی۔ اس لیے میں پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔

”یہ تم کدھر جا رہی ہو؟“ میں نے صورت حال سے وقتی طور پر نجات حاصل کرنے کے لیے پوچھا۔

”کسی ویران جگہ...“

”میرے خیال میں ہمیں اس مقابلے کو کسی دوسرے وقت پر اتھا رکھنا چاہیے۔“

”گھبراہے ہو؟“ اس نے تاؤ دلائے والے انداز میں کہا۔

”تم جانتی ہو کہ ایسا نہیں ہے۔ مجھے اور بھی کچھ کام ہیں۔ تاہم میں عنقریب تمہاری یہ خوش فہمی بھی دور کر دوں گا۔“ میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑی اور گاڑی آہستہ کرتے ہوئے بولی۔ ”چلو ٹھیک ہے پھر کبھی سہی... لیکن میں جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ جانا چاہتی ہوں۔ تاؤ تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟“

”کسی ہوٹل کا رخ کرو۔ رات کا کھانا کھاتے ہوئے میں تمہارے دانتوں کا کمال دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا ذہن فوراً ہی ایک نئے پہلو پر غور کرنے لگا تھا۔ میرے خیالات عالیہ کی طرف بھٹک گئے تھے۔ اس کے علاوہ نیکم کی ملک دشمن سرگرمیاں بھی میرے ذہن میں تھیں۔ نیکم کسی بھی لمحے مجھ زندہ درگور کر سکتی تھی لہذا مجھے اپنے تحفظ کے سلسلے میں غافل نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس لڑکی کو اعتماد میں لے لیا جائے تو کتے کی موت مرنے کی بجائے بمباری سے موت کو گلے

”اور دوسری وجہ کیا تھی؟“

”دوسری وجہ یہ تھی کہ میں تمہیں آزمانا چاہتی تھی...“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے نخر ہے کہ میرا انتخاب درست نکلا۔ وہ مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ فرار ہو گیا ہوتا... میرے دل میں تمہاری قدردانیت اور بڑھ گئی ہے۔“

”اگر فرار ہو گیا ہوتا تو کیا تم ان بد معاشوں کے ساتھ چلی جاتیں؟“

”نہیں۔“ اس کے چہرے پر یکایک سختی آگئی۔ ”میں ان بد معاشوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ

دیتی۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ لوگ مسلح تھے۔ اگر وہ کوئی ہتھیار نکال لیتے، تب کیا ہوتا؟“

”ذرا سی مشکل ضرور پیش آتی مگر میں ان سے نمٹ لیتی۔ ابھی تم مجھ سے پوری طرح واقف نہیں ہو، جس طرح تم اپنے فن میں بے مثال ہو، اس طرح میں بھی اس معاملے میں ماہر ہوں۔ مجھے جیب تراشی سکھانے والے نے سب سے پہلا سبق یہی دیا تھا کہ پاکت مار کو پٹنے میں ماہر ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس فن کا تعلق براہ راست عوام سے ہے۔ اس لیے قانون کے ہاتھوں تک پہنچنے سے پہلے ہر پاکت مار کو عوام کے ہاتھوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر پکڑا جائے والا پاکت مار عوام کے ہاتھوں سے بچ سکتا ہے یا ان ہاتھوں کو برداشت کر لیتا ہے تو قانون سے نمٹنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا... علاوہ ازیں ایک لڑکی ہونے کی حیثیت سے مجھے اس فن میں یوں بھی ماہر ہونا چاہیے کیونکہ مردوں سے اکثر پالا پڑنا رہتا ہے۔“

”یہی وجہ ہے کہ تم‘ مردوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتیں؟“ میں نے پوچھا۔

”مردوں کی اہمیت اپنی جگہ ہے اور عورتوں کی اہمیت اپنی جگہ... مجھے اس بات سے شدید نفرت ہے کہ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جائے۔ وقت پڑنے پر میں کسی بھی مرد کا دل‘ عملی طور پر دو انگلیوں سے نکال سکتی ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہاری طرح میری انگلیاں‘ جیب صاف کرتے وقت مہارت نہیں دکھا سکتیں۔“

اس نے اپنی انگشت شہادت میری طرف بڑھائی۔ میں نے اس کے مخروطی ناخن کی طرف دیکھا۔ نیل پالش کی وجہ سے وہ چمک رہا تھا کار کے اندرونی بلب کی روشنی میں نہ جانے کیوں مجھے نیل پالش پر... خون کا گمان ہونے لگا۔ میں نے بغور اس کی انگلی دیکھی۔ وہ کسی نوکیلے خنجر سے کم نہیں تھی۔

”یہ انگلی کسی سوئے کی طرح انسان کے سینے میں اتر سکتی ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ جب تک اسے صورت حال کا احساس ہوتا ہے‘ اس وقت تک موت اسے اپنے جیزوں میں سمجھ چکی ہوتی ہے اور میں وہاں سے بہت دور جا چکی ہوتی ہوں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”بہر حال‘ میں تم سے فنی تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن میں اسے مفت میں نہیں

”انسان ہونے کے ناطے تم نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ سانپ بھی اپنے ہم نسل کو نہیں ڈستا۔ جب کہ ہم انسان ہو کر انسانوں کو ذبح بھی کر دیتے ہیں۔ دوسری بات ملک دشمنی کی ہے۔ میں اسے کسی طرح بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ ملک جیسا بھی ہے، میرا گھر ہے اور میں اپنے گھر میں کتنا ہی حقیر کیوں نہ سہی لیکن میں اسے خوشیوں کا گوارہ دیکھنے کے لیے سب کچھ کر گزروں گا۔“

اس کی آنکھوں میں بڑی عجیب سا تاثر نمودار ہوا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں میں ایک نئی روشنی ایک نئی چمک پیدا ہو رہی ہو۔

”ہم نے غلامی کا ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔ میں نے غلامی کا وہ دور تو نہیں دیکھا، لیکن مجھے اس کی اذیت کا احساس ہے۔ یقین کرو، تم غلامی کی زندگی میں اپنی مرضی کی ایک سانس بھی نہیں لے سکتیں۔ خود ہماری زمین ہی ہم پر تنگ ہو جائے گی۔ کتابیں غلط نہیں کہتیں۔ یہ زمین واقعی ہماری ماں ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں، ہر قوم میں، زمین کے لیے ماں کا تصور پایا جاتا ہے۔ کیا جاپان، کیا روس، ہر قوم ایک انچ کے ٹکڑے کے لیے اپنے لاکھوں بیٹوں کو جنگ میں جھونک دیتی ہے۔“

”میں تمہاری ان باتوں کا صرف ایک ہی مقصد سمجھ سکی ہوں کہ مجھے اپنی انگلیوں کو دیکھ بھال کر استعمال کرنا چاہیے اور صرف انہی لوگوں پر استعمال کرنا چاہیے جو خود دوسروں کو شکار کرتے ہیں لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم ملکی سیاست کے سلسلے میں مجھے کیوں بوجھ کر رہے ہو؟“

”تم ہمیں کی رہنے والی ہو۔ تمہاری جڑیں اسی زمین میں ہیں۔ تم یورپ چلی جاؤ یا امریکہ... وہ لوگ تمہیں گرین کارڈ ضرور دے دیں گے لیکن تم وہاں کی فرسٹ کلاس شہری کبھی نہیں بن سکتیں۔“

”ہمیں تو زندگی گزارنی ہے۔ بس اچھی سے اچھی۔ بہتر سے بہتر۔ ان باتوں سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ میں جو کچھ بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔ وہ بولی۔“

”میں سامنے کی نہیں، اندر کی بات کر رہا ہوں۔ اندر سے تم کیا چیز ہو؟“

”میں یہ کیسے بتا سکتی ہوں۔ نہ تو میں نے کبھی اندر جھانکا ہے اور نہ ہی کسی کو اس کی اجازت دے سکتی ہوں۔“

”اب تم سنجیدگی سے شرارت پر اتر آئی ہو لگتا ہے اندر سے بہت دکھی ہو اور اس دکھ نے تمہیں بے حس کر دیا ہے۔ آئیں کریم کھاؤ گی؟“

”وہ ہنس پڑی۔“ ”آئیں کریم ہی کیوں؟“

”اس لیے کہ میں تمہیں اس بے ہوشی کے تھکنے کا منظر دکھانا چاہتا ہوں۔“

میں نے آئیں کریم منگوائی۔ وہ خاموشی سے کبھی میری طرف اور کبھی آئیں کریم کی طرف دیکھنے لگی۔ ”آئیں کریم... اندر کی آگ کو فرحت دیتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال، پارٹنر بننے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لیں۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی...“

وہ آئیں کریم سے اٹھتی ہوئی ٹھنڈی بھاپ کی طرف دیکھتی رہی، جس نے آہستہ آہستہ

لگتا چاہیے۔

گاڑی میزوپول کے سامنے پہنچ گئی تھی۔

اس نے کار ایک طرف پار کی اور نیچے اتر آئی۔ اس وقت وہ بے حد پروقار لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک جرائم پیشہ لڑکی ہے۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس لڑکی کو اعتماد میں لے لیا جائے تو یہ نیلم کے خلاف میرا بہترین ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے۔ ہم نے انٹرنیشنل ماحول میں خاموشی سے رات کا کھانا کھایا۔ پھر میں نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔ ”نرسن بیگم! کیا یہ ممکن ہے کہ ہم صاف صاف کچھ باتیں کر لیں؟“

”کیوں، کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”دراصل میں سوچ رہا تھا کہ تمہارے ساتھ پارٹنر شپ کری لوں۔“

”بہت خوب۔“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”تو پھر تردد کیا ہے؟“

”کچھ نہیں... لیکن میں اپنا ذہن صاف کر لینا چاہتا ہوں۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”دیکھو

نرسن! میں صرف ایک شرط پر تمہارے ساتھ پارٹنر شپ کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد میری کوئی شرط نہیں ہوگی اگر تمہیں میری وہ شرط منظور ہو تو میں ایک چھت کے نیچے تو کیا، ایک قبر میں بھی تمہارے ساتھ رہنے کو تیار ہوں۔“ میں خاموش ہو کر اس کی آنکھیں میں انہی باتوں کا رد عمل تلاش کرنے لگا۔

”حکم تو کرو دوست۔ مجھے تمہاری تمام شرطیں منظور ہیں۔ سوائے شادی کے۔“ یہ کہہ کر

اس نے نرمی سے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”شرط یہ ہے کہ تمہیں آئندہ یہ کام میرے منصوبوں کے تحت کرنا ہوگا۔ تم اپنے طور پر کوئی کام نہیں کرو گی۔ میں ملک دشمن اور انسان دشمن لوگوں سے نفرت کرتا ہوں... یقین کرو میں نے آج تک کوئی گھر نہیں اجاڑا، کسی کا دل نہیں دکھایا۔“

نہ جانے میرے لیے میں کیا کیا تھا کہ وہ متاثر نظر آنے لگی۔ یوں بھی کلفٹن پر ہونے والے جھگڑے میں میرے ٹھوس رویے کے بعد سے وہ کافی بدل گئی تھی۔ ان بد محاشوں سے وہ بہ آسانی نمٹ سکتی تھی اور ان سے اسی نے منشا بھی تھا لیکن اس سے پہلے وہ مجھے آزمانا چاہتی تھی اور میں اس آزمائش پر پورا اترتا تھا۔ وہ میرے غلوں سے متاثر ہو گئی تھی لہذا اب میری باتیں رانگلاں نہیں جاری تھیں۔ ہر تیر شائے پر بیٹھ رہا تھا۔

”میں کوئی ملایا سماجی ٹھیکے دار نہیں ہوں۔“ میں نے کہا ”میں اس موضوع پر کوئی تقریر بھی نہیں کر سکتا۔ بس سیدھے سادے لفظوں میں بتا سکتا ہوں کہ میرا کسی سیاسی یا سماجی تنظیم سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ میں مسلمان ہوں اور میرے دل میں انسانیت کی بہت قدر ہے۔ میں جیب تراش ضرور ہوں لیکن میری اگھیاں صرف انہی جیبوں میں رہتی ہیں جن میں دوسروں سے لوٹی ہوئی رقم بھری ہوتی ہے۔“

وہ میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں نرمی تھی۔

گئی ہوتی۔" اس نے غلامی گھورتے ہوئے کہا۔
 "اور یہ جو تمہارے بھائی جان ہیں کیا ان کا ٹوکرا بھی تمہاری ٹوکری کے قریب ہی پایا گیا تھا
 یا دونوں ایک ہی ٹوکری میں تھے؟" میں نے پوچھا۔
 "وہ میرا بھائی نہیں ہے، میرا دوست ہے۔"
 "ویسا ہی دوست جیسا کہ میں ہوں اور تم انہی شرائط پر اس کے ساتھ رہتی ہو، جن کے
 مطابق میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟"

"ہاں، وہ ایک ٹھیک دوست ہے۔"
 "لیکن تم جب میرے ساتھ رہو گی تو مجھے صرف جان کنا، بھائی جان ہرگز نہ کنا ورنہ گنا
 گھونٹ دوں گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ "تم بڑے ہی بے رحم آدمی ہو، بڑے سفاک تبصرے کرنے کے عادی ہو۔"
 اس کے لہجے میں شکایت تھی۔
 "ہاں تو سن بلوغت کو پہنچنے ہی تم نے اپنے والدین کو تلاش کرنا شروع کر دیا ہو گا جو شاید
 تمہیں ابھی تک نہیں ملے۔"
 "مجھے ان کی تلاش تو ہے لیکن میں نہیں جانتی کہ کیسے تلاش کروں۔ اس لیے میں نے ابھی
 اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔"

"ایک اشتہار دے دیں... تم شدہ ٹوکری... جو گرجے کے سامنے..."
 "پلیز سکندر۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے چپ کرا دیا۔ "کیا تمہیں مجھ سے کوئی ہور دی
 نہیں۔ میں تمہیں اپنا سمجھ کر دکھ بیان کر رہی ہوں اور تم ہو کہ ادھر ادھر کی ہانک کر الٹا میرے
 زخموں پر نمک پاشی کر رہے ہو۔"
 "میں تمہارے زخموں پر شکر پاشی کرنے کے لیے بھی تیار ہوں لیکن تم چہرے اور آنکھوں
 سے زندہ نظر آتی رہو۔ کچھ دیر قبل میں نے تمہیں دکھ کی زیادتی سے اندر ہی اندر مرتے دیکھا
 تھا۔"

"آہ... ہاں... تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے اپنی یہ کمائی زندگی میں پہلی بار کسی کے سامنے بیان
 کی ہے، اس لیے میرا دل بھر آیا ہو گا۔"
 "بھائی جان بھی بے خبر ہیں؟"

"ہاں ہمیں ایک دوسرے کی نئی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
 میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر اپنی کمائی سنانے لگی۔ گھر کے
 ماحول سے ٹالاں ہو کر اس نے اپنے ایک کلاس فیلو کی دھڑکنوں میں سامنے کی کوشش کی لیکن جلدی
 ہی وہ کلاس فیلو اس سے اس رفاقت کی قیمت طلب کرنے لگا۔ تب اسے پہلی بار مردوں سے نفرت کا
 احساس ہوا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال جم گیا کہ اس کی ماں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی حادثہ پیش آیا
 ہو گا۔ اگر وہ کسی کی قانونی بیٹی ہوتی تو اسے ٹوکری میں ڈال کر یوں فٹ پاتھ پر کیوں پھینک دیا جاتا۔

پکھلنا شروع کر دیا تھا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ میں اسے ایک احساس دلانا چاہتا تھا۔ آکس کریم کے
 پکھلنے کے منظر نے اس کے زخموں پر بھی ہوئی آنسوؤں کی برف کو آہستہ آہستہ پکھلانا شروع کر دیا۔
 میں سوچ رہا تھا کہ یہ منجھ آکس کریم جب معمولی درجہ حرارت میں پکھل کر، سیال بن کر بہہ سکتی
 ہے تو یہ لڑکی میرے غلوں کی سچائی کی حدت کے سامنے کب تک برف کا توہ بنی رہ سکے گی۔ وہ
 سوچوں میں ڈوبی رہی۔ اپنے آپ سے الجھتی رہی، خود ہی سلجھنے کے چکر میں مزید الجھتی رہی۔ کافی
 دیر بعد اس نے کپ میں سیال بن جانے والی آکس کریم میں سچ چلاتے ہوئے نگاہ اٹھا کر میری طرف
 دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خفیف سی نمی تیر رہی تھی۔ اس کے سینے میں رکھا ہوا برف کا توہ پکھل
 رہا تھا اور اس کا پانی آنکھوں تک پہنچ گیا تھا۔

"شاید تمہیں میری باتوں پر یقین نہ آئے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "لیکن یہ
 حقیقت ہے، میں نہیں جانتی، میں کون ہوں، کس کی بیٹی ہوں!"
 "تم جانتی ہو کہ تم کون ہو۔" میں نے کہا۔ "اور تم ہی نہیں، ساری دنیا جانتی ہے کہ تم
 کون ہو... تم ایک حسین لڑکی ہو، نرسین اور جہاں تک کسی کی بیٹی ہونے کا تعلق ہے تو یقیناً تم کسی کی
 بیٹی ہو۔ تم کسی درخت کی شاخ پر نہیں بیٹھی تھیں۔" میں اس کی بات سے اس کا دکھ سمجھ گیا تھا اس
 لیے میں نے بات مذاق میں ڈال دی۔

"... کسی شاخ پر نہیں بلکہ شاخوں سے بنی ہوئی ایک ٹوکری میں جنم لیا تھا، میں نے۔" وہ
 کربک لہجے میں بولی۔ "اور یہ ٹوکری کراچی میں مینسفیلڈ اسٹریٹ کے قریب واقع گرجا گھر کے
 سامنے فٹ پاتھ پر پائی گئی تھی۔"
 "اوہ، غیر معمولی پیدائش۔"

"مذاق مت کرو، سکندر۔ میں اس سلسلے میں بے حد حساس ہوں۔" اس نے شکایت آمیز
 لہجے میں کہا۔

"میں تو تمہیں ہر معاملے میں حساس دیکھتا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔
 "گرجا گھر کے پادری نے مجھے ایک بے اولاد عیسائی جوڑے کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے
 میری پرورش کی۔ میں مسلمان ہوں یا عیسائی مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ اس لیے میرا فی الحال کوئی
 مذہب بھی نہیں ہے۔ آکھ کھولنے کے بعد میں نے بڑی اذیت ناک زندگی گزار دی۔ عیسائی جوڑے
 نے مجھ پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ میرا باپ مجھے اتنا مارتا بیٹتا تھا کہ کئی کئی دن میرے جسم پر نیل
 پڑے رہتے تھے۔ لیکن اس جوڑے نے مجھ پر ایک مہربانی ضرور کی انہوں نے مجھے ایک بہترین
 اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا۔ جہاں میں نے صرف ایک ہی سبق سیکھا کہ دنیا میں زندہ
 رہنے کے لیے صرف دوست ہی سب کچھ ہیں۔" اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ "پاپا کی مار کھاتے
 کھاتے میری کھال، جو توں کے چڑے جیسی سخت ہو گئی تھی اور جسمانی اذیت میرے لیے ایک بے
 معنی سی چیز ہو کر رہ گئی تھی... تاہم میں اس عیسائی جوڑے کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس
 حقیقت سے بھی روشناس کرایا کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں، ورنہ شاید میں انہیں تک محدود ہو کر رہ

ہے۔ مجھے بیس اتار دو۔“

”تمہارے گھر کے سامنے کیوں نہ اتار دوں؟“

”اس لیے کہ وہاں تک کار تو کیا اس کا خالی وہیل بھی نہیں پہنچ سکتا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”بہت تنگ گلی ہے۔“

اس نے گاڑی روک دی۔ میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”ایک آخری بات... اس ایک ہفتے میں اگر تمہیں کوئی شریف آدمی مل جائے تو بسلا پھسلا کر اس سے شادی ضرور کر لینا۔“

”وہ کیوں؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے۔“

میں اترنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”سنو۔“ وہ نغمہ بار آواز میں بولی۔ ”کیا تم شریف آدمی نہیں ہو؟“

”بالکل شریف ہوں۔ صد فی صد۔ کیوں؟“

”تو پھر شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ”اب میں کوئی اور شریف آدمی کہاں ڈھونڈتی پھر دوں گی۔“

میں نے نرمی سے ہاتھ چھڑایا اور کار سے اتر گیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد میں نے ایک طلائی انگوٹھی اس کی طرف بڑھادی۔ ”لو، یہ انگوٹھی پن لو۔“

”ارے یہ...“ وہ بری طرح اچھل پڑی۔ ”... یہ تمہارے پاس کہاں سے آگئی؟“

”مگر کی بات ہے، کیوں بتانے لگا۔“

”کمال ہے۔“ وہ زیر لب بولی اور گاڑی آگے بڑھادی۔

میں سڑک کے کنارے کھڑا اس کی گاڑی کو ٹریفک کے سیلاب میں جتنے دیکھتا رہا، حتیٰ کہ بے شمار گاڑیوں میں چلتی ہوئی اس کی کار میرے لیے ناقابل شناخت ہو گئی۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

تھکن سے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا لیکن بستر پر دراز ہونے کے باوجود مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نرسن کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ آج میں نے اس کے اندر کی عورت کو بری طرح جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا اندازہ تو مجھے آئندہ ایک ہفتے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ تاہم مجھے توقع تھی کہ وہ جلد ہی میرے لیے ایک کار آمد ہستی بن جائے گی۔

رفتہ رفتہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

غنودگی کے ان لمحوں میں ایک اور انسانی پیکر لاشعور سے نکل کر شعور کے پردے پر لہرانے لگا۔ یہ عالیہ تھی جسے میں نے کلشن میں ایک شخص کے ساتھ گھومتے دیکھا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگلے روز اس سے ملاقات کے لیے ضرور جاؤں گا۔ پھر نہ جانے کب پھر آکھ لگ گئی۔

اس کے بعد مردوں سے نفرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ نفرت اس وقت دو چند ہو گئی جب اس کے کلاس فیلو نے دوستی کی قیمت وصول کرنے کے سلسلے میں زبردستی کرنے کی کوشش کی۔ یہیں سے ذاتی دفاع کے لیے جوڈو سیکھنے کا خیال اس کے دل میں آیا۔ اس کی عیسائی ماں مرگئی پھر عیسائی باپ بھی بیٹھ کے لیے چلا گیا۔ اور وہ دنیا میں تنہا رہ گئی۔ ان کی مختصر جائداد نرسن کے حصے میں آئی، جسے فروخت کر کے وہ فرانس چل گئی جہاں اس کی ایک سیٹلی پہلے سے رہ رہی تھی۔ فرانس میں پہلے تو وہ ادھر ادھر ماری ماری پھرتی رہی کیونکہ اس کی سیٹلی ناگزیر حالات کے تحت اس کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئی تھی۔

”اور اس ریڈی میڈ بھائی جان سے کب ملاقات ہوئی تھی؟“ میں نے سوال کیا۔ ”کیا وہ تمہیں فرانس میں ملا تھا؟“

”ہاں، اس کی زندگی کے حالات بھی تقریباً ایسے ہی ہیں جیسے کہ میرے ہیں۔ ہماری ملاقات بس اچانک ہی ہو گئی تھی، ایک کیفے میں... اس نے میرا بہت ساٹھ دیا ہے، سکندر! اگر وہ اس وقت مجھے سہارا نہ دیتا تو معلوم نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔“

”کیا واقعی آج اس کی طبیعت خراب ہے؟“

”ہاں۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔“

”کیا تم نے اسے بتایا تھا کہ مجھ سے ملنے جا رہی ہو؟“

”ہاں... لیکن وہ آج کل جن پکروں میں ہے اسے انہی سے فرصت نہیں، اس لیے اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ویسے وہ تم سے بے حد نالاں ہے... میں کوشش کروں گی کہ اسے ہموار کر لوں اور تم دونوں ایک دوسرے سے الجھنے سے بچ جاؤ۔“

بل ادا کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہم باہر آکر کار میں بیٹھ گئے۔

”کہاں چلو گے؟“ اس نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے لیاقت آباد چھوڑ دینا۔ یہاں سے ٹیکسی والا اتنے پیسے مانگے گا جتنا کراچی سے سکھر کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔“

وہ ہنس پڑی اور گاڑی آگے بڑھادی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ بے حد پرسکون ہو گئی ہے۔ میں بھی مطمئن تھا۔ اگرچہ اس کی شخصیت کے بارے میں کئی سوالات میرے ذہن میں چکر رہے تھے۔ لیکن میں انہیں نظر انداز کر رہا تھا۔ ان سوالوں کی تحقیقی مستقبل کی ملاقاتوں میں آسانی سے بھائی جاسکتی تھی۔

”ایک ہفتے بعد انگلش بوٹ ہاؤس کے سامنے، ٹھیک چار بجے...“ اس نے کہا۔ ”اس دوران میں، میں بعض اہم امور نمٹاؤں گی اور قیام کے لیے کسی جگہ کا انتخاب بھی عمل میں آجائے گا۔“

گاڑی تین مہی کے پل سے گزر چکی تھی۔ ڈاکھانے کے آسٹاپ پر میں نے کہا۔ ”بس ٹھیک

پہلے ہی سے کوئی بہانہ کر رکھا تھا، لہذا اسے آتے وقت کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

وہ مجھے لے کر طارق روڈ پر واقع اپنی ایک سیٹلی کے ہاں پہنچی۔ غالباً "نیلیم نے اس سے وہیں ملنے کا وقت طے کر رکھا تھا لیکن وہاں جاکر معلوم ہوا کہ نیلیم کچھ ہی دیر قبل ایک فون کال آنے پر ہالی ڈے ان کی طرف جا چکی ہے۔ اس سے زیادہ عالیہ کی سیٹلی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ گویا وہ بھی عالیہ کی طرح کسی خاص اہمیت کی مالک نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ ہمیں ہالی ڈے ان چنانچا ہے۔ عالیہ سے اس بات کا اظہار کیا تو اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

"نہیں..." وہ بولی۔ "اگر اس کی اجازت ہوتی تو وہ ہمارے لیے پیغام ضرور چھوڑ جاتی۔"

"ہوں..." مجھے تو اب بھوک لگنے لگی ہے۔" میں نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ کر لیا۔

"چلو، ہمیں کسی چائے ریسٹوراں میں کھالیتے ہیں۔" عالیہ نے جلدی سے کہا۔

ہم ایک چینی ریسٹوراں میں جا بیٹھے۔ ویٹر شاید عالیہ کو پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے عجیب ناقابل فہم سے انداز میں سر کو جنبش دی جسے میں پڑ پڑتی کال اظہار تو ہرگز نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ کوئی مخصوص اشارہ تھا۔ میرے شبہ سے اس بات سے اور بھی تقویت ملی کہ عالیہ نے انگوٹھے کو ایک خاص انداز میں حرکت دے کر اس اشارے کا جواب دیا تھا۔ میں عالیہ کو اس دلدل سے نکالنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کی جڑیں کتنی گہرائی تک پہنچ چکی ہیں۔ کسی قد آور درخت کو اکھاڑنا یوں بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ ویسے میرا خیال تھا کہ اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ورنہ نیلیم اسے یوں نظر انداز کر کے ہرگز نہ جاتی۔

ویٹر نے کھانے لگا دیا۔ ہم خاموشی سے کھاتے رہے۔

اس بار ویٹر نے اس کی طرف سے بے نیازی برقی تھی جب کہ عالیہ بھی کچھ بے پروا نظر آ رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں روشنی کی ایک کرن سی پھوٹ پڑی۔ میں ان دونوں کے اشاروں کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ عالیہ اور ویٹر دونوں کا تعلق تنظیم سے تھا۔ عالیہ مختلف نوجوانوں کے ساتھ وہاں آتی رہتی ہوگی۔ انہوں نے آپس میں جو اشارے کیے تھے، ان سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عالیہ نے اسے میرے بارے میں کچھ سمجھایا ہے۔

کھانے کے بعد اس نے کہا۔ "ایک منٹ بیٹھو، میں ذرا گھر فون کر لوں۔"

وہ چلی گئی تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آخر یہ معصوم سی لڑکی کس جہال میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ کون سا لالچ ہے جس نے اسے ان گناہ کن تنظیم سے وابستہ کر رکھا ہے۔ میں یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ محض نظریاتی چکر میں وہ ان لوگوں کے ہاتھ میں کھیل رہی ہے۔ اگر یہ بات نہیں تھی تو پھر یقیناً ان لوگوں کے برین واش کر دیے جاتے ہوں گے۔

ابھی تک مجھے عالیہ سے کوئی کارآمد بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سوچا شاید آج کا دن یونہی بے مقصد گھومتے پھرتے گزر جائے گا۔ اچانک ہوا کے جھونکے سے بیپر نیپکن اڑ کر میز سے نیچے گر گیا۔ میں نے اسے اٹھا کر واپس رکھنا چاہا تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

نیپکن کی دوسری جانب بال پوائنٹ سے عالیہ کے لیے ایک پیغام لکھا ہوا تھا۔

اس پیغام میں کسی نے اسے فون پر بات کرنے کو کہا تھا۔ گویا وہ گھر کی بجائے پیغام بھیجنے والی ہستی کو فون کرنے گئی تھی... اور وہ ہستی میری دانست میں نیلیم ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے دوسرا نیپکن اٹھایا تو اس کی دوسری طرف بھی کچھ تحریر تھا۔ یہ کسی ٹکٹ کے بارے میں تھا۔

رات بھر میں عجیب سے خواب دیکھتا رہا۔

صبح گیارہ بجے آنکھ کھلی تو طبیعت خاصی بو جھل تھی۔ بستر چھوڑنے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن عالیہ کے ہاں جانا ضروری تھا... لیکن اس کے لیے وہ مخصوص حلیہ اختیار کرنا ضروری تھا، جس میں عالیہ سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

دوپہر کے بعد میں عالیہ کے ہاں پہنچا تو اسی مخصوص حلیے میں تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی چمک اٹھی۔ "ہیلو محسن صاحب! آپ نے بہت انتظار کروایا۔"

وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھی۔ اس کی ماں گھر میں نہیں تھی اور بھابی یا درہی خانے میں دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

"چائے پیئیں گے یا کھانا چلے گا؟"

"ایک کپ چائے سے زیادہ کسی چیز کی گنجائش نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے ناشتہ کافی تاخیر سے کیا تھا۔"

وہ یا درہی خانے میں گئی اور بھابی سے چائے بنانے کا کہہ آئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم چائے پیتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ہی وہ اپنے اصل موضوع پر آگئی۔

"محسن صاحب! میں نے اپنی سیٹلی سے آپ کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ آپ کے جذبات سے باخبر ہو کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ وہ آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔ ہمیں آپ جیسے مخلص ساتھیوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں اسی کے ہاں جا رہی ہوں۔ پسند کریں تو آپ بھی چلے۔ وہ سیٹلی کراچی میں ہماری لیڈر بھی ہے۔"

"کیا وہ کوئی بوڑھی عورت ہے؟" میں نے براہ راست نجی قسم کا سوال کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں۔ جوان اور حسین... ایسی کہ آپ اسے دیکھتے رہ جائیں گے۔ اس کا نام نیلیم ہے اور نیلیم کی طرح جگمگاتی ہوئی شخصیت کی مالک ہے۔"

مجھے خدشہ تھا کہ وہ نیلیم ہی کا نام لے گی، اس لیے میں اس کا نام سن کر اچھل پڑنے سے محفوظ رہا۔ عالیہ میری طرف متوجہ تھی۔ اگر میں یہ نام سن کر چونک پڑتا تو وہ یقیناً سمجھ جاتی کہ میں نیلیم کو پہلے سے جانتا ہوں۔

"بہت خوب" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم نے تو میرا اشتیاق بڑھا دیا ہے۔ میں اس سے ضرور ملوں گا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ "تو پھر چلے۔"

"ارے، تم کھانا نہیں کھا کر جاؤ گی۔" میں نے کہا "مجھے تو بھوک دوک نہیں، تم کیوں بلا وجہ کا فائدہ کرنا چاہتی ہو۔"

"کھانا تو کہیں بھی کھایا جاسکتا ہے۔" وہ مسرور لہجے میں بولی۔ "آئیے چلیں..." میں اس کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔ اس نے اپنی بھابی سے باہر جانے کے سلسلے میں شاید

لے کر سکھانے والے استاد سے تم اس ہنر کو سالوں میں بھی نہیں سیکھ سکتے؟“ اس نے مشورہ دیا۔
میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ گویا میں سرین سے کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر سمجھوتہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا تھا۔
رات دس بجے میں نے ایک کال آفس سے، عالیہ سے حاصل کیے ہوئے نمبر پر فون کیا تو چوتھی تھی پر
دوسری جانب سے ریسیور اٹھایا گیا۔ لیکن دوسری طرف سے شاید ہم سے کوڈورڈ کی توقع کی جارہی تھی۔
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے صرف مدعا بیان کیا تو وہ دوسری طرف سے حیرانی کا اظہار کیا گیا۔
لیکن نیلم اور عالیہ کا نام سننے کے بعد شاید وہ مطمئن ہو گیا۔
”ٹھیک ہے تم جس وقت بھی آ جاؤ، ٹکٹ تیار ملیں گے۔ اگر چاہو تو اسی وقت آ جاؤ۔ صبح کے لیے کراچی
ایکسپریس کے ٹکٹ بھی موجود ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ہم پہنچ رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کہاں پر آئیں؟“
”تمہیں یہ ٹکٹ ہالی ڈے کے ویٹر نمبر 37 سے ملیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
میں جی کے ساتھ ہالی ڈے ان کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوٹل سے ہمیں یہ بھی پتہ چلا کر پھٹنے کی صبح کو ایک کاروں کا قافلہ جا رہا ہے۔ عالیہ اس قافلے کے ساتھ
ہو گی۔ اگر ہم چاہیں تو کار کے ذریعے چلے جائیں گے۔ لیکن میں نے ایک خاص مصلحت کے تحت ریل سے جانے
کو ترجیح دی۔ خیال تھا کہ ہم ہوٹل سے ٹکٹ لے کر لوٹ آئیں گے، لیکن جس ویٹر نے ہمیں ٹکٹ فراہم کیے
اس نے ہمارے لیے ایک ڈبل بیڈ روم کھول دیا۔

”پکڑے اور سلمان لے جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی جناب۔ آپ یہ سمجھیں کہ پکنک پر جا رہے ہیں
اور پکنک کے تمام لوازمات وہاں پہلے سے موجود ہیں۔ باقی ہدایات میڈم نیلم خود دیں گی۔ اگر وہ صبح ہوٹل نہ آئیں
تو پھر نواب شاہ سے آپ کو ہدایات مل جائیں گی۔“

ویٹر نے مزید کچھ سمجھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی ہم نے کچھ پوچھنے کا فطرہ مول لیا۔
ہم ہوٹل میں رک گئے۔

ہوٹل میں صبح ناشتے کے بعد میری اور جی کی تصویریں لی گئیں اور چند منٹ میں ہمارے کارڈ بن کر آ گئے،
پھر ہم کراچی ایکسپریس سے نواب شاہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

ہم نواب شاہ کے اسٹیشن پر اتارے تو ہم سمیت بارہ افراد وہاں اترے تھے۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے اپنا اپنا سلمان
اٹھا کر چلے گئے۔

”کیا خیال ہے۔ ایک کپ چائے پی جائے؟“

”مجھے بھی چائے کی طلب محسوس ہو رہی ہے۔“ جی بڑبڑایا۔ ”پلٹ کر مت دیکھنا باس۔ ہماری نگرانی ہو
رہی ہے۔ پس قدم دور ایک مشکوک آدمی موجود ہے۔“

کچھ ایسا ہی منظر میرے سامنے بھی تھا۔ ”تم بھی پلٹ کر دیکھنے کی حماقت نہ کرنا۔“

”آپ کو عقابوں سے کوئی دلچسپی ہے؟“ ”ایک عجب سے آواز سنائی دی۔“

”کیوں نہیں۔“ میں نے پلٹ کر جواب دیا۔ ”ہم خود عقاب ہیں۔“

اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

میں نے ٹینک اسی طرح رکھ دیے جیسے عالیہ کے جانے سے پہلے رکھے ہوئے تھے۔
عالیہ آئی، اس نے بل منگوا یا پھر ہونٹوں کے کنارے پونچھے ہوئے۔ دونوں ٹینک اپنے پرس میں رکھ
لیے۔ اس دوران میں عالیہ کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔ انداز سرسری تھا جیسے ٹینک پرس میں رکھنا کوئی
خاص بات نہ ہو۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے نظریں چار کرتے ہوئے جھجک رہی ہو۔
مجھے اندازہ تھا کہ وہ اس وقت جذباتی کشمکش کا شکار ہے۔ شاید وہ میری طرف سے بدگمانی کا شکار ہو رہی
تھی۔ اگر وہ میری احسان مند نہ ہوتی تو اب تک خطرناک ناگن کاروبار دھار چکی ہوتی۔
”کیا بات ہے عالیہ؟“ میں نے اسے چھیڑا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوش نہیں ہو۔ اگر میری ذات سے
تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو پلینز مجھے معاف کر دو۔“

”نہیں نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں سکندر صاحب شاید میری سوچ ہی غلط تھی۔ آپ واقعی ایک بہت
اچھے آدمی ہیں۔“ وہ آنکھوں کی نمی چھپا کر مسکرا دی۔ ”میں نے فون پر بات کر لی ہے۔ آپ کو دوڑ نامی شہر میں
پہنچنا ہو گا۔“ اس نے ایک رقع میری طرف بڑھا دیا۔ ”تفصیل اس میں موجود ہے۔“

میں نے رقعہ دیکھا۔ اس پر ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے ایک جگہ کا پتہ اور فون نمبر درج تھا۔ میں وہاں
سے ٹکٹ حاصل کر سکتا تھا لہذا اب نیلم سے ملنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ نمبر یقیناً اہم تھا اور شاید کراچی
کی تمام سرگرمیوں کا مرکز بھی ہو۔
ہم ریستوراں سے باہر آ گئے۔

وہ مجھ سے رخصت ہو گئی اور میں خیام سینما سے ٹیکسی لے کر سیدہ حاجی کے پاس پہنچا۔ وہ میری صورت
دیکھتے ہی تاڑ گیا کہ آج میرے پاس بہت ساری خبریں ہیں۔ جی میری ہی راہ دیکھ رہا تھا۔ مگر میرے چپختے ہی منہ پھلا
کر بیٹھ گیا۔

”میں اس وقت کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اگر دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہو تو پہلے دودھ پتی
کے ساتھ بسکٹ منگوا لو۔“ اس نے کہا۔

”حالاں کہ اس وقت میں تمہارا اصرار نہیں ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا اور جیب سے دس کانٹ نکال کر اس کی طرف
بڑھا دیا۔

وہ مسکراتا ہوا... چائے کے لیے قریبی ہوٹل والے سے کہنے چلا گیا۔
تھوڑی دیر بعد چائے لیے ہوئے وہ پوری طرح میری طرف متوجہ تھا۔ میں نے اسے صورت حال سے
آگاہ کر دیا۔

”یقیناً یہ ایک بڑی کامیابی ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔

”ایک اور محاذ پر بھی مجھے خاصی کامیابی ہوئی ہے۔“ میں نے کہا اور پھر نظر کے بارے میں اسے سب
کچھ بتا دیا۔ میں نے اس کے ہاتھ بیروں کے کمال کا تذکرہ کیا تو جی کو اس پر کوئی حیرت نہ ہوئی۔

”کیا تم اس کا کارنامہ سن کر حیران نہیں ہوئے؟“ ”اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ تم نے جی وانگ کی
کوئی فلم نہیں دیکھی؟ بروکلی کا نام نہیں سنا؟ وہ تو ایک ہی لات مار کر دیوار توڑ دیتے ہیں۔ لیکن سکندر اگر سرین
کچھ جانتی ہے تو اس سے سیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی مفت کا اشتہار بہت جلدی سکھا دیتا ہے، جب کہ فیس

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ اس نے باری باری ہم دونوں سے ہاتھ ملایا۔ ”میرا نام دریا خان ہے“ صاحب اسٹیشن سے باہر چھپیں کھڑی ہیں۔ ابن ائیس۔ تین چھ نوے سفر کریں۔ بہادر خان ایک ہوشیار ڈرائیور ہے۔“

باہر نکل کر میں نے نگاہ دوڑائی اور اس خاص جیب کے قریب پہنچ گیا۔
”ہاں بھی بہادر خان۔“ میں نے اونگھتے ہوئے ڈرائیور کی پیٹھ پر پھینکی دے کر اسے بیدار کیا۔ ”ہم نے تمہاری بہت تعریف سنی ہے۔“

اپنا نام سن کر وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ سلام کے لیے اٹھ گیا۔ ”آپ کی مہربانی ہے صاحب ہم کس قابل ہیں۔“ وہ انکسار سے کام لیتے ہوئے بولا۔
”دریا خان نے تمہاری کافی تعریف کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ مجھے لے ڈوبے گا۔“ وہ جھینپے جھینپے انداز میں ہنس کر بولا۔ ”بہر حال جی“ آپ کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔“

ہم جیب میں بیٹھ گئے تو اس نے انجن اشارت کیا اور ایک طرف چل پڑا۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کتنا سفر کرنا ہے اور ہم کس سمت میں جا رہے ہیں۔ اگر میں بہادر خان سے کوئی سوال کرتا تو وہ شک میں پڑ سکتا تھا۔ اس کی پھولی ہوئی قمیص بتا رہی تھی کہ کوئی خطرناک آٹومٹک بھاری اس نے شلوار کے نیچے میں اڑسا ہوا ہے۔ آدمی کو باتوں میں لگانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ براہ راست اس کے لواحقین کے بارے میں گفتگو چھیڑیں۔
بہادر خان یوں جلدی ہی کھل گیا۔

نواب شاہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ جیب اچھلتی ہوئی انجان راستے پر بڑھی چلی جا رہی تھی۔ اتنی دیر کی گفتگو میں بہادر خان نے کام کی صرف دو باتیں بتائی تھیں۔ پہلی یہ کہ تنظیم کے نئے ممبروں کو لال حویلی میں ٹھہرایا جائے گا جو جنگل میں واقع ہے جب کہ پرانے کارکن کسی اور جگہ قیام کریں گے۔ دوسری یہ کہ عقاب کا کوڑو رڈ ہر جگہ استعمال ہوتا ہے۔

بہادر خان کی ڈیوٹی جنگل کی حدود شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتی تھی۔ وہ ہمیں ایک جگہ اتار کر واپس چلا گیا۔ اب وہاں سے ہمیں پیدل چلنا تھا اس وقت ہمک جب تک کہ کوئی ہمیں دیکھ نہ لیتا۔

ابھی ہم سوچ رہے تھے کہ کس طرف سفر شروع کیا جائے کہ اچانک درختوں کی آڑ سے دو قوی پیکل آدمی برآمد ہوئے۔ ان کے جسموں پر فاریسٹ گارڈ کی وردیاں تھیں اور ہاتھوں میں رائفلیں دبی ہوئی تھیں جن کا رخ ہمارے سینوں کی جانب تھا۔ ان کے چروں کی سفاکی بتا رہی تھی کہ ہماری کوئی بھی غلط حرکت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

”کیا تم نہیں جانتے کہ یہاں شکار کھیلنا منع ہے۔“ ان میں سے ایک بولا۔

”ہم عقاب ہیں اور عقابوں کے لیے شکار کی ممانعت نہیں ہوتی۔“ جی نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیے۔ ”اپنے شناختی کارڈ دکھاؤ۔“ دوسرے آدمی نے کہا۔

ہم نے اپنے کارڈ نکال کر ان کے حوالے کر دیے۔ ان میں سے ایک چند قدم دور ہٹ کر وادی ٹاکی پر کسی سے بات کرنے لگا۔ بات کر کے اس نے سٹی بجائی تو ایک شخص دو گھوڑے لے کر نمودار ہوا۔

”یہ گھوڑے اپنے راستے سے خوب واقف ہیں۔ لگا میں ڈھیلی چھوڑ دیں گے تو یہ آپ کو لال کو ٹھی پنچا دیں گے۔“

دس منٹ تک گھوڑے سرپٹ دوڑتے رہے۔ میں اور جی دونوں خاموش تھے۔ اس وقت ہم میدانی علاقے سے گزر رہے تھے۔ راستے میں کئی جگہوں پر ہم نے بورڈ لگے ہوئے دیکھے جن پر واضح الفاظ میں تحریر تھا۔ ”یہاں شکار کھیلنا منع ہے۔“

گھٹا جنگل شروع ہوتے ہی گھوڑے خود آہستہ ہو گئے تھے۔
سورج غروب ہو چکا تھا اور لمحہ لمحہ بڑھتا ہوا اندھیرا ماحول کو خوف ناک بنا رہا تھا۔ لیکن وقفے وقفے سے مترنم تھمتے سنائی دیتے اور معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں منگل کا سماں ہے۔
گھوڑے ایک جگہ پہنچ کر خود ہی رک گئے۔

ہم ابھی گھوڑوں سے اتارے نہیں تھے کہ اچانک ہی ایک جانب سے تین حسین و جمیل لڑکیاں نمودار ہوئیں اور ہمارے قریب آگئیں۔

”اگر آرام کرنا چاہیں تو حویلی میں چلے جائیں اور تھکان محسوس نہیں کر رہے تو کوئی ساتھی منتخب کر کے چاندنی رات کا لطف اٹھائیں۔“ ان میں سے ایک لڑکی اپنے موتیوں جیسے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔
”ہم فی الوقت صرف آرام کریں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے کہا پھر پلٹ کر اپنی ایک ساتھی سے بولی۔ ”نادرہ مہمانوں کو حویلی پنچا آؤ۔“

نادرہ مسکراتی ہوئی آگے آگے چل دی۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس نے جی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
”آپ کو سانپوں سے ڈر تو نہیں لگتا؟“

”میں صرف انسان نماسنپوں سے ڈرتا ہوں۔“ جی نے شوخی سے جواب دیا۔ ”ویسے تمہیں ڈسٹ کی عادت تو نہیں؟“

”زیادہ نہیں، کبھی کبھی۔“ وہ بولی اور پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔
جلدی ہی ہم حویلی کے سامنے پہنچ گئے۔

”حویلی میں چلے جائیں۔ اندر کوئی نہ کوئی میزبان لڑکی آپ کو کمرے تک پہنچا دے گی۔“ یہ کہہ کر وہ واپس چل دی۔

”سنو۔“ جی نے اسے پکارا۔

وہ رک گئی اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں سوچ رہا تھا کہ جب بھی میرا جینے سے جی بھر گیا تو تمہیں ایک موقع ضرور دوں گا۔“

”شکریہ۔ یاد رکھیے گا۔ میں ففٹی دن ہوں۔“

”یہ نمبر ہے یا تمہاری عمر۔“ میں نے مداخلت کی۔

”سیدھی طرف سے نمبر انٹی طرف سے عمر۔“ وہ یہ کہہ کر ہوا کے لطیف جھونکے کی طرح چلی گئی۔

”بک رہی ہے نا ہاں۔“ جی نے سرگوشی کی۔ ”پندرہ سال کی تو ہر گز نہیں ہو سکتی۔“

دس نمبر یا ہاں کے بیوں میں بھی شمار ہوتا تھا۔
لڑکی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نری تھی۔ میں نے ان نگاہوں میں ماحول سے اجنبیت بھی محسوس کی۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہنے لگا کہ یہ لڑکی اپنی خوشی سے یہاں نہیں آئی۔ وہ آنکھوں کی زبان سمجھنے میں ماہر لگتی تھی۔ میرے نظریں پہچان گئی تو اس نے سر جھکا لیا۔
”کیا آپ دونوں ایک ہی کمرے میں رہیں گے؟“ اس نے نظریں اٹھا کر پوچھا۔
”اگر آپ کو کوئی اعتراض ہے تو میں ہاتھ روم میں سو جاؤں گا۔“ جی جلدی سے بولا۔
وہ ہنس پڑی۔

اس نے فریج کھول کر خوش ذائقہ مشروب کے دو گلاس ہماری طرف بڑھا دیے۔
”ہم کل سے مسلسل سفر میں ہیں۔“ میں نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے فی الحال تو آرام کرنا چاہتے ہیں، بوقت ضرورت تم جب چاہو، ہم سے رابطہ قائم کر سکتی ہو۔“ میں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ میری جستجو کا مفہوم پانگئی۔

اس نے بستر پر کھڑے ہو کر فائوس میں چھپا ہوا مائیکروفون آف کر دیا۔
”تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ ہمیں مائیکروفون کی تلاش تھی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے یہاں آئے صرف چند ماہ ہوئے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”لیکن میں بہت کچھ محض چھٹی حس کے سارے سمجھ لیتی ہوں۔ دیے مائیکروفون آف کرنے کی ہمیں اجازت نہیں۔“

”تو پھر تم نے اسے آف کر کے اچھا نہیں کیا۔“

”میں کہہ دوں گی کہ تم لوگوں کی طرف سے مطمئن ہو گئی تھی۔ بلکہ تم لوگ پہلے سے میرے شناسا ہو۔“
”اوہ!...“ میرے ہونٹ سکو گئے۔

وہ مسکراتی رہی۔

”اس صرانی کی وجہ نہیں بتاؤ گی؟“

”دل دکھانے والی باتیں مت کرو۔ میرا خیال ہے تم سب سمجھتے ہو۔“ وہ آرزو ہو گئی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ، پھر ملاقات ہو گی۔“ میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔

جی ہاتھ روم میں چلا گیا، لڑکی باہر چلی گئی۔

وہ رات ہم نے نہایت سکون سے گزاری۔

صبح کو ڈبل سیون آئی۔ اس نے ہمیں ناشتہ کرایا۔ جی ٹپنے کے ارادے سے باہر نکل گیا۔ ناشتے کے بعد ڈبل سیون نے ہمیں پن کیے ہوئے چند کافزات دیے۔

میں نے گہری توجہ سے ان کا مطالعہ کیا۔

یہ تحریر ایک ایسا زہر تھا جو پڑھنے والے کے ذہن میں انجیکٹ ہو سکتا تھا۔ میرا جسم ٹھنڈے ٹھنڈے پینے

”ان چکروں میں نہ پڑو۔“ میں نے نصیحت کی۔ ”ویسے لڑکی جب تک چاہے پندرہ سال کی رہ سکتی ہے۔ کوئی اس کے دعوے کو جھٹلا نہیں سکتا۔“

”تجربہ بول رہا ہے شاید۔“

”نہیں، مشاہدہ۔“ میں نے کہا اور حویلی کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

لال حویلی شاید اس عمارت کا نام ہی تھا ورنہ اندر داخل ہوتے ہی احساس ہوا کہ وہ ایک قلعہ ہے۔ دروازے کے فوراً بعد ایک کشادہ ڈیوڑھی تھی پھر ایک وسیع و عریض صحن اور اس کے چاروں طرف کمرے ہی کمرے تھے۔

ایک میزبان لڑکی نے ہمیں ایک کمرے تک پہنچا دیا۔ کمرے کی آرائش دیکھ کر ہم دونوں ہی دنگ رہ گئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ہالی وڈ کے کسی فلمی سیٹ پر پہنچ گئے ہوں۔

”واہ... لطف آگیا۔ کسی جنگل میں ایسی حویلی کے بارے میں صرف افسانے ہی پڑھے تھے۔“ جی بولا۔

میں نے ہنسنوں پر انگلی رکھ کر اسے بلند آواز میں بولنے سے منع کر دیا اور خود متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا مجھے کسی مائیکروفون کی تلاش تھی۔

کمرے کے وسط میں ایک گول بیڈ تھا جو یقیناً اپنے مرکز پر گھومتا بھی ہو گا۔ کمرے میں ضرورت کی تقریباً ہر شے موجود تھی۔ دیوار پر ایک تصویر آویزاں تھی جس میں ایک بڑا سا عقاب اڑتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے جھرجھری سی آگئی۔

میں کوئی تربیت یافتہ کمانڈر نہیں تھا۔ محض تجسس اور وطن پرستی کا جذبہ مجھے یہاں لایا تھا۔ ورنہ شاید میں قارون کا خزانہ ملنے کی توقع میں بھی یہاں نہ آتا۔ ہر طرف حسین و جمیل لڑکیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں آکر واپس جانے کا راستہ ملنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو گا۔

نور ای ایک لڑکی اندر آگئی۔

”معاف کیجئے! مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ میں اس کمرے کی میزبان ہوں۔“

”کیا نام ہے تمہارا؟“ میں نے نری سے پوچھا۔

”نام...“ وہ حیرانی سے بولی۔ ”یہاں کسی کا کوئی نام نہیں۔ سب کا کوئی نمبر ہے۔ میں ڈبل سیون ہوں۔“

”زیرو ویریو سیون کی رشتے دار معلوم ہوتی ہو۔“

”نہیں... وہ لفٹی فور کا بھائی ہے۔“

”اوہ!...“ میری کھوپڑی گھوم گئی۔ میں نے تو اپنی دانست میں جیمز بانڈ کا حوالہ دیا تھا لیکن معلوم ہوا کہ وہاں اس نمبر کا بھی کوئی فرد موجود ہے۔

”آپ کو حیرت ہوئی جناب؟“

”نہیں۔“ میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”پور نمبر تین کس کا رشتے دار ہے؟“

”شش۔“ وہ یکایک سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے بیڈ پر آویزاں لائٹ کی طرف دیکھا۔ ”یہاں کا تذکرہ اس انداز میں مت کیجئے۔“

”سوری... نیانا ہوں نا۔“ میں نے کہا اور ہنس پڑا۔ ویسے جسم کے ہر مسام سے پینہ نہ چوٹ پڑا تھا گویا کوئی

”گجرات کی...“ اس نے اواس ہو کر کہا۔ پھر یوں کھو گئی جیسے اپنے شرک کی کچی کی گلیوں میں اس کا ذہن بھٹکنے لگا ہو۔ ”میرے والدین بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان پر میری تین جوان بہنوں کا بوجھ ہے۔ میرا کوئی بھائی نہیں۔ میں نے اس خیال سے نرسنگ کا کورس کیا تھا کہ ملازمت کر کے پہلے اپنی بہنوں کی شادی کروں گی پھر اپنے بارے میں سوچوں گی۔ نرسنگ ایک مقدس پیشہ ہے۔ میں دل و جان سے اسے اپنانا چاہتی تھی۔ میں نے تین سال تک گجرات کے سروس اسپتال میں نوکری کی۔ ایک روز میری ایک سہیلی نرس نے اخبار میں ملل ایسٹ میں نرسوں کی ضرورت کا ایک اشتہار دیکھا۔ تنخواہ اتنی پر فریب تھی کہ میں سوچ بوجھ کی بیٹائی سے محروم ہو گئی۔ مجھے اپنے آپ پر مکمل اعتماد تھا۔ میں نے درخواست بذریعہ ڈاک بھجوا دی۔ کئی عزیروں نے میرے اس طرح تنہا ملک سے باہر جانے کو مناسب خیال نہ کرتے ہوئے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں تو ان دنوں ہر وقت قصور میں ریال ہی ریال گنتے لگی تھی۔ والدین یہ سوچ کر آمادہ ہو گئے تھے کہ اس طرح وہ جلد سے جلد باقی لڑکیوں کے ہاتھ پہلے کر کے سکھی جو جائیں گے۔ بہر حال میں یہاں پہنچ گئی۔ کیسے؟ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں ہر ہفتے اپنی خیریت کا ایک خط حویلی کے لیٹر بکس میں ڈال دیتی ہوں۔ جو دعی سے ہوتا ہوا میرے والدین تک پہنچ جاتا ہے۔ ان کے خطوط بھی مجھے باقاعدگی سے ملتے رہتے ہیں۔ ہر ماہ میری تنخواہ کا ڈرافٹ میرے والدین کو مل جاتا ہے اس لیے وہ مطمئن ہیں اور میں یوں مطمئن ہو کر یہ زہریلی رسی ہوں کہ اس طرح کم از کم میرے والدین کے ادھورے خوابوں کو ان کی مرضی کی تعبیر تو مل رہی ہے۔ وہ لوگ بہت خوش ہیں۔ دو بہنوں کی شادی ہو چکی ہے۔ تیسری کی شادی بھی عنقریب ہونے والی ہے۔ میں نے یہ سودا اس لیے منظور کر لیا کہ ان لوگوں پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ایک سال بعد مجھے یہاں سے واپس بھیج دیا جائے گا۔“

”اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو؟“

”تب پھر دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو میں ان پر اعتماد کرنے پر مجبور ہوں۔ کیسی قید ہے، کیسی بے بسی ہے۔ میں یہاں سے فرار ہو سکتی ہوں، لیکن ہونا نہیں چاہتی۔“

”میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔“

”میں نہیں جاسکتی۔“

”وہ کیوں؟“

”میں تمہیں اس کی وجہ بتا چکی ہوں۔“ اس کی جھیل جیسی آنکھیں اب نیلی بدلیوں کی طرح دھل کر شفاف ہو گئی تھیں۔

”تو پھر یہ بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”دعا...“ وہ بڑے کرب سے مسکرائی۔

”میں نے اثبات میں سر ہلایا۔“

”اور یہ بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں۔“

”دعا...“

”کیسی دعا؟“ وہ چونک پڑی

”جو اس رستے ہوئے نامور کو درست کرنے میں مدد دے سکے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تنظیم ہماری قوم کے

سے بھٹکا رہا اور میں اس مسودے کو پڑھتا رہا، پھر میں نے ایک طویل سانس لے کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیسا ہے، مضمون؟“ اس نے پوچھا اور اوپر فانوس کی طرف دیکھا، جس میں لگے ہوئے مائیکروفون کو اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی آن کر دیا تھا۔

”شائد...“ میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ ”کاش یہ پمفلٹ پورے ملک میں تقسیم ہو سکتا۔“

”فی الحال...“ یہ ممکن نہیں۔ ”وہ بولی۔ ”لیکن وہ وقت زیادہ دور نہیں، جب تمام لوگ ہمارے ہم خیال بن جائیں گے۔ تب ایک بہت بڑا انقلاب آئے گا۔“

”انقلاب زندہ باد۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا اور اسے اشارہ کیا کہ مائیکروفون بند کر دے۔ اس نے مائیکروفون بند کر دیا۔

”ڈبل سیون۔“ میں نے لمبے لمبے کو بے حد متاثر بناتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے لیے سوچتا رہا ہوں۔“

”شش۔“ ایسی باتیں کرنے کی اجازت نہیں۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔“

”میں جانتا ہوں گزرا، لیکن جن باتوں کی اجازت ہے ان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”تو پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں یہاں رہنے پر مجبور ہوں۔“

”مجبوری نہیں بتاؤ گی...؟“

”مجبور کا کوئی بھی نام رکھ لو، وہ مجبور ہی رہے گی۔“ وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ”بس یہ سمجھ لو کہ میرے سارے خاندان کی زندگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ میں یہاں بطور میزبان کام کرتی رہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ تمہیں کون سی مجبوری یہاں لے آئی ہے۔ اور تمہاری آنکھیں بہت بولتی ہیں، انہیں خاموش رہنا سکھاؤ۔“

”ان کی زبان ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔“ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ”مجھے بھی ایک مجبوری یہاں کھینچ لائی ہے۔ تم پر تمہارے خاندان کی زندگی کا انحصار ہے جب کہ میں اپنے ملک کی بقا اور اپنی قوم کی سر بلندی کے لیے جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں۔ میں ہر اس طوفان سے ٹکرا جانے کا عزم رکھتا ہوں جو میرے ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے۔ یہ بھی ایک ملک دشمن تنظیم ہے اور میں اسے نیست و نابود کرنے کے ارادے سے بے خطر اس آگ میں کود پڑا ہوں۔ بس یہ ہے میری کہانی۔“

وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر خورہ انداز میں بولی۔ ”اوه کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے۔“

”احتمالہ بات ہے۔ پولیس والے مجھ جیسے ہوتے ہیں۔“

”میرا مطلب تھا خفیہ پولیس؟“

”نہیں میرا ان کے کسی بھی فرقے سے تعلق نہیں ہے۔“

وہ ہنس پڑی۔

”کہاں کی رہنے والی ہو؟“

ہونے لگی۔ انسان یوں بھی تو اپنے چروں پر دوسرے چرے سجائے رکھتا ہے۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ لیکن کوئی ان پر بھی نقاب ڈال لے تو وحشت ہونی ہی چاہیے۔

بعض لوگ درندوں کے روپ میں بھی تھے۔ میں نے ایک لڑکی دیکھی جس نے چھتے کی کھال جیسا لباس پہن رکھا تھا اور اپنے چرے پر چھتے کا خول چڑھا کر وہ اوجھڑا ہوا چمڑا بن کر رہی تھی۔

کمرے میں موسیقی کا طوفان آیا ہوا تھا۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ طبلے کی تھاپ بڑی سی وحشیانہ لگتی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے تاریک براعظم کے کسی وحشی قبیلے کی کسی تقریب میں شرکت کر رہا ہوں۔

ڈبل سیون میری پارٹنر تھی۔ ہم دیر تک رقص کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جسم کا جوڑو ڈانچا کر کے لگا۔ رات کے نہ جانے کس پہریہ ہنگامہ ختم ہوا تب جا کر کہیں سکون محسوس ہوا۔

رقص کے دوران بھی جی کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اگر وہ نظر آتا تب بھی میں اسے پہچان نہیں سکتا تھا کیونکہ ظاہر ہے وہ بھی کسی نہ کسی ہروپ میں ہوتا۔ لیکن وہ کم از کم مجھ سے رابطہ تو قائم کر ہی سکتا تھا کیونکہ میں نے اپنے چرے پر نصف نقاب ڈالی تھی۔ میں چونکہ پہلے ہی سے میک اپ میں تھا اس لیے مجھے اپنے موجودہ چہرے کے سلسلے میں کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔

ڈبل سیون مجھے میرے کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی تو میں بستر پر دراز ہو گیا اور جی کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کرتے کرتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ جی رات بھر نہیں آیا۔ اس کا اندازہ مجھے صبح کے وقت ہوا۔ اس کا وہ بستر بے شکن رہا تھا۔ جسے میں نے خاص طور سے اس کے لیے اپنے ہی کمرے میں لگوا لیا تھا۔ میں جی کے بارے میں رات ہی کو تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا لیکن اب تو اندیشے میرے لیے جان لیوا ثابت ہونے لگے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا تھا کہ وہ کسی مصیبت میں نہ پڑ گیا ہو۔ کہیں وہ بے نقاب نہ ہو۔ کہیں اس سے کوئی منافقت نہ سرزد ہو گئی ہو۔

ناشتے کا وقت ہو گیا۔ میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ڈبل سیون ابھی تک نہ آئی تھی۔ دوسرے لاکھ خیالی پیکر سہی لیکن وہ میرے حواس پر چھا گئے اور مجھے بری طرح خوفزدہ کرنے لگے۔ میں کمرے میں بیٹھنے لگا۔

دروازے پر آہٹ سن کر میں نے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ آنے والی ڈبل سیون ہو گی، میرا دل بیٹھنے لگا۔ دروازے میں کھڑی ہستی ڈبل سیون نہیں تھی۔ جسمانی ساخت سے وہ ڈبل ٹائن نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے تھی۔

ٹرے میرے رکھ کر وہ بے تکلفی سے بیٹھ گئی اور جب بولی تو میرے ذہن میں زور زور سے خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس ناگوار خطرے کا احساس میرے لاشعور تک میں گونجنے لگا، کیونکہ صورت سے نہیں تو آواز سے میں اسے شاید لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ نیلم تھی۔

اس نے میک اپ کر رکھا تھا۔

لیے ایک ماسور ہی تو ہے۔

”میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”تم مجھے معلومات فراہم کر سکتی ہو جس سے استفادہ کر کے میں اس کی جڑیں کاٹ سکتا ہوں۔“

”میں زیادہ نہیں جانتی۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”دو چار ماہ بعد یہاں اسی طرح نوجوانوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ راگ رنگ کی محفلیں جیتی ہیں اور اس قسم کے پمفلٹ تقسیم ہوتے رہتے ہیں جن کا مطالعہ کر کے ضائع کر دیا جاتا ہے۔“

”تم نے کچھ بیڑوں کے بارے میں بات کی تھی۔“

”ان میں سے کوئی کبھی کبھار ہی یہاں آتا ہے۔“

”کیا یہاں تمہاری طرح اور مجبور لڑکیاں بھی موجود ہیں؟ کیا وہ بھی ہم سے تعاون کر سکتی ہیں؟“

”یہاں بیشتر لڑکیاں ایسی ہی ہیں لیکن سب اپنے اپنے خول میں بند ہیں۔ ڈرتی ہوں کہ کہیں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔“

اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی۔

وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر مائیکروفون بند کر دیا۔ اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

دروازہ کھلا اور ایک لڑکی دکھائی دی جس نے اس سے کہا کہ رقص شروع ہونے والا ہے۔ اس لیے فوراً اس کمرے میں پہنچا جائے۔

ڈبل سیون نے اشارہ کیا۔

میں اس کے ساتھ چل دیا۔

مجھے حیرت تھی کہ جی کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اسے کمرے سے گئے بہت دیر ہو چکی تھی اور اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا۔ میرے دل میں دوسرے جنم لینے لگے کہ کہیں وہ کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہو گیا ہو۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے اسے باہر جانے ہی کیوں دیا۔

لڑکی مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔

”کاسٹیوم ہال ہے۔ اس لیے کوئی سا بھی لباس منتخب کر لیجئے۔“ وہ بولی۔ ”آپ اپنی مرضی سے کوئی سا بھی روپ دھار سکتے ہیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس سے پہلے مجھے کبھی اس قسم کے رقص میں شامل ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ البتہ انگریزی ناولوں میں یا کمائیوں میں اس رقص کے بارے میں پڑھا ضرور تھا جس میں لوگ اپنی اصلیت چھپانے کے لیے عجیب اور مضحکہ خیز لباس پہنتے ہیں یا روپ دھار لیتے ہیں۔

میں اس قسم کے رقص میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن ڈبل سیون کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس رقص میں شرکت بے حد ضروری ہے لہذا میں نے اپنے لیے ایک لباس منتخب کیا اور اسے زیب تن کر کے رقص کے مخصوص کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کمرے میں موجود بہت سے لوگوں کے چروں پر نقابیں نظر آ رہی تھیں۔ مجھے اس ماحول سے وحشت

معمول پر آگئیں اور ان میں تیرے ہوئے شک و شبہ کے سائے ڈوب کر غائب ہو گئے۔
وہ مجھ سے مختلف سوال کرتی رہی۔ میں اسے کبھی مذاق اور کبھی سنجیدگی سے جواب دیتا رہا مجھے معلوم نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے مطمئن کرنے میں کامیاب رہا تھا یا نہیں لیکن وہ مجھ سے متاثر ضرور ہو گئی تھی۔
”رات رقص میں تم واحد تھی تھے جس نے آدمی نقاب پسینہ تھی۔“ وہ بولی ”کوئی خاص وجہ؟“
”اب میں اتنا ہی صورت بھی نہیں ہوں۔“

وہ میری طرف دیکھتی رہی پھر یوں اثبات میں سر ہلایا جیسے میرے جواب سے مطمئن ہو گئی ہو۔
”ڈبل سیون کیسی رہی؟“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔
”اس بات کا اندازہ تمہیں آدمی نقاب پہننے سے ہو جانا چاہیے تھا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں دیکھ کر میں یہی سمجھا تھا کہ میرا آدمی نقاب والا حربہ کامیاب رہا ہے اور تم مجھ سے متاثر ہو کر کبھی چلی آئی ہو۔“

”تم حسن پرست معلوم ہوتے ہو۔“ اس نے سر سے پاؤں تک مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔
”بشرطیکہ حسن میری سرپرستی قبول کرے۔“ میں جھک کر کورنش بجالایا۔
وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور دیر تک ہنستی رہی۔ اس کی ہنسی بڑی ہی سرلی، بڑی ہی ریلی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میرے ذہن کے کسی حساس ترین گوشے میں بیٹھی گدگدا رہی ہو۔
”عالیہ نے واقعی کمال کا آدمی منتخب کیا ہے۔“ اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ”خود کو محفوظ رکھنا ممکن ہے کسی وقت کسی ایسی ہستی کی نگاہ انتخاب تم پر پڑ جائے جو تمہارا آئیڈیل ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے بولتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”لیکن میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”آئیڈیل اگر بوڑھا ہو جائے تو بلخی کھانی اس کی قدر و قیمت گھٹا دیتی ہے۔“

وہ ایک بار پھر کھل کر ہنس پڑی۔

میں اس کے حسن سے مسحور تھا۔ وہ میری دیکھی بھالی لڑکی تھی۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا لیکن اس وقت اسے دھکار دیا تھا کیونکہ وہ مجھے یاکیک ہی کریمہ نظر آنے لگی تھی پھر میں نے اس پر چادر ڈال کر اسے کسی اچھی بچی کی طرح سو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہی لڑکی ایک نئے روپ میں میرے دل کی دھڑکنیں تیز کر رہی تھی۔ تاہم اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا کہ وہ درحقیقت ایک حسین ناگن ہے جو موقع ملنے ہی مجھے ڈس سکتی ہے۔ میں اس کا سر کچل ڈالنا چاہتا تھا لیکن ابھی شاید قدرت کو اس کی زندگی کے کچھ اور شب و روز منظور تھے۔

”میرا ایک ساتھی بھی کراچی سے میرے ساتھ آیا تھا؟“ میں نے استفسار کیا۔

”اوہ... وہ... کیا نام ہے؟“ اس کا؟“

”جی...“ میں نے جواب دیا۔

”وہ بالائی منزل کے ایک کمرے میں ہے۔“

”ڈبل سیون دوسری جگہ مصروف ہے۔“ وہ اک اداسے بولی۔ ”اس لیے آپ کی خدمت میں‘ میں حاضر ہوں۔“

”اوہ‘ کوئی بات نہیں۔“ میں نے لہجہ بدل کر جواب دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی مجھے میری آواز سے پہچان لے میں سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ گہری توجہ سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں نیلم ہوں۔“ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں ساکت بیٹھا رہا جیسے یہ نام میرے لیے کوئی معنی نہ رکھتا ہو۔ میری آنکھوں یا میرے انداز سے کوئی رد عمل ظاہر نہ ہونے پر وہ غالباً ”ماپوس ہو گئی تھی۔“

”عالیہ نے آپ کا تذکرہ کیا تھا۔“ اس نے قدرے نرم آواز میں دوسرا تیر پھینکا۔

”ڈبل سیون نے بتایا تھا کہ یہاں نام استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔
”اس نے ٹھیک کہا تھا۔“

”پھر...“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”کچھ لوگ اس پابندی سے مستثنیٰ بھی ہیں۔“

”اور تم ان میں سے ایک ہو؟“

”ہاں...“ وہ بولی اور مسکرا دی۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم ایک محتاط آدمی ہو۔“

”تو جوانوں کو ہمیشہ محتاط ہی رہنا چاہیے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس طرح بڑھاپا خیریت سے گزر جاتا ہے۔“

”فلسفہ...“ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

میں بھی ہنسنے لگا۔

ہم ناشتہ کرنے لگے۔ میرا ذہن نیلم کی آمد، ڈبل سیون اور جی کی کم شدگی اور ناقابل فہم صورت حال میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ کراچی میں ہماری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ عالیہ سے ملے شدہ وقت پر مجھے ایک ہنگامی صورت حال کے لیے کہیں جانا پڑا تھا۔“

”میں یہ سمجھا تھا کہ تم نے شاید مجھ سے ملنا پسند نہیں کیا۔“ میں نے اسے الجھانے کی کوشش کی۔

”کراچی میں کیا کرتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”انگلیوں کا کمال دکھاتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے پوچھا۔

”ایک دفتر میں ٹائپسٹ ہوں۔“

”اوہ...“ اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ اب وہ مجھے مزید توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ انگلیوں کا

کمال دکھانے والی بات نے اس کے ذہن میں میری یاد تازہ کر دی ہوگی۔ میرے چہرے پر براہی بے داغ میک اپ تھا۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ پہچاننے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال درست نکلا۔ جلد ہی اس کی آنکھیں

”کیوں؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔
 ”اس لیے کہ بیٹ بھر کر رقص کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی انسان رقص سے لطف اندوز نہ ہو رہا ہو بلکہ ملک ٹیک کی مشین چل رہی ہو۔“
 ”ایک ٹائپسٹ کی حیثیت سے تمہارا ذوق بہت اعلیٰ ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ ”کیا تم واقعی محض ایک ٹائپسٹ ہو؟“
 ”اگر میں کوئی مشکوک ہستی ہوں تو اس وقت یہاں کیوں موجود ہوں۔“ میرا لہجہ یکایک سخت ہو گیا۔
 ”اوہ... تم تو برامان گئے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔“ وہ جلدی سے مسکرا دی۔
 ”سنو... کیا نام ہے، تمہارا... آں... نیلم۔“ میں نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ”تم لوگوں کا یہ اجتماع مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ اس سے قیض پرستی ظاہر ہوتی ہے۔ جب کہ ہمیں ٹھوس کاموں میں وقت صرف کرنا چاہیے۔“
 ”میں تمہارے جذبے کی قدر کرتی ہوں۔“ اس نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”میں محسوس کر چکی ہوں کہ تم کا زکوہیت دینے والے آدمی ہو، تفریح میں وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے... لیکن بعض معاملات میں ہم بھی مجبور ہیں۔“

”دوسروں کے ہاتھوں۔“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”پھر ہم میں اور کھلونوں میں کیا فرق ہے؟“

”ہمارے پاس وسائل کی کمی ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”یہ وسائل ہمیں دوسروں سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔“

”مجھے اس سے فی الحال تو اختلاف ہے۔ ایک کے ہاتھوں سے نکل دوسرے کے ہاتھوں میں جانے سے فائدہ؟ رہے تو کھلونے کے کھلونے ہی؟“

”کچھ دن اور صبر کر لو۔ پھر تم شاید میرے ہم خیال بن جاؤ گے۔“ اس نے جواب دیا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔
 ”میرے جسم میں ایک برقی لہری دوڑ گئی۔ اس کے لمس سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ناگن چھو کر گزر گئی ہو۔ میرے ذہن میں ماضی کے کئی مناظر یکے بعد دیگرے گردش کرتے چلے گئے۔“

”آؤ چلیں۔ باتوں میں بہت وقت صرف ہو گیا۔ اب ہمیں رقص کے کمرے میں ہی جانا پڑے گا۔“ اس نے گھڑی کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

جس وسیع کمرے کو بطور ہال روم استعمال کیا جا رہا تھا۔ وہاں وہی وحشیانہ رقص جاری تھا۔ آج بھی لوگ کاسٹیوم میں تھے۔ میں نے آدمی نقاب سے چہرے کا نچلا حصہ چھپایا۔ نہ جانے کیوں نیلم نے بھی میری تقلید میں اپنے آدھے چہرے پر نقاب ڈال لی تھی۔

ڈرم کی آواز پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گرم گرم دلدل کھول رہی ہو۔ اس کمرے میں بغاوت کا ناواپک رہا تھا۔ ایک ایسا آتش فشاں تھا جو اندر ہی اندر کھول رہا تھا اور کسی بھی لمحے پھٹ سکتا تھا۔

اچانک رقص کرنے والوں میں ایک شرارہ سا لپکتا نظر آیا۔ میں توجہ سے اس طرف دیکھنے لگا... لیکن وہ

”تب تو ٹھیک ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میں سمجھا تھا شاید رسی تڑا کر بھاگ گیا ہے۔“
 ”ہماری رسیاں اتنی کمزوری نہیں ہیں۔“ وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ ”میں نے رقص کے دوران تمہاری آدمی نقاب کا مطلب سمجھ لیا تھا۔“

”گویا میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا؟“

وہ خاموش رہی۔

”تم نے جواب نہیں دیا؟“

وہ چند لمحوں تک عجیب نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”تجسس کے دریا میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میرا جواب تمہیں ہاتھ پاؤں ڈالنے پر مجبور کر دے گا اور مجھے یہ بات پسند نہیں۔“
 ”کیا تمہارا جواب نفی میں ہے؟“

”یہی تو تجسس ہے۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔ ”میں خود بھی اسی تجسس میں مبتلا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تبسم کی بجلیاں بکھیرتی چلی گئی۔

میں دیر تک میز کے قریب کھڑا کھلے دروازے کی طرف دیکھتا رہا جہاں سے دائیں جانب گھومنے کے بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ جی کے سلسلے میں یہ سن کر کہ وہ بالائی منزل کے ایک کمرے میں موجود ہے مجھے بڑی حد تک اطمینان ہو گیا تھا۔ بات بھی کچھ سمجھ میں آگئی تھی کہ اسے خاص طور سے الجھا کر مجھ سے دور کیا گیا ہے تاکہ ہمیں الگ الگ پرکھا جاسکے۔ جی ایک ذہین نوجوان تھا اس لیے مجھے توقع تھی کہ وہ بھی اپنے بارے میں نٹلنے والے کو مطمئن کرنے میں کامیاب رہا ہو گا۔

ناشتے کے بعد ایک سرکلر گیا۔

میں نے بیڈ پر دراز ہو کر اسے پڑھا۔

تحریر تھی یا انگارے... میری نس نس میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ اتنی نفرت، اتنی بغاوت، اتنا زہر... میں کانپ کر رہ گیا۔ اگر میرے دل میں وطن کی جی محبت نہ ہوتی تو شاید میں متاثر ہو گیا ہوتا... تحریر بظاہر تو عکراؤں کے خلاف تھی، لیکن اس کی آڑ میں وطن کی جڑیں کلنے کی جو تدبیر چھپی ہوئی تھی میں اسے نظر انداز نہ سکا۔ عکراں تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں، وطن ان کی طرح ناپائیدار نہیں ہوتا۔

میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔

سوچتے سوچتے میرے سر میں شدید تکلیف ہو گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سو گیا۔

دوپہر کے وقت ایک نرم و نازک ہاتھ نے مجھے جگانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے آنکھیں کھول کر کھانے کی معذرت کر لی اور کہا کہ مجھے شام تک سونے دیا جائے۔
 شام کو اٹھا تو تیار ہو کر ابھی بیضی تھا کہ نیلم آگئی۔ ”رقص فوجی شروع ہو گا۔ تب تک کچھ پیٹا پینڈ کرو گے؟“

”نہیں...“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ وہ چونک پڑی۔

”میں رقص سے پہلے کچھ نہیں پیتا۔“

قرۃ العین ہی تھی۔ نواب یامین کی بیٹی۔ اگر مجھے ذرہ برابر بھی شک ہو تو شاید میں اسے باخبر کر آتا۔ لیکن مجھے آخر اس بات کی خبر ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ میں اس تنظیم میں تو تھا نہیں اور نہ ہی عالیہ سے کچھ پہچان رکھا تھا۔ نیلم نے شاید اس منصوبے کو سب سے پوشیدہ رکھا تھا۔ عالیہ کے علم میں بھی نہیں تھا ورنہ وہ مجھے ضرور آگاہ کر دیتی۔ اب میری سمجھ میں آیا نیلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ پروگرام کے مطابق کراچی سے کیوں نہیں چلی تھی۔

قرۃ العین کو یہاں دیکھ کر مجھے حیرت سے زیادہ صدمہ ہو رہا تھا۔ نیلم تو کسی اندھے جنون میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ ہر قیمت پر نواب خاندان کو بلیک میل کر کے، ان کی ساری دولت پر ہاتھ صاف کرنا چاہتی تھی۔ رنج تو اس بات کا تھا کہ نیلم اپنی تنظیم کے قرض قدم پر اور اس کے مقاصد پر قریاں ہونے کے لیے آنکھیں بند کر کے چلنے کی خواہش میں پاگل ہو رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دیوانگی کا انجام کبھی اچھا نہیں ہو سکتا ہے۔

میں اپنی جگہ ٹھنک کر رہ گیا۔ میری نظریں بھی جیسے منجمد ہو گئی تھیں۔ میں نے سرگوشی کے انداز میں اسے مخاطب کرنا چاہا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری زبان پر فالج گر گیا ہو۔ میں قرۃ العین کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ میرے ذہن میں جو اندیشے اور دوسو سے ساپوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ انہوں نے میرے جسم میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ اسے یہاں دیکھ کر مجھے خوف آ رہا تھا اور میری نس نس میں لبو برف ہو رہا تھا۔

قرۃ العین کو نیلم یہاں کس لیے لے آئی تھی...؟ وہ صاف ظاہر تھا۔ وہ اسے یہ خیال بنا کر اس کے ماں باپ سے منہ مانگی رقم طلب کرنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے جو چھ لاکھ روپے کا تانواں ادا کیا تھا، وہ اسے مع سود ان سے وصول کرنا چاہتی تھی۔ اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ وہ ساری زندگی قرۃ العین پر بلیک میلنگ کی تلوار لٹکائے رکھے گی۔ اب قرۃ العین اس کے شکنجے میں تھی لہذا وہ اس کی اسیری اور مجبوریوں سے خوب فائدہ اٹھا سکتی تھی۔

ایک لمحے میں، میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، میں نیلم کو ان گھناؤنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا، اس کے ارادوں کو خاک میں ملا دوں گا۔ اس کا۔۔۔ قرۃ العین کے بارے میں جو بھی منصوبہ تھا، اس و ہریت پر خاک میں ملانا ضروری تھا۔ اگرچہ یہ سب کچھ کرنا اتنا آسان نہیں تھا مگر میں بھی حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ مجھے ان لوگوں سے ٹکر لینی تھی جو بے حد منظم تھے مجھے نیلم کا بھی سامنا کرنا تھا، جو چوت کھائی ہوئی ناگن کی طرح غضب ناک ہو رہی تھی۔

قرۃ العین پر مدد ہوشی طاری تھی۔ کمرے میں اذیت ناک سناٹا طاری تھا جو چپکے چپکے کسی غیر مرئی ناگ کی طرح دستا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اس پر جھک کر اس کا شانہ جھنجوڑا۔ ”ٹھٹھے... آنکھیں کھولے۔“

قرۃ العین کا نازک سابدن بستر پر گسٹایا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ بیدار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن قنات اور مدد ہوشی کی وجہ سے آنکھیں نہیں کھول پاری تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کیس پانی رکھا ہو لیکن پانی کیس نظر نہ آیا۔

میں نے اس کا شانہ بلایا اور پھر اسے بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ ”ہوش میں آئیے۔“ میں نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر کہا۔ ”جلدی کیجئے۔“

اس نے بہ دقت تمام نگاہ اٹھائی۔ چند لمحوں تک اپنی لائی لائی پلکیں جھپک کر خلا میں گھورتی رہی۔ پھر تکیے پر گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ وہ خالی الذہنی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی منجمد آنکھوں سے ایسا لگ

مخصوص تو چھلدا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر نگاہ خضرانہ دھار تھی۔ ابھی وہ اس لمحے ایک کونے میں ہے تو اگلی ہی ساعت دوسرے کونے میں پل بھر کے لیے نظر آتا اور پھر کمرے کے وسط میں متحرک دکھائی دیتا۔ پارے کی طرح اس کا پورا جسم تھر تھرا رہا تھا۔ اس کی تیزی اور پھرتی قابل دید۔ سب اپنا رقص بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

نیلم نے میرا ہاتھ چھو ڈیا تھا اور وہ بھی دلچسپی سے اس شرارے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستائش کی چمک تھی۔ میں نے کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تو اسی لمحے وہ بھی میری طرف متوجہ ہو گئی۔ ہماری نظریں چار ہوئیں تو میں نے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی آج محسوس کی بجائے اس کے دل میں کون سی خواہش تھی کہ اس کا عکس آنکھوں میں بھی ابھر آیا۔

جو نوجوان سرخ لبادے میں سر تپا لپٹا، شرارہ بنا کمرے میں پکڑا پھر رہا تھا، اس نے اپنے ہاتھوں پر بھی سرخ رنگ مل رکھا تھا۔

یکایک وہ ہماری طرف آیا۔ وہ اندھا دھند چلا آ رہا تھا۔ میں سامنے سے ہٹ گیا۔ نیلم بھی دور ہو گئی تاکہ وہ اس سے ٹکرانے نہ پائے۔ اس کا ایک لہراتا ہوا ہاتھ میرے سینے سے چھو گیا۔ میں نے اپنے سینے کی طرف دیکھا تو میری جیب پر ایک سرخ نشان پڑ گیا تھا اس کی انگلیوں سے رنگ اتر کر سفید قمیص کو داغ دار کر گیا تھا۔ شرارہ دروازے سے نکل کر غائب ہو گیا۔

دیر تک اس کی غیر موجودگی میں تعریفی انداز میں تائیاں جھتی رہیں۔ پھر سب اپنے اپنے رقص میں کھو گئے۔ میں نیلم کے ساتھ رقص کرتا رہا۔

رات تین بجے کے بعد یہ محفل ختم ہوئی تو نیلم مجھے میرے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے کمرے میں آکر دروازہ بند کر لیا۔

میں آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ یکایک میری نگاہ جیب پر لگے ہوئے سرخ دھبے پر جم گئی۔ میری انگلیاں اپنی جیب میں رینگ گئیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ میری جیب میں یہ کیے ہوئے کاغذ کا ایک ٹکڑا برآمد ہوا، جس پر تحریر تھا۔

”باس، میری فکر مت کرنا۔ میں ٹھیک ہوں۔ تمہارے لیے ایک خوف ناک اطلاع ہے۔ انہی کمروں میں قرۃ العین بھی قید ہے۔“

میں سکتے کے عالم میں کھڑا، جی کے رختے کو گھور رہا تھا اور میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ ”قرۃ العین...“ میں نے زیر لب کہا۔ ”نواب یامین کی اکلوتی بیٹی، قرۃ العین... میری بہن... تو نیلم اس بار اسے اغوا کر کے لانے میں کامیاب ہو گئی...!“



جی کے بتائے ہوئے کمرے میں جب میری نگاہ قرۃ العین پر پڑی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھ پر بجلی گر گئی ہو۔

قرۃ العین کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے میں جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ وہ

رہا تھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔ شاید اس کے ذہن پر اس انجکشن کا اثر ابھی تک باقی تھا جس نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر رکھی تھیں۔

”قرۃ العین صاحبہ...“ میں نے دہی زبان میں پکارا۔ ”ہوش میں آئیے...“

قرۃ العین مجھے دیکھتے ہی بری طرح چوکی اور دوسرے لمبے وہ بستر پر اس طرح اچھلی جیسے وہ بستر پر نہیں... انگاروں پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ مجھے وحشت زدہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔

”کون ہو تم؟“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

میں پلنگ پر اس کے پاس جا بیٹھا تو وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹی۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی اور سر تپا لرز رہی تھی۔ اس کے دل کا خوف اس کے چہرے پر صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ خوف نے اس کے چہرے سے لہو کی ایک ایک بوند نچوڑ لی تھی۔ وہ خوف و دہشت سے گنگ سی ہو کر رہ گئی تھی۔

”گھبرائیے نہیں۔“ میں نے دھیمے لہجے میں اسے تسلی دی۔ ”میں سکندر ہوں۔“

”سکندر... کون سکندر؟“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔ گویا اپنے حواس میں نہ ہو۔

”آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھ کر جاری تھی۔

میں نے اسے خاموش پا کر کہا۔ ”میں وہی سکندر ہوں جو ایک بار آپ کے ہاں آیا تھا جس نے آپ کی اور آپ کے گھروالوں کی کچھ خدمت کی تھی۔“

اس کی دہشت زدہ آنکھوں میں نفرت بھر گئی اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ مزید سمٹ کر کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”تم سکندر ہو؟ کون سے سکندر ہو میں جانتی ہوں۔ تم انہی کے ساتھی ہو... مجھے اغوا کر کے لائے ہو۔ تم نیلیم کے آدمی ہو۔“

”آپ کو غلط فہمی ہو رہی۔ میں...“

”کیا تم مجھے اندھی سمجھتے ہو؟ کیا میں... سکندر کو اپنے بھائی کو اپنے محسن کو نہیں پہچانتی ہوں؟ تم سکندر بن کر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ کیا غرض ہے تمہاری؟“ وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

قرۃ العین کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی چھت پر آگیا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور اندر سے بند کر کے چٹنی چڑھا دی۔ میں پلٹا تو قرۃ العین کو پلنگ پر کھڑے ہوئے پایا۔ وہ مجھے اس طرح گھور رہی تھی جیسے میں ناگ ہوں اور اسے ڈسنا چاہتا ہوں۔ گو کہ وہ خوفزدہ تھی، لیکن اپنے طور پر دفاع کے لیے کسی شیرنی کی طرح غضب ناک بھی ہو رہی تھی۔

میں حیران و پریشان کھڑا تھا کہ وہ مجھے پہچان کیوں نہیں پاری... پھر نکلخت مجھے اپنے بہروپ کا خیال آیا تو سب اختیار میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں پلنگ کے قریب آیا۔ قرۃ العین نے اپنے دونوں ہاتھ یوں بلند کر لیے جیسے میرا چہرہ نوح لٹیا چاہتی ہو۔ اس کی سانپوں میں سمندر کی سی طغیانی اٹھی تھی۔

”قرۃ العین صاحبہ“ آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں اور پہچان نہیں پاریں۔ اس لیے کہ میں میک اپ میں ہوں۔“

”تم مجھے باتوں میں الجھا کر قابو میں کرنا چاہتے ہو۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ خبردار... اگر تم نے اب ایک

قدم بھی آگے بڑھایا تو میں تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں گی۔“

”پلیز... آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا، بلکہ آپ کی مدد

کرنا چاہتا ہوں۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں اپنا میک اپ نہیں اتار سکتا۔ کیا آپ کو میری آواز یاد ہے؟“

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو اور میرے چہرے پر کوئی ایسی چیز تلاش کر رہی ہو جو اسے میری شناخت میں مدد دے سکتی ہو۔ ”کیا تم واقعی سکندر ہو؟... نہیں“

”اس نے توقف کر کے اپنا سر ہلایا۔ ”تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”میں واقعی سکندر ہوں۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”آپ مجھے اس طرح سے نہیں پہچان سکتیں کیونکہ میک اپ نے مجھے یکسر بدل دیا ہے۔ البتہ آپ کوشش کریں تو مجھے میری آواز سے پہچان سکتی ہیں مگر آپ کو شاید میری آواز یاد نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپ سے ملاقات ہوئے کافی دن بیت چکے ہیں اور پھر وہ ملاقات بھی بہت مختصر رہی تھی۔ کسی کی آواز کو محض ایک مختصر ملاقات کے بعد یاد بھی کیسے رکھا جا سکتا ہے۔“

وہ غور سے میری باتیں سن رہی تھی اور ایک ٹک مجھے دیکھ کر جاری تھی... پھر ایک اس کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت کی جگہ سکون و اطمینان جھلکنے لگا۔ اس کے سر پائیں ایک پر سکون سی لہر دوڑ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی، پھر آنکھیں کھول کر میرا چہرہ نکلنے لگی۔

”کوئی اپنے محسن کو بھی بھولتا ہے کیا۔ مجھے معاف کر دیں سکندر بھائی!“ میں آپ کو پہچان نہیں سکتی تھی۔ میں نے نفرت اور غصے کے عالم میں نبھانے آپ کو کیا کچھ کہہ دیا۔ آپ نے مجھ پر اور ہمارے خاندان پر جو احسان کیا ہے اسے...“

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔“ میں نے دروازے کی طرف گردن گھما کر دیکھا اور خاموش ہو کر اپنے کھن اس سمت لگا دیے۔ مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ کا گمان ہوا تھا۔ پھر میں نے قرۃ العین کی طرف دیکھا۔ وہ پلنگ سے اتر آئی تھی اور اپنا دوپٹہ درست کر رہی تھی۔ ”ہمارے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر آپ یہاں کیسے؟“ اس کی آنکھوں میں شدید حیرانی تھی۔ ”یہ بہروپ کیوں اور کس لیے...؟“

”اس کے بارے میں میں آپ کو کسی اور وقت بتاؤں گا۔“ میں بولا۔ ”اس وقت میری بات غور سے سنیں۔ میں جو کچھ بتاؤں گا اسے اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیں۔“

”کیا آپ مجھے یہاں سے نکل کر لے جا رہے ہیں؟“

”ابھی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس وقت آپ کو یہاں سے نکالنا ناممکن ہے۔“

”خدا کے لیے مجھے جلدی یہاں سے نکل کر لے جائیں۔“ وہ کرناک لہجے میں بولی۔ ”اگر میں ایک دن اور ان کے ہاتھوں میں رہی تو یہ لوگ مجھے کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑیں گے۔ ان کے عزائم بڑے گھناؤنے ہیں۔ وہ میری بے بسی سے فائدہ اٹھا کر مجھے اور میرے گھروالوں کو بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔“

”اس وقت آپ کو لے جانے میں خطرہ ہے۔ اگر ہم پکڑے گئے تو پھر آپ کا پچھانا ممکن ہو جائے گا اور وہ مجھے تو بے رحمی سے ہی نہیں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”مجھے معلوم ہے کہ وہ لوگ آپ کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں جلد از جلد آپ کو یہاں سے نکل لے جاؤں گا۔“

”آپ کو ان کے عزائم کا علم ہے؟“ وہ اچھل پڑی۔

کر باتیں کرتے ہیں۔ یہاں تھائی ہے، کسی کے محل ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔ یہیں کچھ وقت گزار لیتے ہیں۔“
لڑکا بولا۔

لڑکے کی بات سن کر میرا دل اچھل کر حلق میں اٹھ گیا۔ اگر اس نے قرۃ العین کے کمرے میں جھانک لیا تو بات گجڑ جائے گی اور میرا سارا منصوبہ ٹپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ اسٹے والے کمرے میں وہ دونوں داخل ہوتے تو میرے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ اس لیے کہ میں اپنے آپ کو کسی الماری کے پیچھے چھپا لیتا۔ وہ دونوں جھانک کر چلے جاتے کہ کمرہ ان کے لیے موزوں نہیں ہے۔
”چلو نیچے ہی چلتے ہیں۔ میرا کمرہ بالکل خالی پڑا ہے۔“ لڑکی نے تجویز پیش کی۔ ”یہاں کوئی بھی آسکتا ہے۔“

”مگر تمہاری آدمی درجن سیلیاں آگئیں تو...“

لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی۔ ”کون بد ذوق ہو گا۔ جو آج کی رات کمروں میں بند ہو کر گزارے گا۔ کوئی اس چاندنی رات سے، تو کوئی موسیقی کے پروگرام سے لطف اٹھا رہا ہو گا۔ صرف ہم ایک بد ذوق ہوں گے جو یہ وقت کمرے میں گزاریں گے۔“

”چلو، ہم بد ذوق ہی سہی۔“ لڑکے کے لہجے میں شوخی تھی۔
میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ مصیبت دہلیز پر پہنچ کر ٹل گئی تھی۔
گہرے سکوت میں ان دونوں کے قدموں کی چاپ ابھری اور لمحہ بہ لمحہ معدوم ہوتی چلی گئی۔ میں کچھ دیر بعد کمرے سے باہر آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو جی کو گہری نیند سوتے پایا۔ میں نے اسے جگایا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ میں نے اسے سارا واقعہ سنایا۔
”اب ہمیں قرۃ العین کو ہر قیمت پر نکال کر لے جانا ہو گا۔ ورنہ اس شریف لڑکی کے ساتھ نہ جانے کیا ہو۔“

ہم دونوں کافی دیر تک صلاح مشورے کرتے رہے پھر ہم نے ایک منصوبہ بنایا۔ کمرے سے باہر آئے۔ اب ہمیں ایک زنانہ جوڑے کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ قرۃ العین نے جو لباس پہنا ہوا تھا اس لباس میں اسے لے کر باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس کے لباس سے نیلم اور اس کے وہ ساتھی جو قرۃ العین کو اغوا کر کے لائے تھے، اسے آسانی سے شناخت کر سکتے تھے۔ اس کا لباس ریشتی تھا، بڑا قیمتی اور بھڑکیلا۔ اس کے لباس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تقریب میں جاری تھی یا تقریب سے واپس آ رہی تھی کہ اسے اغوا کر لیا گیا۔

اس زنانہ لباس کے حصول میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ ایک کمرے میں جو لڑکیوں کے لیے مخصوص تھا... ایک کی بجائے وہاں کئی لباس بے ترتیبی سے بستر اور فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ لڑکیوں نے لباس تبدیل کرنے کے بعد نہ تو انہیں کیا اور نہ ہی اٹھا کر ٹھیک سے کہیں رکھا تھا۔ ان کمرے میں، میں داخل ہوا تھا۔ جی باہر پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے گلابی رنگ کا لباس دوپٹے کے ساتھ اٹھا لیا اسے پیٹ کر بغل میں دبایا۔ سنگار منیز پر میک اپ کے لوازمات رکھے تھے۔ میں نے فرش پر پڑے ہوئے ایک گہرے سبز رنگ کے دوپٹے میں میک اپ کا سامان رکھ کر اس کی پوٹلی بنائی، پھر ہم کمرے میں آگئے۔

میں نے کچھ سوچ کر اپنی ساری رقم جی کے حوالے کی، صرف پانچ سو روپے اپنے پاس رہنے دیے۔ میں

”اس سے پہلے بھی آپ کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے اور اب پھر یہ وہی مذموم حرکت کریں گے۔ بہر حال، خدا پر بھروسہ کیجئے۔ میں ان کے یہ عزائم کبھی پورے نہیں ہونے دوں گا۔ میں آپ کو بحفاظت گھر پہنچانے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ چاہے اس کے لیے مجھے کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔“
”یہ آپ کا دوسرا احسان ہو گا اور ہم ساری زندگی...“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”میں جا رہا ہوں اور کچھ دیر بعد پھر آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”میرا دوست جی بھی اسی حویلی میں ٹھہرا ہوا ہے... میرے جانے کے بعد نیلم یا اس کا کوئی ساتھی آئے تو انہیں یہ تاثر دیں کہ آپ ابھی تک بے ہوش ہیں۔ اگر میں تاگزیر حالات کی بنا پر جی کو سمجھوں تو آپ اس کے ساتھ چلی جائیں۔ جی پر بھی آپ اسی طرح بھروسہ کر سکتی ہیں، جیسے مجھ پر کرتی ہیں۔ وہ ایک قابل اعتماد دوست ہے۔“ میں نے اسے جی کا حلیہ بتایا۔

میں چند لمحوں تک اسے سمجھاتا رہا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں اسے قتل و تشفی دے کر کمرے سے نکل آیا... پھر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ میں زینے کی طرف بڑھا۔ دو تین قدم ہی چلا ہوں گا کہ میزبیں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شاید نیلم اور اس کے ساتھی اوپر آرہے تھے۔ ان آوازوں نے میرے قدموں میں بجلی سی بھردی۔ میں سرعت سے گھوم گیا اور اسٹے والے کمرے کی طرف لپکا۔ اندر داخل ہو کر میں نے دروازہ بند کر لیا۔ اب میں دروازے سے کان لگائے کھڑا تھا۔

چند لمحوں بعد چھت پر قدموں کی چاپ گونجی... پھر اس کمرے کے پاس آکر دم توڑ گئیں جہاں میں کھڑا تھا۔ میرا دل اس وقت عجیب انداز سے دھڑکنے لگا۔ یہ دھڑکن کمرے میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ جب کہ باہر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ پھر ایک لڑکی کی ریلی آواز گونجی۔ ”اس کھلی چھت پر برستی ہوئی چاندنی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے آسمان سے افشاں برس رہی ہو۔“

”اور اس چاندنی میں تم کس قدر دل کش اور دلچسپ دکھائی دے رہی ہو۔“ یہ ایک لڑکے کا جملہ تھا جو وہ خواب ناک لہجے میں بولا تھا۔ ”اور تم چاند سے کہیں حسین دکھائی دے رہی ہو۔“
”تمام مرد ایسی ہی چکنی چپڑی گفتگو کرتے ہیں تم بھی...“

اس لڑکے نے شاید اسے اپنا جملہ پورا نہیں کرنے دیا تھا۔ وہاں پھر دی گہرا سکوت چھا گیا۔ چند لمحوں بعد لڑکی کی آواز گویا گہرے نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ”چلو نیچے چلتے ہیں۔ کچھ دیر گلے سنتے ہیں۔ ہم کتنا اچھا پروگرام چھوڑ کر آئے ہیں۔“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اس چاندنی رات کا لطف تو پوری طرح اٹھا لینے دو۔ ایسی چاندنی راتیں پھر کہاں آئیں گی۔“

”کیوں نہیں آئیں گی؟ ہر مہینے آتی رہتی ہیں اور ہم ہر مہینے ان چاندنی راتوں میں ملنے رہتے ہیں۔“
”مگر تم صرف تھوڑی دیر کے لیے آتی ہو اور جلدی چلی جاتی ہو۔ محبت بھری باتوں کی بجائے تحریک اور سیاسی سرگرمیوں کا احوال سناتی رہتی ہو۔ پھر کراچی شہر میں چاندنی راتوں کا ایسا حسین و دل کش نظارہ دیکھنے کو کہاں ملتا ہے۔“

”محبت بھری باتوں کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔“ لڑکی سنجیدہ ہو رہی تھی۔
”جیسا... آج کی رات تو تحریک اور سیاسی سرگرمیوں کی باتیں رہنے دو۔ چلو، سامنے والے کمرے میں چل

رہی تھی۔ قرۃ العین دیوار سے لگی کانپ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف مجملہ تھا۔ اس شخص کی پشت میری طرف تھی اس لیے اسے میری آمد کا احساس نہیں ہوا۔ قرۃ العین کی نظر جیسے ہی میری طرف اٹھی، میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

اس شخص کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے، کیونکہ وہ کسی نازک شاخ کی طرح ہل رہا تھا مستی میں جھوم رہا تھا۔ اس کی زبان میں کپکپاہٹ اور قدموں میں لڑکھڑاہٹ سی تھی۔ وہ اپنا ہاتھ قرۃ العین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اے میرے چاند، اتنی دور کھڑے ہو کر مجھے مت تڑپاؤ۔“ میں نے اپنے ہاتھ میں دلی ہوئی چیزیں فرش پر رکھیں اور اس کے عقب میں جا پہنچا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کیا تم میرے دل کو ٹھنڈک نہیں پہنچاؤ گی۔“

کمرے میں ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی جس سے میں اس کے سر پر ضرب لگا سکتا۔ اب مجھے اپنے ہاتھوں کو ہی استعمال کرنا تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے کہا۔ ”تم ٹھنڈک کی بات کر رہے ہو۔ کو تو تھمارے سارے بدن کو قطب شمالی بنا دوں۔“

یہ سن کر وہ چونکا۔ چونکہ وہ نشے میں تھا اس لیے پہلے تو یہ سمجھا کہ قرۃ العین اس سے کچھ کہہ رہی ہے پھر اسے احساس ہو گیا کہ آواز کہیں اور سے آئی ہے اور کوئی پیچھے کھڑا ہے۔

وہ پھرتی سے میری طرف گھوم۔ میں نے پوری قوت سے ایک مکا اس کے جڑے پر رسید کر دیا۔ وہ اس ناگمانی حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا اور نہ ہی اس نے سوچا ہو گا کہ کوئی اس انداز سے بھی اس کے مقابلے پر اتر سکتا ہے۔ لہذا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کا سر دیوار سے بری طرح ٹکرایا۔ دیوار سے ٹکرا کر وہ فرش پر گرا تو اس کی ہندوق کندھے سے پھسل کر دور جا پڑی۔

وہ بڑا سخت جان تھا۔ اس قدر شدت سے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا کہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا بے ہوش ہو چکا ہوتا۔ وہ سنبھل کر اور کراہتے ہوئے، سر کو جھٹکتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک کراس کی ہندوق اٹھائی۔ پھر بغیر کسی تاخیر کے اس کے سر پر بٹ مارا۔ دوسرے لمحے وہ بے ہوش ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

قرۃ العین نے اطمینان کا سانس لیا اور میرے قریب آگئی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے احسان مندی اور ممنونیت کے جذبات تھے۔ وہ ان جذبات کو الفاظ کی شکل دینا چاہتی تھی کہ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا۔ پھر فرش سے کپڑے اٹھا کر اس کی طرف بڑھائے۔ اس نے کپڑے لے لیے تو میں اسے اسٹیل والے کمرے میں لے آیا اور کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”آپ فوراً کپڑے تبدیل کر کے آئیں، میں باہر کھڑا ہوں۔“

قرۃ العین نے کمرے میں پہنچ کر بتی جلائی، دروازہ بند کیا اور کپڑے بدلنے لگی۔ اس دوران جی اوپر آیا۔ میں جی کو لے کر قرۃ العین کے کمرے میں گیا تو وہ ایک ہی نظر میں سارا ماجرا سمجھ گیا۔ میں نے اسے مختصر طور پر واقعہ سنا دیا۔

قرۃ العین کپڑے تبدیل کر کے آئی تو وہ جی کو دیکھ کر چونکی تھی۔ میں نے قرۃ العین سے جی کا تعارف کرایا۔ پھر میں نے اور جی نے مل کر اس شخص کی مشکیں کس دیں۔ اس کے لیے پانگ کی چادر اور قرۃ العین کے

یہ رقم اپنے ساتھ لے کر گھومنا نہیں چاہتا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے کسی انجانے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ پھر میں نے حویلی کے اندرونی حصے کا ایک چکر لگایا۔ اس اندیشے کے تحت کہ کہیں نلیم واپس نہ آگئی ہو، مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ میں نے کمرے میں آکر جی کو بتایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔

”سکندر بھائی!“ جی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔“

”کون سی بات؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہی کہ قرۃ العین کو اغوا کر کے لانے کے بعد وہ لوگ اس طرح بے پروا کیوں ہو گئے ہیں۔ جیسے وہ لڑکی نہیں کوئی بکری ہو۔ نہ تو چھت پر کوئی سپرہ اور نہ ہی زینے کے پاس۔“ جی بولا۔

”یہی سوال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔“ میں نے تائید کی۔ ”مگر ایک دو باتیں میری سمجھ میں آ رہی ہیں۔“

”کون سی باتیں؟“

”پہلی تو یہ کہ قرۃ العین کو اغوا کرنے کے بعد اسے مارنا یا کاٹنا دشمن دے دیا گیا اور لوگوں کا یہ خیال ہو گا کہ قرۃ العین ساری رات بے ہوشی کی نیند سو رہی ہے اور صبح سے پہلے اسے ہوش نہیں آئے گا۔ اس لیے وہ اسے اس کمرے میں بند کر کے چلے گئے۔“

”مگر سپرہ تو ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ کوئی بھی چھت پر جا سکتا ہے، جیسے کہ آپ چلے گئے۔ اگر کوئی اور چلا جاتا تو...؟“

”ممکن ہے کسی کو سپرے پر مامور کیا گیا ہو اور وہ غافل ہو کرے نوشی کرنا پھر رہا ہو۔“

”اس وقت موقع اچھا ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“ جی بولا۔

ہم دونوں اپنے سلمان سمیت قرۃ العین کو لے کر نہیں نکل سکتے تھے۔ لہذا ہمیں اپنا سلمان چھوڑنا پڑا۔ کمرے سے نکل کر ہم دونوں گردو پیش کا جائزہ لیتے ہوئے زینے کی طرف جا رہے تھے۔ راہ داری سنسان اور ویران پڑی تھی۔ بڑے ہال سے کسی لڑکی کے گانے کی کوچ دار آواز سنائی دے رہی تھی۔ حویلی پر ویرانی برس رہی تھی۔ زینے کے پاس پہنچ کر جی نے میرا بازو پکڑ کے مجھے میڑھیوں پر روک لیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”حفظ ماتقدم کے طور پر پہلے آپ اوپر جائیں۔ میں نیچے کھڑا رہتا ہوں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا، پھر اس کے ہاتھ سے کپڑوں کا بنڈل اور میک اپ کا سامان لے کر میڑھیوں چڑھتا ہوا اوپر پہنچا۔ چھت پر کوئی نہیں تھا۔ صرف چاندنی تھی جو کھل کر برس رہی تھی۔ قرۃ العین کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے میری نظر دروازے پر پڑی تو میں ٹھنک گیا۔ دل وحشت سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ اندر کوئی تھا۔ قرۃ العین تو دروازہ کھولنے سے رہی میں باہر سے کنڈی لگا کر گیا تھا۔

کون ہو سکتا ہے؟ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ پھر خیال آیا کہ شاید چھت پر کوئی آیا ہو گا، اس نے کسی خیال کے تحت کمرے میں جھانکا ہو گا۔ قرۃ العین کو کمرے میں تنہا پا کر ہلک گیا ہو گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں دبے پاؤں کمرے کی طرف پکا۔ دلیر پر پہنچ کر اندر جھانکا تو میرا شبہ درست نکلا۔

وہ ایک لمبا ترنگا اور جسم شخص تھا۔ یہی کوئی تیس بیس برس کا ہو گا۔ اس کے کندھے سے ہندوق لٹک

ہیں۔" اس کی آواز گلے میں رندہ رہی تھی۔ "کاش میں ان دردوں کے ہاتھ نہ لگتی۔ ان کے ہاتھ گلے سے پہلے مرنے لگتے۔"

"جان لینے اور دینے والا اوپر بیٹھا ہے۔" میرے بجائے جی بولا۔ "جب تک اس کا حکم نہیں ہو گا اس وقت تک کوئی بھی ہمارا ہلکا نہیں کر سکتا بس آپ چلتی رہیں۔"

قدرت شاید ہم پر مہمان ہو گئی تھی۔ ایک گھرے بادل کے ٹکڑے نے چاند کو اپنی آغوش میں لیا تو ہر طرف اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ بادل کی لوٹ سے چھلکتی ہوئی چاندنی سے لمبی سی روشنی کی چادر تن گئی۔ اس روشنی میں ہم درختوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ ایک محفوظ ترین جگہ تھی۔

ادھر چاند بادل کے ٹکڑے سے مسکراتا ہوا نکلا۔ ادھر ہم درختوں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ پھر ہر سو چاندنی پھیل گئی تھی۔ ہم یہاں دم لینے کے لیے رک گئے۔ قرۃ العین ایک درخت سے ٹیک لگائے لمبی لمبی سانس لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

میں اور جی اس جگہ کا جائزہ لینے لگے۔ ایک راستہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا دو حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ وہ حصہ جنگل کی طرح لگ رہا تھا۔ جی نے چاروں سمتوں کا جائزہ لینے کے بعد مجھ سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم یہاں صبح تک پناہ لے سکتے ہیں۔ یہ راستہ بتا رہا ہے کہ مقامی باشندے کثرت سے آمد و رفت رکھتے ہیں۔ ان کی مدد سے ہم یہاں سے فرار ہو کر نواب شاہ شہر بھی پہنچ سکتے ہیں اور ان کی دسترس سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔"

"کیوں نہ ہم چلتے رہیں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "اس لیے کہ دشمن ہم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ ہم تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ چلتے رہنے میں فائدہ ہے کہ شاید ہم کسی گاؤں میں داخل ہو جائیں اور کسی گھر میں پناہ مل جائے۔"

"چاہتا ہوں بھی یہی ہوں لیکن ان کی وجہ سے چپ ہوں۔" جی نے قرۃ العین کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ شاید اتنا نہ چل سکیں۔"

قرۃ العین نے خود پر جلدی سے قابو پایا تھا۔ اس نے جی کی بات بھی سن لی تھی۔ وہ درخت سے ہٹ کر ہمارے پاس آکھڑی ہوئی اور ٹھہرے ہوئے لمبے میں بولی۔ "آپ مجھے اتنا کمزور اور نازک نہ سمجھیں۔ میں میلوں پیدل چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

"تکلف سے کام نہ لیجئے۔" میں نے کہا۔ "یہ جگہ قدرے محفوظ ہے۔ ہم یہاں صبح تک قیام کرنے کے بعد پھر سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔"

"انجکشن کا اثر تھا جس کی وجہ سے میں تیز نہیں چل پاری تھی اور مجھے کمزوری سی محسوس ہو رہی تھی۔ اب اس انجکشن کا اثر بڑی حد تک زائل ہو گیا ہے اور میری توانائی بھی کسی قدر لوٹ آئی ہے۔"

"اگر آپ خود میں اتنا حوصلہ پاتی ہیں تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"سکندر بھائی... سکندر بھائی۔" اچانک جی وحشت زدہ ہو کر چنچا۔ "وہ دیکھیے۔"

اس نے میرے عقب میں اشارہ کیا تھا۔ میں نے تیزی سے گھوم کر دیکھا تو دور جہاں سڑک تھی وہاں سے روشنی کی ایک لکیر تاریکی کا سینہ چیر رہی تھی۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ اس پر دن کا لگنا ہو رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس

کپڑے کام میں لانے پڑے۔ پھر اس کے منہ پر بھی کپڑا باندھ دیا گیا۔ اسے بستر پر لٹا کر کمرہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگائی اور زینے کی طرف چل پڑے۔ جی نے اس کی بندوق اٹھالی تھی۔ میں نے اسے منع بھی کیا تھا کہ اس بندوق کو رہنے دے۔ کہیں اس بندوق کی وجہ سے کوئی مصیبت گلے نہ پڑ جائے۔ حویلی کے بیرونی دروازے پر متعین ہرے دار بھی معترض ہو گا۔ اسے ہم پر شبہ بھی ہو سکتا ہے مگر جی نے میری بات نہیں مانی۔ وہ میرے اس خیال سے متفق نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آگے چل کر یہ بندوق ہمارے بست کام آسکتی ہے۔ اس وقت ہم اسے بڑی آسانی سے یہاں سے نکال کر لے جاسکتے ہیں۔ میں نے بادل خواستہ اس کی بات مان لی۔

ہم تینوں مع بندوق کے خیریت و عافیت کے ساتھ حویلی سے نکل آئے۔ حویلی کے بیرونی دروازے پر ہرے دار نشے میں دھت پڑا تھا۔ اس کے پاس شراب کی دو خالی بوتلیں پڑی تھیں۔ جی نے اس کی کمر سے گولیوں کی چینی اتاری اور اس کی بندوق بھی اٹھالی جو اس کے قریب پڑی تھی۔ ہم تینوں اس طرف بڑھ گئے۔ جدھر جھاڑیاں اور درخت تھے۔ یہ راستہ سڑک کی طرف جارہا تھا۔ ہم نے نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ دور سے تیز روشنیاں دکھائی دیں جو لمحہ بہ لمحہ ہم سے قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ نیلم اور اس کے ساتھی واپس آ رہے تھے۔ ہم تینوں نے دوڑ کر اپنے آپ کو جھاڑیوں کے پیچھے چھپا لیا۔ کوئی پانچ سات منٹ کے بعد دو گاڑیاں سڑک پر سے گزریں۔ ان میں ایک جیپ تھی۔ جیپ میں دو تین لڑکیاں اور لڑکے نظر آئے۔ جیپ کے پیچھے ایک سوزو کی دین تھی۔ جس میں پانچ مرد بیٹھے تھے۔ ان دونوں گاڑیوں کا رخ حویلی کی طرف تھا۔ دونوں گاڑیاں تیزی سے دھول اڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھیں۔ جب وہ بیرونی دروازے کی طرف چلی گئیں تو نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

ہم تینوں نے ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی جھاڑیوں سے نکلے تیزی سے چلتے ہوئے کھیتوں میں آگئے۔ میں اور جی تو تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ قرۃ العین کے لیے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ... وہ کسی شہزادی کی طرح ناز و نعم میں پلی تھی۔ شاید یہی سڑک پر وہ ایک فرلانگ بھی نہ چلی ہو۔ کھیتوں میں تو پگھڑیوں پر چلنا پڑ رہا تھا جو ناہموار تھیں۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ تھام رکھا تھا جو برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے کھیتوں سے نکل کر اس جانب چلے جائیں جہاں درخت قطاروں میں کھڑے ہیں اور اس جگہ پر جنگل کا سا لگنا ہو رہا تھا۔ وہ جگہ ہم سے نصف میل دور تھی۔ اس جگہ پہنچ کر ہم اپنے آپ کو آسانی سے پوشیدہ رکھ سکتے تھے۔ وقت بہت نازک اور کم تھا۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ نیلم اور اس کے ساتھی قرۃ العین کو کمرے میں نہ پا کر شکاری کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھریں گے۔ چاندنی رات تھی۔ اس چاندنی رات میں وہ ہمیں بڑی آسانی سے پا سکتے تھے۔ یہ ایک ہولناک اور جان لیوا فرار تھا۔ اگر قرۃ العین ساتھ نہ ہوتی تو ہمیں یہ وقت اور لمحات اتنے کڑے نہ محسوس ہوتے اور ہم ہر قسم کے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے۔

قرۃ العین بڑی سرعت سے چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے میری اور جی کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا... کہ ہم لوگ سخت خطرے میں ہیں کسی بھی لمحے پھنس سکتے ہیں مگر میں نے محسوس کیا کہ قرۃ العین کے لیے ایک ایک قدم ہماری ہو رہا ہے۔ میں نے چلتے چلتے اسے تسلی دی۔ "آپ جو اس کو پوری طرح قابو میں رکھیں۔ بدحواسی میں انسان کسی کام کا نہیں رہتا ہے۔"

"میں آپ دونوں سے بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ دونوں کی جانیں خطرے میں پڑ رہی

گئی۔ میں سمجھا نہیں تھا کہ دوسری گولی میرے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے بازو میں انگارے سے دھک اٹھے ہوں۔ میں بجلی کی طرح درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ دونوں گولیاں مجھے چومنے میں یوں کامیاب بھی ہو جائیں گی۔ پہلی گولی کو ٹانگی ہوئی تھی مگر دوسری گولی اپنے لس سے مجھے آشنا کر گئی تھی۔

دھماکا مجھ پر چاروں طرف سے گولیاں برسا شروع ہو گئیں۔ میدان جنگ کا سا نظارہ تھا۔ دشمن نے مجھ پر بار بول دیا تھا۔ میرے ذہن میں فوراً ایک تدبیر آئی تو میں اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ پھر گولیاں پلٹے کا وقت مختصر ہوا تو میں رنگتا ہوا تیزی سے مخالف سمت میں چلا گیا۔ میں نے ایک بوڑھے اور گئے درخت کی آڑ لے کر ان کی سمت قاز کھول دیا۔ اب ان پر دوسری سمت سے حملہ ہوا تھا۔ میں نے انہیں دوسری سمت متوجہ کرنے کے لیے ایسا کیا تھا مگر اس نے مجھ سے ان کے حملوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ عفریت اپنا جبر اکھولے مجھے نکلنے کے لیے آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میرے پاس ایک گولی بھی نہ رہی تھی۔

کوئی دو گھنٹے بعد میں ان کا قیدی بن چکا تھا اس دو گھنٹے کے عرصے میں مجھے امید تھی کہ قرۃ العین اور جی بہت دور نکل گئے ہوں گے اور انہوں نے کسی گھٹن کی جھوپڑی میں پناہ لے لی ہوگی۔ اب مجھے ان کی فکر نہیں تھی۔ میں خوش تھا۔ کہ میری تدبیر کامیاب رہی۔ قرۃ العین کی عزت و آبرو ان درندوں کے ہاتھ سے بچ گئی۔

نیلیم کا خواب ایک بار پھر احوارہ گیا ہے۔

مجھے دس بارہ آدمیوں نے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ وہ بندوقوں سے مسلح تھے۔ میں مجرا نہ طور پر ان کے ہاتھوں مرنے سے بچ گیا تھا۔ شاید قدرت کو ابھی میری موت منظور نہیں تھی۔ اسے شاید مجھ سے بہت سے کام لینا تھے۔

وہ سارے چرے میرے لیے تھے۔ ان میں صرف ایک چہرہ شامسا تھا۔ وہ صابر تھا۔ ان لوگوں کا لیڈر ایک لوجسٹکس کا شخص تھا۔ اس کا چہرہ کرخت تھا اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے درندگی جھانک رہی تھی۔ اس کے ہونٹ سختی سے بچھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے کھانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ ”وہ لڑکی کہاں ہے؟“

”کون سی لڑکی؟“ میں نے انجیل بن کر پوچھا۔ ”تم اس لڑکی کا حلیہ بتا سکتے ہو جس کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟“

اس نے بڑھ کر میرے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ میرے جڑے پر شب رات کا پناہ سا چھوٹ گیا تھا۔ ”اب تمہیں اس لڑکی کا حلیہ یاد آجائے گا۔“ اس نے بندوق کو بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں لے کر اس کاٹ فضا میں لڑایا۔ ”تھا“ وہ لڑکی کہاں ہے جسے تم حویلی سے لے کر فرار ہوئے اور تم نے ہمارے ایک آدمی کو زخمی بھی کر دیا ہے۔ ہم تمہیں بخشیں گے نہیں۔“

”وہ لڑکی مجھے یہاں چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ حسین لڑکیوں پر مجھ کو سا کرنا صاف ہے۔ اس نے مجھے خوب بے وقوف بنایا۔“

”تم اس لڑکی کو حویلی سے لے کر فرار کیوں ہوئے؟ کیا تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟ صابر نے اچانک پوچھا۔

”ایک مسلح شخص اس لڑکی کی طرف بری نگاہ ڈال رہا تھا۔ میں چاندنی رات کا نظارہ کرنے جھٹ پر چلا گیا تھا۔ لڑکی کی ہڈیاں چھین سن کر اندر داخل ہوا تو اس شخص کو دیکھا جو لڑکی کو بندوق سے ڈرا دھمکا رہا تھا۔ میں نے

اس قدر طاقت و درناج ہوگی، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم روشنی کی زد میں آتے ہیں قرۃ العین کا بازو تمام لیا اور درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ روشنی کا دائرہ کئی منٹ تک ہمارے آس پاس منڈلاتا رہا۔ اسی وقت کسی کپڑے نے قرۃ العین کے پیروں میں کٹ لیا۔ وہ اسے سانپ سمجھ کر ایک دم سے چینی اور درخت کی آڑ سے نکل گئی۔ نتیجہ ”اس تیز روشنی میں نہا گئی۔ دوسری صافقت مجھ سے ہوئی کہ میں نے لپک کر اس کا بازو تھما تو اس روشنی نے میری آنکھیں چند ہیادیں۔ اس طرح ہم دونوں ہی دشمن کی نظروں میں آ گئے۔

پھر بھی میں قرۃ العین کو کھینچ کر درخت کی آڑ میں لے آیا۔ وہ آکڑوں بیٹھ گئی اور متاثرہ حصے کو مسلے لگی۔ اسی لمحے میری ٹانگ پر اسی کپڑے نے کٹ لیا۔ میں نے اپنے حلق سے نکلنے والی بے ساختہ چیخ کو روکا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے بھی بیٹھ کر متاثرہ حصے کو مسلا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ کپڑا نہیں بلکہ جیوتی ہے۔ وہ لالہ جیو نہیں تھیں جنہوں نے ہم دونوں کے پیروں میں کٹ لیا تھا۔

”سکندر بھائی!“ جی میرے پاس آکر بولا۔ ”انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ ہماری طرف آرہے ہیں۔ یہ دیکھیے“ ان کی نارنج کی روشنی ہماری سمت میں منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔ چلے بھاگ چلیں۔“

”بھاگنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہ ہمیں آئیں گے۔“ میں نے کہا۔

”تو کیا ہم اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیں۔“ قرۃ العین نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے پلٹ کر جی کی طرف دیکھا۔ ”میرے ذہن میں ایک تدبیر آ رہی ہے۔ میں انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو“ قرۃ العین کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ جتنی دور جا سکتے ہو چلے جاؤ، کسی محفوظ جگہ پر چھپ جاؤ۔ میرے انتظار اور بھروسے پر نہ رہنا۔“ میں نے ایک ہی سانس میں اسے ہدایت کی۔

”آپ انہیں کس طرح روکیں گے؟“ جی کے لیے میں حیرت تھی۔

”گولیوں کی یہ پٹی مجھے دے دو اور ایک بندوق لے کر قرۃ العین کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ۔“ میں نے جی سے گولیوں کی پٹی لے کر اپنی کمرے سے باندھ لی۔

”آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ آپ بھی ساتھ چلیں۔“ قرۃ العین نے مجھ سے التجا کی۔

”باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر چل پڑیں۔ خدا حافظ!“

”خدا حافظ!“ جی بولا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ کسی محفوظ جگہ پناہ حاصل کر لوں۔“

”خدا حافظ!“ قرۃ العین نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“

میں نے بندوق کندھے سے نکال کر اس طرف شت باندھی جدھر طاقت و در سرج لائٹ روشن تھی۔ ایک لمحے توقف کیا، پھر لمبی پرانگی رکھ کر بازو ڈالا تو بندوق نے ایک شعلہ اگل دیا۔ اور فضا کے گہرے سکوت میں ایک دھماکا ہوا۔ وہ جدید ساخت کی ایک غیر ملکی بندوق تھی۔ اور اس کی مار بہت لمبی تھی اس لیے دوسرے ہی لمحے ایک ہلکا سا چھٹکا ہوا اور سرج لائٹ کا شیشہ پکڑا چور ہو گیا۔ پھر تار کی چھا گئی۔ جی میری بندوق سے ایک اور قاز ہوا تو جنگل کا سکوت درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

میں جی سے گولیاں نکال رہا تھا کہ چاند کسی شوخ لڑکی کی طرح تڑپ کر بادلوں کی بانوں سے نکل آیا۔ پھر ہر سو چاندنی بکھر گئی۔ میں نے چونک کر مخالف سمت میں دیکھا تو مجھے بہت دور کھیتوں میں دس پندرہ بے وقوف نظر آئے جو گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے۔ میں نے بندوق لوڑکی ہی تھی کہ ایک گولی میرے سر سے سنسناتی ہوئی گزر

ہو کہ وہ ہاتھ سے نکل جانے میں کامیاب ہو جائے اور ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر دے۔
”رات کو اس علاقے سے فرار ہونا بہت مشکل ہے۔“ لیڈر بولا۔ ”وہ جا بھی کہاں سکتی ہے؟ یہ کراچی نہیں ہے۔“

صابر دانت پیٹتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ”تم لوگ تین تین کی ٹولیاں بنا کر چاروں طرف پھیل جاؤ۔ اسے کسی قیمت پر یہاں سے بچ کر نہ جانے دینا۔“

”وہ شیطان کی خالہ اس سمت گئی ہے۔“ میں نے انہیں غلط راہ پر ڈالنے کے لیے دوسری سمت اشارہ کیا۔
”اچھا تو تم میرے ساتھ چلو۔“ ان کے لیڈر نے مجھ سے کہا۔ پھر اس نے ایک اور شخص کو ساتھ لے لیا۔
فوراً ہی تین تین کی ٹولیاں بن گئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ چاروں طرف چل پڑے۔ میں بھی لیڈر اور اس کے ساتھی کے ساتھ اس سمت چل پڑا۔ ہر میں نے اشارہ کیا تھا۔ نیلم ان لوگوں کے ساتھ نہیں تھی۔ شاید وہ فائرنگ کی وجہ سے حویلی چلی گئی تھی یا حویلی میں کسی وجہ سے رک گئی تھی۔ نیلم کا ان لوگوں کے ساتھ نہ آنا ایک طرح سے میرے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔

وہ دونوں ہی مسلح تھے۔ ان لوگوں نے پہلے ہی مجھ سے بددوق چھین لی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ انہیں میری باتوں کا پوری طرح یقین نہیں آیا ہے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ حویلی جانے کی بجائے کسی نہ کسی طرح یہیں سے فرار ہو جاؤں۔ حویلی میں جانے سے میرا بھانڈا اچھوٹ سکتا تھا۔

ان لوگوں سے چھٹکارہ پانے کے لیے اب مجھے کسی تدبیر سے کام لینا تھا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ چلتا ہوا بڑی تیزی کے ساتھ کوئی تدبیر سوچنے میں مصروف تھا۔ مجھے ان دونوں پر قابو پانے کے لیے ایک بددوق کی ضرورت تھی۔ ہم لوگ چلتے چلتے جنگل میں داخل ہو گئے۔ یہ جنگل کافی گھنا تھا۔ موٹی شاخوں اور گتھے پتوں کے باعث چاندنی بشکل چمن کر زمین تک پہنچ رہی تھی۔ بہر حال اتنی روشنی تھی کہ ہمیں چلنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے چلتے چلتے لیڈر سے پوچھا۔ ”آخر یہ لڑکی کون ہے جس کی تلاش ہو رہی ہے؟“

”بڑی خطرناک لڑکی ہے۔ یہ لڑکی ہماری تنظیم کے لیے پریشانی اور خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، وہ تمہیں کس طرح بے وقوف بنا کر فرار ہو گئی ہے۔“ لیڈر نے جواب دیا۔

”اگر وہ لڑکی خطرناک تھی تو اسے حویلی میں کیوں رکھا گیا تھا؟“

”ہم نے اسے ایک کمرے میں قید کر کے رکھا تھا اور وہ شخص جسے لڑکی نے بے ہوش کر دیا تھا، پہرہ دینے پر مامور کیا تھا، مگر اس عیار لڑکی نے اسے کسی طرح درغلا لیا۔ تمہاری اچانک آمد سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ تمہیں بھی بے وقوف بنانا۔ کیا پہرے دار نے واقعی شراب پی رکھی تھی؟“

”ہاں... وہ شراب کے نشے میں دھت تھا اور دست درازی کی کوشش کر رہا تھا۔“

”مفت کی شراب ملتی ہے تو اپنے باپ کا مال سمجھ کر پی جاتے ہیں اور کسی عورت کو دیکھتے ہیں تو ہلکے جاتے ہیں۔“ لیڈر کا منہ بن گیا۔ ”میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ شراب پانی کی طرح پینے کی اجازت نہ دی جائے، مگر پھر کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔“

دھنسا... ہمارا ساتھی پاگوں کی طرح چیخنے لگا۔ ”سانپ... سانپ...“ میں نے اچھل کر اس طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے بددوق چھوٹ کر زمین پر گر پڑی تھی۔ میں نے سامنے دیکھا تو دو گز

اسے اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر پل پڑا۔ مجھ سے ہتھم گستاہتے وقت اس کے کندھے سے بددوق نکل کر زمین پر گر پڑی۔ اس لڑکی نے بددوق کاٹ اس کے سر پر دے مارا، پھر اس نے میری بروقت آمد کا نہ صرف شکر یہ ادا کیا بلکہ محبت کا اظہار بھی کیا۔ مجھ پر اس نے اپنے حسن و شباب کا جلدو کچھ اس طرح چلایا تھا کہ میں نے اس کا ہر حکم اپنے سر آٹھوں پر لیا۔ میں نہ صرف اس کے کتے پر نیچے سے کپڑے کے لایا، بلکہ اس شخص کی ٹھیکیں بھی کس دیں۔ اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کیے اور کمرے میں جا کر اس شخص کی بددوق اٹھالی۔ پھر بول... یہاں سے فوراً نکل چلو، اس مردود کے دوسرے ساتھی آنے والے ہیں۔ اگر وہ آگے تو میری خیر نہیں۔ وہ سب کے سب درندہ صفت لوگ ہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ہونی دروازے پر پہنچی تو پہرہ دار شراب کے نشے میں دھت پڑا تھا۔ اس کے کتے پر میں نے پہرے دار کی کمرے سے چٹی اناری اور بددوق بھی اٹھا لی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اس جگہ پہنچی اور بولی۔ یہ محفوظ علاقہ ہے۔ ہم دونوں صبح تک یہاں چسپ کر بیٹھتے ہیں۔ صبح ہونے ہی حویلی چلے جائیں گے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ حویلی کے کچھ نوجوان بلا وجہ اس کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ وہ کل صبح ان کی شکایت ہائی کلن سے کرے گی تاکہ اسے ان درندوں سے نجات مل سکے۔ ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ ٹارچ کی روشنی پھیل گئی۔ روشنی دیکھتے ہی وہ چیخیں دیکھو یہ وہی درندے ہیں جو میری تلاش میں اوجھڑ آئے ہیں۔ ان لوگوں کو ہر قیمت پر اوجھڑ آنے سے باز رکھنا ہے۔ پھر اس نے بڑی تیزی سے چٹی سے کچھ گولیاں نکالیں۔ ایک بددوق اور یہ چٹی میرے حوالے کی اور کہا، یہ لوگ تعداد میں دس پہرہ دار سے کم نہیں ہیں، تم ایسا کرو کہ اس جگہ سے ان پر فائر کرو۔ میں کسی قدر قاصلے پر مورچہ بنا کر ان درندوں پر فائر کرتی ہوں۔ ”یہ کہہ کر میں نے ایک گہری سانس لی اور ان لوگوں سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ”مگر وہ مجھے آپ لوگوں سے الجھا کر اور کچھ دے کر بھاگ گئی۔ مجھے تو اس منکار لڑکی کا نام تک نہیں معلوم۔“

میں نے ایک ہی سانس میں من گھڑت کمائی موزوں کر کے انہیں سنا دی... اس ہونہار شاگرد کی طرح جو اپنا سبق فر فر سنا تا ہے۔ میں نے کسی کو بھی مداخلت نہیں کرنے دی تھی۔ ان سب نے میری کمائی بڑے غور سے سنی تھی۔

میں نے صابر اور اس کے لیڈر کا بشرہ بچانا۔ انہیں میری کمائی پر جیسے یقین آگیا تھا۔ یقین نہ کرنے والی بات ہی نہیں تھی۔ صابر فوراً بول اٹھا۔ ”تم بڑے جارحانہ انداز میں گولیاں چلا رہے تھے۔ ہم میں سے اگر کوئی مر جاتا تو... ہم اس کے گھروالوں کو کیا جواب دیتے؟“

”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ میری عزت و آبرو کے دشمن ہیں۔ کئی روز سے مجھے پریشان کر رہے ہیں... لہذا ان میں سے کوئی بھی بچ کر جانے نہ پائے۔ بس پھر کیا تھا، اس کی باتوں میں آکر میں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم جیسا شخص ایک حسین لڑکی کے قریب میں بھی آسکتا ہے۔“

”وہ لڑکی ایسی زہد شخص تھی کہ میں اس کے ظلم کا اسیر ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ چند لمحوں تک اپنی جمیل جیسی آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکتی رہی تھی۔ مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ اس نے مجھے چھٹا کر دیا تھا۔“

”تم لوگ باتوں میں اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔“ ان لوگوں میں سے ایک شخص جس کے چہرے سے خباثت نکلتی تھی دھنسا... ”بچ کر بولا۔ وہ تقریباً پچاس سال کا تھا۔ پہلے اس لڑکی کو جا کر تلاش کرو۔ کہیں ایسا نہ

”چلتے چلتے لیڈر نے پوچھا۔ ”کیا تم اس تنظیم میں نئے نئے داخل ہوئے ہو؟“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کس کے توسط سے آئے ہو؟“

”عالیہ کے۔“

”تم نے حویلی میں رنگینیوں سے کوئی لطف نہیں اٹھایا۔ عالیہ نے تمہیں کوئی ساتھی فراہم نہیں کی؟“

”میرا مطیع نظر عیاشی نہیں ہے۔ میں تو ایک خاص جذبے کے تحت اس تحریک کو آگے بڑھانا چاہتا

ہوں۔“

”بہت خوب۔ شاباش۔“ اس نے میری باتوں سے متاثر ہو کر میری پیٹھ چھکی۔ ”ہماری تنظیم کو تم جیسے

فلسفہ ساتھیوں کی ہی ضرورت ہے مگر کیا کریں آج کل کے فوجیوں میں بڑی بے حسی ہے۔ جب تک انہیں کوئی

لاالچ نہ دیا جائے وہ آگے نہیں بڑھتے۔ اسی لیے تو ہمیں ہر سال حویلی میں جشن کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ تنظیم میں

شامل لڑکیوں کو ان لڑکوں... ”لیڈر چونک پڑا اور اس کا جملہ اوجھڑا رہ گیا۔ کچھ دور سے ناگوں کا جوڑا گزر رہا تھا۔ یہ

دونوں سیاہ رنگ کے تھے اور کافی لمبے تھے۔ ان ناگوں کو دیکھ کر میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ فضل میرا بازو پکڑ کر

کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں بھی کپکپاہٹ تھی۔ سانپ کی دہشت بھی بری ہوتی ہے۔

ناگوں کا جوڑا تیزی سے گزر گیا۔ ہم تینوں تیز رفتاری سے چلتے ہوئے جنگل سے نکل کر ایک میدان میں

آگئے۔ جنگل سے نکلنے ہی میری جان میں جان آئی۔

کوئی نصف گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد دوری سے اسٹیشن کی عمارت نظر آنے لگی۔ یہ دیکھ کر میرا

دل خوشی سے اچھل پڑا کہ اسٹیشن پر مسافر گاڑی کھڑی ہے۔ یہ گاڑی کہاں سے آئی ہے اور کہاں جا رہی ہے اس

سے مجھے کوئی مطلب نہیں تھا۔ میرے لیے تو یہ ایک سنہرا موقع تھا کہ ٹرین میں سوار ہو جاؤں اور یہاں سے نکل

جاؤں۔

جب اسٹیشن نصف فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تب میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا، ہر طرف سناٹا تھا، ویرانی

تھی، دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اچھی طرح سے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد لیڈر کی بندوق ایک

دم سے چھپتی تو اس نے ششدر ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں نے ان دونوں کو زد میں لیتے ہوئے تیز لمبے میں

کہا۔ ”اگر سلامتی چاہتے ہو تو پلٹ کر فوراً بھاگنا شروع کر دو اور ناک کی سیدھ میں بھاگتے رہو۔ کسی نے پلٹ کر

دیکھنے کی کوشش کی تو میں اس کا پیچھا اڑا دوں گا۔ تم نے دیکھ ہی لیا کہ میرا نشانہ کتنا زبردست ہے۔“

وہ دونوں کبھی میری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے جا رہے تھے اور کبھی بندوق کی ٹیل کو، جیسے ان کے

سلنے کوئی آدی نہیں بلکہ کوئی عجوبہ کھڑا ہو۔ میں نے لیبلیسی پر انگلی رکھ کر حکمانہ اندازہ میں کہا۔ ”اجتہو، کیا تم

دونوں یہاں کی زمین کو اپنے خون سے رنگنا چاہتے ہو؟“

انہوں نے لیبلیسی پر میری انگلی دیکھی تو ان کی جیسے جان ہی نکل گئی۔ پہلے فضل گھوم کر بھاگا، پھر لیڈر۔

وہ دونوں بجٹ بھاگے جا رہے تھے جیسے کوئی حضرت حق کے تعاقب میں ہو۔ وہ دونوں نصف فرلانگ گئے ہوں گے

کہ میں نے دونوں بندوق کو قریبی جھانپوں میں پھینکا، پھر فوراً ہی مڑا اور اسٹیشن کی طرف دوڑا۔ ابھی میں نے

کوئی پچاس قدم کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ گاڑی نے سبلی بجلی، پھر دوسرے لمبے گاڑی نے حرکت کی اور آہستہ آہستہ

کے فاصلے پر ایک انتہائی خطرناک سانپ تھا۔ وہ درخت سے گرا تھا یا چاندنی رات میں اپنی ناگن کی تلاش میں نکلا

تھا۔ میں نے سنا تھا کہ سانپوں کو بھی چاندنی راتیں بڑی دقت پر محسوس ہوتی ہیں اور وہ اپنے بلوں سے نکل آتے

ہیں۔ وہ چمن کاڑھے اپنی زرد زرد آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کی لمبی اور چٹکی زبان نہایت سرعت سے بار بار

اندر باہر آ جا رہی تھی۔ اس کے تیز انتہائی خطرناک نظر آ رہے تھے۔ وہ حملہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

کسی بھی لمحے ڈس سکتا تھا۔ میرے لیے حرکت کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اگر میں اپنی جگہ سے ذرا

ی بھی حرکت کرتا تو وہ پلک جھپکتے میں ڈس سکتا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے جنبش کیے بغیر لیڈر سے کہا۔ ”فائر کیوں

نہیں کرتے؟“

وہ لمحے قیامت بن کر گزر گئے۔ لیڈر بھی اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا، جیسے وہ پتھر کا بن کر رہ گیا ہو۔ ادھر

میرے بھی پسینے چھوٹ رہے تھے لیکن میں نے اپنے حواس پر قابو پایا ہوا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں اپنی بندوق

اٹھالی، پھر اس کی طرف دیکھ کر شست باندھی۔ میں نے لیبلیسی پر انگلی رکھ کر دہلی تھی کہ ہاتھ کانپ گیا۔ یہ اچھا ہی

ہوا۔ اس لیے کہ چشمِ دون میں سانپ فضا میں اڑا تھا۔ یہ سانپ فضا میں اڑ کر حملہ کرنے والے سانپوں کی نسل

سے تھا۔ میرے بندوق کی گولی اس کے چمن کے نیچے پڑی تھی، جس نے اس کے پرچے اڑا دیے تھے۔ وہ کئی

حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے ٹکڑے زمین پر ترپتے رہے۔ یہاں تک کہ سرد پڑ گئے۔

میں نے گھوم کر لیڈر کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ وہ بے جان موتی کی طرح کھڑا تھا۔ اس

نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھرتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”بہت بہت شکریہ۔ تمہاری وجہ سے

ہماری جان بچ گئی۔ تم بہت اچھے نشانے باز ہو۔ یہ فن تم نے کہاں سے سیکھا؟“

”میرے چچا اسلحہ فروش ہیں۔ ان کی دکان بھلوار آباد میں ہے۔ وہ مجھے اکثر اپنے ساتھ شوٹنگ کلب بھی

لے جاتے تھے تاکہ وہاں رائفلوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا جاسکے۔ میں نے اس بے بسے بندوق چلانا اور نشانہ لگانا سیکھ

لیا۔“

”فضل...“ لیڈر نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اب چل پڑو۔ ذرا ہیشیار اور محتاط ہو کر چلنا۔ شاید ہمیں مزید

سانپوں سے بھی واسطہ پڑے۔“

”ہم اور اندر جا کر کیا کریں گے۔“ فضل کے حلق میں آواز پھنس رہی تھی۔ ”وہ لڑکی ادھر آنے سے تو

رہی۔ کیوں نہ ہم اسٹیشن کی طرف چلیں؟“

لیڈر نے ایک لمحے تک کچھ سوچا، پھر بولا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو، چلو اسٹیشن کی طرف چلتے ہیں۔“

میں نے فضل کی طرف بندوق بڑھائی۔ میں ایسا کر کے ان دونوں پر اپنا اعتماد بحال کرنا چاہتا تھا۔ فضل نے

بندوق لینے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو لیڈر نے مجھ سے کہا۔ ”اسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ جنگل میں

ڈاکوؤں اور سانپوں سے واسطہ پڑا رہتا ہے۔“ اس نے توقف کر کے اپنی جیب سے چار پانچ بندوق کی گولیاں نکالیں

اور میری طرف بوجھائیں۔ ”رائفل بھرو اور بقی گولیاں اپنی جیب میں رکھ لو۔“

میدان خود اپنے دام میں آ گیا تھا۔ ہم واپسی کے لیے پلٹ پڑے۔ یہ ان لوگوں سے بچ نکلنے کا سنہرا موقع تھا۔

مگر میں جلد بازی سے کام لیتا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ابھی ہم جنگل میں تھے اور ان کے ساتھی شکاری کتوں کی طرح

جنگل میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں کسی بھی لمحے ان کی نظروں میں آسکتا تھا۔

میں لبوس تھی۔ اس نے نقاب سے اپنا نصف چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ میں نے اسے آنکھوں سے پہچان لیا تھا۔

میں دکان کے اندر داخل ہو کر ایک ایسے گوشے میں کھڑا ہو گیا تھا جہاں سے اس کی حرکات و سکنات پر آسانی سے نظر رکھ سکتا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر کھڑی دوسری عورتوں کے ساتھ رہی کپڑے دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز اور حرکتیں وہی تھیں جو میں نے محبوب بخش مارکیٹ میں دیکھی تھیں۔ سلیزمن نے کاؤنٹر سے کھلے تھان سمیٹنے کے بعد اپنی پشت پر فرش پر ڈال دیسے جہاں ایک لڑکا کھلے ہوئے تھان تیزی سے لیٹا جا رہا تھا۔ کاؤنٹر پر ایک پرس، کپڑوں کے تھان کے بیچ سے نکل کر گر پڑا تو سلیزمن نے وہ برس اٹھا کر اتفاق سے نسرین سے پوچھا۔ ”یہ آپ کا پرس ہے؟“ نسرین کے ساتھ کھڑی اور بیٹھی لڑکیاں اور عورتیں دوسرے سلیزمن کی طرف متوجہ تھیں جو ایک نیا تھان کھول رہا تھا۔ اس تھان کے کپڑے کارنگ گلابی تھا۔ گلابی رنگ پر عورتیں اور لڑکیاں یوں بھی زیادہ مرقی ہیں۔ نسرین نے بغیر کسی تاخیر کے اس کے ہاتھ سے پرس اچک لیا جیسے ہی اس نے سلیزمن کے ہاتھ سے پرس لیا، ویسے ہی میں نے اس پرس کو نظروں میں تو لا۔

وہ پرس خاصا وزن پر محسوس ہو رہا تھا۔ اس قدر وزن پر پرس نوٹوں کی گڈیوں کا نہیں ہو سکتا تھا، البتہ اس میں زیورات ہو سکتے تھے یا پھر صرف سونا... اگر پرس نوٹوں سے بھرا ہوا ہوتا تو وہ یقیناً پھولا ہوا ہوتا۔ جب کہ پرس پھولا ہوا نہیں تھا۔ اس کے وزن کا اس طرح اندازہ ہوا تھا کہ جب نسرین نے سلیزمن کے ہاتھ سے پرس لیا تھا تو پرس نیچے کی طرف جھول گیا تھا۔ نسرین سلیزمن کے ہاتھ سے پرس لے کر مومنیت سے بولی۔ ”شکریہ!“

نسرین نے پرس لے کر نکالا۔ اس طرح سے کہ وہ اس کے برقعے میں چھپ گیا اور میری نگاہوں سے اوچھل ہو گیا۔ پرس لینے کے بعد اس کے سراپا میں اضطراب کی لہر اٹھی۔ وہ بے چین سی نظر آنے لگی۔ اس کی حالت ایک متوحش ہرنی کی سی تھی جو قلعہ نہیں بھرنے والی ہو۔ اس کے بشرے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب ایک لمحے کے لیے بھی یہاں رکنا نہیں چاہتی ہو۔ سلیزمن اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بڑے سکون سے بولی۔ ”مجھے کپڑے پسند نہیں آ رہے ہیں۔ زحمت کا شکریہ۔“

وہ دکان سے نکل کر مارکیٹ کی گلی میں تیزی سے اس بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی جو رابنسن روڈ پر تھا۔ اس گلی میں دوردیہ کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ ہر دکاندار نے اسٹول اور بینچیں ڈال رکھی تھیں جس سے راستہ اور تنگ ہو گیا تھا۔ آمد و رفت میں رش کی وجہ سے دشواری ہوتی تھی اور ایسی ہی دشواری نسرین کو بھی ہو رہی تھی۔ میں نسرین کے تعاقب میں لپکا تو مجھے اس سے زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے کہ اس گلی میں آمد و رفت عورتوں اور لڑکیوں کی تھی۔ مرد اکا دکا ہی نظر آ رہے تھے۔ نسرین تو خیر عورت ذات تھی وہ عورتوں اور لڑکیوں کو دھکا دیتی اور انہیں دھکیلتی ہوئی جا رہی تھی۔ جب کہ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میں اگر نادانستگی میں کسی عورت سے ٹکرا جاتا، چاہے وہ پچاس برس کی ہی کیوں نہ ہوتی تو مجھے بری طرح لڑو دیتی۔

ریٹگنا شروع کر دیا۔ میں نے اور تیز دوڑنا شروع کر دیا۔ گاڑی اور مجھ میں فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر گاڑی کی رفتار میں تیزی آگئی۔ میں نے سر پر چیر رکھ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ اس گاڑی کے چھوٹنے کا یہ مطلب... تھا کہ میں دشمنوں کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتا تھا اور ان کے ہتھوں میں پھنس سکتا تھا۔

آخری ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا گاڑی چھوٹ گئی۔ میں بمشکل تمام آخری ڈبے تک پہنچ سکا تھا، مگر اس پر سوار نہ ہو سکا تھا۔ پھر بھی اس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ آخر تھک ہار کے رک گیا۔ میری سانسیں پھول رہی تھیں۔ اور میں ناامیدی کے جنور میں پکارا رہا تھا۔

میں رک کر بڑی حسرت سے جاتی ہوئی ٹرین کو دیکھتا رہا۔ پھر تو گویا مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ ٹرین کی رفتار اچانک دھیمی پڑ گئی اور وہ رکنے لگی۔ اب اس کے اور میرے درمیان کوئی فرلانگ بھر کا فاصلہ تھا۔ ٹرین نہ معلوم کس بنا پر رکی تھی مگر میں اسے مجھڑی سمجھوں گا۔ میں نے اس پستخان کو حل کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور بگٹ بھاگا۔ جب میں ٹرین کے پاس پہنچا تو اس کے انجن نے ہارن دیا اور ٹرین نے ریٹگنا شروع کر دیا۔ میں دروازے کا ڈنڈا پکڑ کر سوار ہو گیا اور فٹ بورڈ پر چیر رکھ کر دروازے کا پینڈل گھمانے لگا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد دروازہ کھل گیا۔

کپار ٹنٹ کے اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ عوامی کلاس کا ریزرو کپار ٹنٹ ہے۔ کپار ٹنٹ میں مسافر نہ صرف برقع اور سیٹوں پر لیٹے ہوئے سو رہے تھے بلکہ فرش پر اور بیت الخلا کے پاس، باہر فرش پر بستر بچھائے بھی پڑے تھے۔ کھڑکی کے پاس دلی سیٹ پر ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ اس کے سامنے والی سیٹ خالی پڑی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہاں بیٹھ جاؤ؟“

”بیٹھ جاؤ سائیں۔“ اس شخص نے بیڑی منہ سے نکل کر جواب دیا۔ ”اس سیٹ کا آدمی فرش پر سو رہا ہے۔ صبح ہونے تک چاہو تو ادھر ہی بیٹھو۔“

میں نے سیٹ پر بیٹھ کر اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ گاڑی تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ کچھ خیال آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”چاہا۔ کمال جا رہے ہو؟“

”کراچی۔“ اس نے بیڑی کا آخری کش لے کر کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ ”تم کہاں جاؤ گے سائیں؟“

”میں بھی کراچی جا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

میں نے نواب شاہ اسٹیشن پر ٹی ٹی کو پکڑ کر ٹکٹ بنوایا۔ کراچی پہنچ کر میں نواب صاحب کے ہاں جانے کی بجائے سید صالحہ گھر پہنچا۔ تاکہ نہادھو کر اور کپڑے تبدیل کر کے ان کی خیر خیریت معلوم کروں۔ دیکھوں کہ قرۃ العین بچتی ہے یا نہیں۔ میں ہاتھ روم سے نکلا تو دیکھا کہ جی ایک عیسیٰ سے اتر رہا ہے۔ عیسیٰ کی پچھلی نشست پر کوئی عورت تکی برقعے میں بیٹھی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس میں قرۃ العین موجود ہے۔ قرۃ العین کو خیریت و عافیت کے ساتھ دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہوئی، اس کا اندازہ لگانا محال ہے۔ جی اس لیے قرۃ العین کو یہاں لے آیا تھا کہ

قرۃ العین میرے بارے میں فکر مند تھی، بے چین تھی۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں یا نہیں مجھے دیکھ کر وہ عیسیٰ سے اتر آئی۔ عیسیٰ کا کرایہ اوار کے میں قرۃ العین کو اپنے گھر میں لے آیا۔ بیڑیاں چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ قرۃ العین کو کہاں بٹھاؤں۔ یہ گھر کسی طرح اس کے لائق نہیں تھا۔ گو میری آمدنی بے پناہ تھی۔ مگر میں نے، انتہ اپنے گھر اور لباس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بس بے فکری اور لالچالی پن کے اندر

لڑکی نے فوراً ہی جواب نہیں دیا اس لیے کہ اس کا گلارندہ گیا تھا... پھر وہ بولی تو اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ ”ہم لوگ گھر سے پرس لے کر چلے آئے تھے اور ٹیکسی سے آئے تھے اور اس دکان پر اترے تھے۔ دکان میں داخل ہو کر پرس سے فہرست بھی نکالی تھی۔“

”پرس میں کیا تھا؟“

”اس میں ایک سو تو لے خالص سونا تھا جو ہم زیورات بنانے کے لیے جیولر کی دکان پر دینے جا رہے تھے اور چھبیس ہزار کی رقم تھی جو پانچ پانچ سو کے نوٹوں کی شکل میں تھی۔ ہم لوگ شادی کی خریداری کرنے نکلے تھے۔“

”سو تو لے خالص سونا اور چھبیس ہزار کی رقم...“ سرگوشیوں سے فضا میں بھنبھناہٹ سی پیدا ہوئی۔

”کس کی شادی ہو رہی تھی؟“

”میری اور میری چھوٹی بہن کی۔“ لڑکی نے کسی قدر تذبذب کے بعد جواب دیا۔ ”میرے دو بھائی جو سعودی عرب میں ملازمت کرتے ہیں ان کی برسوں کی کمائی تھی اور اس میں میرے والد کی کمائی بھی شامل تھی۔“ لڑکی کی آنکھیں چمک چمک پڑیں۔

وہ سبز زمین خاموش کھڑا تھا جس نے پرس اٹھا کر نرسن کے حوالے کیا تھا۔ اگر وہ کچھ کہتا تو مفت میں مارا جاتا۔ غلطی اس کی بھی نہیں تھی۔ تاہم اس نے کہا۔ ”ایک حسین سی لڑکی کالے برقعے میں کھڑی تھی۔ اس نے نقاب سے اپنا آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ شاید یہ حرکت اسی کی ہے۔ اس لیے کہ وہ خریداری کے بغیر چلی گئی۔“

لڑکی کی ماں وحشت زدہ انداز میں پیچھے اور چلانے لگی۔ ”کہاں ہے وہ لڑکی؟ چلو... جلدی کرو“ اسے جاکر فوراً پکڑ لو۔ جانے نہ پائے... دوڑو، بھاگو... میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔“

میں نے اس عورت کو بتایا۔ ”کالے برقعے والی لڑکی شاندار قسم کی کار نہیں بیٹھ کر فرار ہو گئی۔“

”اس...“ کئی ایک عورتوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں۔

”وہ چور لڑکی کار میں آئی تھی۔“ اس عورت نے چونک کر کہا۔

دکاندار، لڑکیاں اور عورتیں، ماں بیٹی اور ساتھ والی عورتوں کو مشورہ دے رہے تھے کہ وہ قریبی قحطی میں جا کر فوراً اس واقعے کی رپورٹ درج کرا دیں۔ لڑکی کی ماں ابھی پوری طرح حواس میں نہیں آئی تھی۔ اس کا مؤلف دماغ سوچنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس کی حالت ابھی تک دگرگوں تھی۔ وہ اب تک ہڈیاں بک رہی تھی۔ اس نوجوان لڑکی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ موتی گر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ رقم بھی کم نہ تھی اور پھر سونا تو لاکھوں روپے کی مالیت کا تھا۔ ادویہ عمر کی اس عورت نے لڑکی کی ماں کے ساتھ والی عورت سے پوچھا۔ ”ان دونوں بہنوں کی شادی کب ہے؟“

”۱۲ جنوری کو۔“

اس لیے کہ شہروں کی بوڑھی عورتیں اپنے آپ کو جوان العمر سمجھتی ہیں۔ لہذا میں عورتوں کے رخ سے چپتا بچاتا اس کا تعاقب کرتا رہا... جس وقت میں بیرونی دروازے پر پہنچا، میں نے اسے سرخ رنگ کی ٹیوٹا کرولا میں دیکھا جو بالکل نئی تھی اور اس روز کی کار سے مختلف تھی۔ گویا نرسن کے پاس ایک نہیں کئی کاریں تھیں۔ وہ کار کوئی سو دو سو قدم کے فاصلے پر تھی۔

میں اس کی کار کی طرف لپکا مگر اس نے جس انداز سے کار اسٹارٹ کی اور اسے سڑک پر لے آئی اس میں جلالت کا انداز شامل تھا۔ اس نے اس طرح اپنی کار کی رفتار تیز کی تھی جیسے پولیس اس کے تعاقب میں ہو۔ اس کے پیہیے جیخنے لگے اور اس نے ایک غالی رکشے کو بھی ٹکرائے دی۔ تھی جو سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ اس کا ڈرائیور دی بڑے کے تھیلے والے کے پاس کھڑا دی بھلے کھا رہا تھا۔ جتنی دیر میں وہ پہنچا، نرسن کی کار یہ جا اور وہ جا۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی مگر میں نے کار کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔

میں واپس دکان پر آیا تو وہاں ایک کمرام سا چا ہوا تھا۔ وہ عورت کسی ڈاکٹر کی بیوی نہ تھی جس کے اعصاب مضبوط ہوتے اور اس کا شوہر کسی ڈاکٹر کی طرح دولت مند تو تھا نہیں جو وہ عورت اپنے گھروفن کر کے مزید رقم منگوا لیتی۔ وہ عورت دکان میں بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور وہ کسی مردے سے بھی بدتر نظر آ رہی تھی... بے ہوشی کی حالت میں بھی اس کی ایسی کیفیت ہو رہی تھی جیسے اس کا دم ٹوٹ گیا ہو۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی اور دو عورتیں بھی تھیں۔ لڑکی کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے سے بھی سفیدی بھلک رہی تھی۔ مگر وہ خود پر قابو پانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ساتھ والی دونوں عورتوں کے چہرے بھی قحط ہو رہے تھے۔ اس عورت کو ایک بیچ پر لٹا دیا گیا تھا۔ وہ لڑکی گلوگیر آواز میں اس عورت کا شانہ ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی۔ ”ای... ای...“

دوسرا سبز زمین جلدی سے ایک گلاس پانی لایا۔ دکان کا مالک باہر کھڑی عورتوں اور مردوں سے دکان کے سامنے سے ہٹ جانے کو کہہ رہا تھا۔ لوگ تھے کہ لٹ سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے پانی لے کر ہاتھ سے بے ہوش عورت کے منہ پر چھینٹے مارے تو چند لمحوں بعد اس کے بدن میں حرکت ہوئی، پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں تک وہ غالی الذہن باری باری سب کے چہروں کو سمجھتی رہی، پھر وحشت زدہ سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی اور ہڈیانی انداز میں چیخیں۔ ”میرا پرس... ہائے میرا پرس!“

وہ بین کرنے لگی تو میں نے ساتھی عورت کی طرف گلاس بڑھا کر کہا۔ ”انہیں پانی پلا دیں۔“

اس عورت نے میرے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے لیا پھر ان دونوں عورتوں نے اس بے حال عورت کو سارا دے کر اٹھایا... اور اسے پانی پلانے لگیں۔ ایک ادویہ عمر کی عورت نے جو پاس ہی کھڑی تھی اس نوجوان لڑکی سے پوچھا۔ ”تمہیں ابھی طرح یاد ہے کہ تمہاری امی پرس ساتھ لائی تھیں؟“

”آپ لوگ کہاں رہتی ہیں؟“

”فیڈرل بی ایریا پندرہ نمبر میں۔“ لڑکی نے سکیوں کے درمیان بتایا۔ ”میرے والد عبدالغنی صاحب ہیں۔ وہ ایک انشورنس کمپنی میں ملازمت کرتے ہیں۔ وہ سنیں گے تو معلوم نہیں ان کی کیا حالت ہوگی؟“

میں دکان سے نکل آیا۔ لڑکیاں اور عورتیں، ماں بیٹی کے دکھ درد میں برابر کی شریک تھیں اور ان سے طرح طرح کے فضول سوالات کیے جا رہی تھیں۔ اب مجھے لڑکی کے باپ کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ فیڈرل بی ایریا پندرہ نمبر گوہر بست بڑا علاقہ تھا مگر میں پھر بھی اس گھر کا پتہ چلا سکتا تھا۔ اس لیے کہ آنا پتا میرے پاس آگیا تھا مگر میں اس گھر میں خالی ہاتھ داخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ ہر قیمت پر رقم اور سونا نسرین سے حاصل کر کے رہوں گا۔ اس گھر کی خوشیاں لوٹا کر مجھے دلی سکون حاصل ہو سکتا تھا۔

گاڑی کا نمبر تو میرے ذہن پر نقش ہو گیا تھا، مگر اس گاڑی کو تلاش کرنا اس قدر آسان نہیں تھا۔ نسرین کہاں رہتی ہے، وہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ رکشا والے نے اس روز جو نسرین کے بارے میں بتایا تھا میں اس پتے پر پہنچ کر نسرین کو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ بھی فیڈرل بی ایریا میں رہتی ہو۔ معلوم نہیں وہ کس کس محلے، علاقے اور بازاروں میں جا کر کیسی کیسی وارداتیں کرتی پھرتی تھی۔

نسرین نے یہ تین سو اتھن لاکھ کا ہاتھ مارا تھا، اس کا جواب نہیں تھا۔ وہ شاید ہمیشہ ہی اونچا ہاتھ مارتی رہتی تھی۔ ایک طرف تو میں اس کی کامیابی پر عیش عیش کر رہا تھا تو دوسری طرف ان دو معصوم لڑکیوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہا تھا، جنہیں برباد کرنے میں نسرین نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

مجھے جلد سے جلد یہ غی مم سر کرنا تھی۔

میں گھر پہنچا تو جی میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے سارا واقعہ سنایا تو وہ بولا۔ ”نسرین تو واقعی ایک بلا ہے۔“

”ایک حسین، ذہین اور جوان لڑکی اپنے کارناموں سے سارے شہر میں دھوم مچاتی پھر رہی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس کے پر کیوں نہ کاٹ دوں تاکہ وہ آزادانہ ادھر سے ادھر نہ پرواز کر سکے۔“

”نسرین کے پر کاٹنا اس قدر آسان نہیں ہیں۔“ جی بولا۔ ”یورپ کی جدید ترین جیلوں میں تربیت پا کر آئی ہے۔“

”وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے اس کے ٹھکانے کا پتہ چلے۔“

”اس کی ایک ہی صورت ہے کہ کسی کار میں بیٹھ کر بازاروں کے چکر لگائیں جب کہیں وہ نظر آئے تو اس کا تعاقب کیا جائے۔ اس وقت تک اس کا تعاقب کیا جائے جب تک وہ اپنے گھر نہیں پہنچ جاتی۔“

”ہاں یہی ایک صورت ہے جس سے ہم اس کے گھر کا پتہ چلا سکتے ہیں۔“

”اور آپ کو اپنا میک اپ بھی کروانا ہو گا تاکہ نسرین پہچان نہ سکے۔“

”میک اپ بھی ہو جائے گا۔“

میں رات بھر سو نہیں سکا تھا۔ میرے سینے میں پھانس ہی چبھ کر رہ گئی تھی جیسے مجھ سے کوئی مجسمہ سرزد ہو گیا ہو، ماں اور بیٹی کے غم زدہ چہرے میرے دل پر آزیانے لگاتے رہے تھے۔

سویرے سویرے جی آگیا۔ ہم دونوں عقل کے ہاں پہنچے۔ اس سے میک اپ کروایا، پھر ایک کار ڈیڑھ کے پاس رکھی۔ وہ جی کا دوست تھا۔ جی نے اس سے کار کرائے پر لی۔ کار لے کر ہم دونوں سہ پہر تک بوہری بازار، طارق روڈ، گلشن اقبال اور ناظم آباد کے بازاروں کے چکر لگاتے رہے... کہ شام کے وقت زہی پر نسرین نظر آئی۔ وہ تھیں قسم کی ساڑھی پہنے ہوئے تھیں۔ ساڑھی سفید تھی۔ بلاؤز بھی سفید تھا۔ گلے میں سفید موتیوں کا پار پڑا تھا۔ اس نے جوڑا باندھا ہوا تھا۔ وہ ایک پروکار خاتون لگ رہی تھی۔ وہ ہنڈا کار چلا رہی تھی۔ نئے ماڈل کی یہ قیمتی گاڑی دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ وہ روزی ایک نئی گاڑی میں نئے انداز میں اور نئے روپ میں نظر آتی تھی۔ وہ اندھیرا ہونے تک شہر کے مختلف بازاروں کے چکر لگاتی رہی۔ جیسے اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ پرورش پا رہا ہو۔ اور اس منصوبے کی روشنی میں وہ جائزہ لیتی پھر رہی ہو۔ اس منصوبے پر جیسے کل کسی وقت عمل کرنے والی ہو۔

جب رات کی تاریکی گہری ہو گئی تو اس نے کار کا رخ ڈیفنس سوسائٹی کی طرف موڑ دیا۔ اس نے ڈیفنس سوسائٹی کی ایک سٹنان گلی میں کار پارک کی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی سڑک پر آگئی۔ ایک خالی ٹیکسی کو اشارے سے روکا۔ جب وہ رک گئی تو اس پر سوار ہو گئی۔ پھر اس نے گلشن اقبال کے دو سو چالیس گز پر بنے ہوئے ایک بنگلے کے سامنے ٹیکسی رکوائی۔ اس کے اندر چلی گئی اور رات بارہ بجے تک باہر نہیں نکلی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہی اس کا گھر ہے۔ ایک عقدہ یہ کھلا کہ وہ کاریں چوری کرتی ہے۔ سیر و تفریح اور واردات کے بعد کسی گلی میں چھوڑ دیتی ہے۔

دوسرے دن صبح دس بجے میں اور جی گلشن اقبال پہنچے۔ جی تو منصوبے کے مطابق ہوٹل میں جا بیٹھا۔ میں نسرین کے بنگلے پر پہنچا۔ رات میں اس کے بنگلے کا جائزہ ٹھیک سے نہ لے سکا تھا۔ دن میں دیکھا تو اس کا بنگلا بہت خوب صورت نظر آیا۔ یہ بنگلا نہ چھوٹا تھا نہ بڑا... طرز تعمیر مغربی انداز کی تھی۔ احاطے میں کوئی کار نظر نہیں آئی۔ البتہ ایک طرف گیراج دکھائی دیا۔ اس کے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ گویا کار اندر موجود تھی۔ شاید اس نے اپنی کار گیراج میں اس لیے بند کی ہوئی تھی کہ کوئی اسے شناخت نہ کر لے۔ اس نے جامع کلاتھ مارکیٹ میں جو واردات کی تھی، وہ معمولی نہ تھی۔ یقیناً اب وہ اس اندیشے کا شکار تھی کہ اسے کسی نے واردات کرتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہو۔

بنگلے کے برآمدے میں سناٹا طاری تھا۔ کوئی چوکیدار یا نوکر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں اور پردے لہرا رہے تھے۔ میں نے چھوٹا گٹ دیکھا جسے آنکھ سے

آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے۔ آپ کس لیے آئے ہیں؟“
 ”تمہارا نام تمہاری طرح خوبصورت ہے۔“ میں نے رسیلے لیے میں کہا۔ ”اور تم بڑی حد تک فلتسار جنم سے مشابہ ہو۔“
 ”آپ نے اپنا نام اور تشریف آوری کا مقصد نہیں بتایا؟“ وہ میرے منہ سے تفریق سن کر نال ہو گئی۔

”تمہاری بیگم صاحبہ مجھ سے واقف ہیں۔ مگر انہوں نے آج تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم اس قدر حسین ہو۔ ویسے وہ اس وقت کیا کر رہی ہیں۔ کیا ابھی تک سو رہی ہیں؟“
 حسن کی تشریف عورت کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ وہ میری زبان سے تفریق کلمات سن کر اور خوش ہوئی۔ اس نے جاتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہاتھ روم میں ہیں۔ نصف گھنٹے بعد ہی کمرے سے نکلیں گی۔“

”حاصل کے بعد اتنی دیر تک کمرے میں کیا کرتی ہیں؟“
 ”وہ میک اپ وغیرہ کر کے ناشتے کی میز پر آتی ہیں۔ میک اپ کرنے اور کپڑے بدلنے میں اتنی دیر لگ ہی جاتی ہے۔“

”کیا تم دروازے میں کھڑے کھڑے باتیں کرتی جاؤ گی اندر لے جا کر نہیں بٹھاؤ گی؟“
 ”اوہ“ صاف سمجھنے لگا۔ ”وہ چونک کر بولی۔ پھر اس نے ایک طرف ہٹ کر اندر جانے کا راستہ دیا۔“ آپ تشریف لائیں۔“

میں نے اس کے قریب سے گزرتے کہا۔ ”نوی“ تمہیں تو ٹیلی ویژن پر جا کر اپنی قسمت آزمائی کرنا چاہیے۔ تمہاری شادی ہو چکی ہے؟“
 اس نے نظریں نیچی کر لیں اور حیا آلودہ لہجے میں کہا۔ ”جی نہیں۔“
 ”تم اپنا وقت کیوں برباد کر رہی ہو؟ جاؤ اور جا کر اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔“
 ”میں کسی دن بیگم صاحبہ سے چھٹی لے کر ٹیلی ویژن اسٹیشن پر جاؤں گی۔ آپ کہتے ہیں تو میں قسمت آزمائی کر کے دیکھوں گی۔“ وہ بولی۔

میں اس کی رہنمائی میں ایک بڑے کمرے میں پہنچا۔ جسے نشست گاہ بنایا گیا تھا۔ نشست گاہ آرائش و زیبائش کے قیمتی لوازمات سے آراستہ و بھراستہ تھی۔ ڈیکوریشن کی بہت سی قیمتی چیزیں دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ سرین انہیں دکاؤں سے اڑا کر لائی ہے۔ اس نشست گاہ کی دل فریبی بڑھانے کے لیے اس کمرے کے چاروں کونوں میں پینل کے اسٹینڈ موجود تھے جس میں بڑے بڑے کلمے رکھے تھے۔ ان کلموں میں پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے، جن کی نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ سرین کو شاید پھولوں سے عشق تھا۔ نوی نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہاں تشریف رکھیں۔ میں بیگم صاحبہ کو آپ کی آمد کی اطلاع کرتی ہوں، ہاں تو آپ نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟“

”تم نے مجھے اپنا نام بتانے کا موقع ہی کب دیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم بیگم صاحبہ سے

بند کیا ہوا تھا۔ میں نے آکڑا نکالا تو چھوٹا گیت کھل گیا۔ اس کی کندھی نہیں لگی تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر گیت آنکڑے سے بند کیا۔ پھر گیراج کے پاس پہنچ کر اس کے دروازے کا جائزہ لیا۔ وہ لکڑی کا تھا اور اس میں کئی جگہوں پر جھریاں بنی ہوئی تھیں۔ ان جھریوں میں ایک سرخ رنگ کی ٹوپوٹا کار جھانک رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ کار بھی چوری کی نہ ہو۔ ممکن ہے اس نے اس لیے گیراج میں بند کر رکھی ہو۔ میں نے جھریوں میں سے جھانک کر اس کا نمبر دیکھا۔ یہ وہی کار تھی جس میں سرین دو روز پہلے واردات کر کے فرار ہوئی تھی۔

میں نے برآمدے میں پہنچ کر اطلاعی کھنٹی کے بٹن پر اپنی انگلی رکھ دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ سرین مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑے گی۔ اس پر سکتہ طاری ہو جائے گا۔ اسے یقین ہی نہیں آئے گا کہ میں کسی بلائے نامگانی کی طرح نازل ہو سکتا ہوں۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ سرین کی بجائے کسی اور ہی لڑکی کا سراپا ابھرا۔ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے وہ ملازمہ لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت زیتونی تھی۔ وہ کوئی بے حد حسین و جمیل لڑکی نہ تھی، مگر میں نے اس میں دل کشی اور عجیب سی کشش محسوس کی۔ اس کا گداز، دلکش سراپا اور جیتھے نقش و نگار کسی کو بھی متاثر کر سکتے تھے اور میں متاثر ہو رہا تھا۔

جیسی ماکنن تھی ویسی ہی خامدہ بھی۔ فرق صرف عمر، رنگت اور حیثیت کا تھا۔ وہ شوخ و چنچل سی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے مجھے شوخ نظروں سے دیکھا تو میں مسکرا دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”بیگم سرین ترمذی ہیں؟“
 ”وہ کسی کی بیگم نہیں ہیں۔“ اس نے لہجہ جواب دیا۔ ”اس کا نام مس سرین ترمذی ہے۔“

”تو تم بھی مس ہی ہو گی... کیوں؟“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”ماکنن مس ہو تو... ملازمہ بھی مس... تو اس گھر میں مس ہی مس، کیوں مس؟“
 حیا سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ وہ پلکیں جھپکا کر بولی۔ ”آپ نام بتا دیں تو میں بیگم صاحبہ کو بتا دوں۔“

”مگر تم نے تو کہا تھا کہ وہ کسی کی بیگم صاحبہ نہیں ہیں۔“ میں نے شرارت کے انداز میں اسے چھیڑا۔

”وہ کسی اور کی نہیں بلکہ میری بیگم صاحبہ ہیں۔“ وہ برجستہ بولی۔ ”میں انہیں بیگم صاحبہ کہہ کر بلاتی ہوں۔“

”اچھا تو تمہاری بیگم صاحبہ کے بھائی کہاں ہیں۔ ان کے بھائی جان؟“
 ”بھائی جان، ان کے کزن ہیں۔ وہ یورپ گئے ہوئے ہیں۔ ویسے وہ زیادہ تر باہر ہی رہتے ہیں۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”نوی...“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ کچھ سوچ کر سر اسید ہی ہو گئی۔ ”مگر

نہیں ملا تو دو محسوم لڑکیوں کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ ان لڑکیوں کے ماں باپ صدے سے پاگل ہو جائیں گے۔“

”تمہیں یقیناً غلط فہمی ہو رہی ہے سکندر!“ اس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ”میں دو دن سے تو گھر سے باہر ہی نہیں نکلی۔ میں گھر پر ہی آرام کر رہی ہوں کیا ضروری ہے کہ میں نے اس پرس پر ہاتھ صاف کیا ہو۔ کیا اس شہر میں میں ہی ایک چور ایسی ہوں؟“

”تم دنیا کو بے وقوف بنا سکتی ہو“ سکندر کو نہیں... میں نے کہا۔ ”میں تمہیں بچانے میں غلطی نہیں کر سکتا اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے جھوٹ کا پلندا تمہارے ہی منہ پر دے ماروں تو سنو۔ تم پر سوں سرخ رنگ کی ٹوپوٹا کر دلا میں جامع کلا تھ مارکیٹ آئی تھیں۔ جس کا نمبر میں نے دیکھا... کرڈہن نشین کر لیا۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے تمہارا کیراج بھی دیکھ لیا ہے، جہاں وہ ٹوپوٹا کر دلا موجود ہے، جس میں بیٹھ کر تم فرار ہوئی تھیں۔ یہ وہ گاڑی ہے جو تم نے جامع کلا تھ مارکیٹ میں واردات کرنے سے نصف گھنٹہ پہلے دکنوریہ روڈ سے چوری کی تھی۔ جس کا نمبر کل کے اخبارات میں آچکا ہے اور خبر بھی چھپ چکی ہے۔ تم نے کل ایک ہنڈا کارڈ چوری کی اور اسے رات کے وقت ڈیفنس سوسائٹی کی ایک سہنان گلی میں چھوڑ دیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر آ گئیں۔ کیا یہ سب غلط ہے؟“

نسرین پر سکندر سا چھا گیا۔ وہ ششدر ہو کر چھٹی بچی نظروں سے بچھ دیکھنے لگی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ”تم یقیناً کوئی بدروح ہو سکندر جو میرے نقاب میں سائے کی طرح لگے رہے ہو۔ مگر میری ایک بات مان لو کہ اس پرس میں نہ تو رقم تھی اور نہ ہی سونا۔ اس عورت نے یقیناً جھوٹ بولا تھا۔“

”وہ عورت جھوٹ نہیں بول سکتی۔ جھوٹ تم بول رہی ہو۔“

”اس لیے کہ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ جھوٹی عورت کبھی بے ہوش نہیں ہوتی ہے۔“

”تم یقین کرو۔ اس پرس میں سو ڈیڑھ سو کی رقم اور میک اپ کے سامان کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ تم وہ رقم اور سونا لے کر میرے ساتھ چلو اور اس عورت کو واپس کر دو۔ میں دوسروں کے سامنے اس کا انکشاف نہیں کروں گا کہ یہ تمہارا کارنامہ ہے۔“

”اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے تو تم جاؤ اور پولیس کو بلا کر لے آؤ۔ میں ان گیدڑ بچکیوں میں آنے والی نہیں ہوں۔“ اس نے بے خوفی سے کہا۔

”چلو یو سی سی۔ میں پولیس کو لے آتا ہوں۔“ میں نے گنہگار لہجے میں کہا۔

”پولیس ٹھوس ثبوت مانگتی ہے۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟“

”لائقوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔“ میں نے خشونت سے کہا۔ ”میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہے، اسی لیے تو میں پولیس کو لینے جا رہا ہوں۔ انہیں جرم کا اقرار کرانے کے بہت سے

صرف اتنا کہ دینا کہ آپ کے بہت قریبی دوست آئے ہیں۔ اس طرح ذرا الحلف آئے گا۔ وہ کمرے سے جلد ہی نکل آئیں گی اور انہیں تجسس بھی ہو گا کہ کون ہے۔“

جانے سے پہلے وہ تپائی کے نیچے سے چند رسائل نکال کر میرے سامنے ڈال گئی۔

جب میں تپائی پر سے ایک قلمی رسالہ اٹھا رہا تھا تب میری نظر معا سامنے والی دیوار پر پڑی جہاں ایک بڑے سے فریم میں نسرین کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ بغیر آستین کے بلاؤز اور ساڑھی میں لبوس تھی۔ لباس گہرے اودھے رنگ کا تھا جس سے اس کا حسن دوپلا ہو رہا تھا۔

کوئی دس منٹ کے بعد نوی نمودار ہوئی۔ وہ نرالی دھکیلتی ہوئی آئی تھی۔ اس نرالی میں چائے اور ناشتا تھا۔ نسرین کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس کے گھر کون مہمان آیا ہوا ہے۔ وہ شاید کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا ہو گا جو کوئی بھی آیا ہے اس کے شاساؤں میں سے ہو گا۔ اس نے نوی سے میری آمد کی خبر سن کر اسے ہدایت کی ہو گی کہ صاحب کو چائے پلاؤ۔ میں اتنی دیر میں تیار ہو کر آئی ہوں۔

نوی نے چائے تیار کر کے پیالی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔ ناشتا چونکہ میں کر کے چلا تھا۔ اس لیے میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

نسرین کوئی دس پندرہ منٹ بعد مسکراتی، لہراتی ہوئی نشست گاہ میں آئی۔ وہ نیلے رنگ کی چوڑے کناروں والی ریٹھی ساڑھی اور نیلے رنگ کا بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ اس کے کٹے ہوئے بال پشت پر لہرا رہے تھے۔ کمرے کے وسط میں آکر وہ ٹھک گئی۔ دوسرے ہی لمحے اچھل پڑی۔ اس پر جیسے جیروں کے پاؤں ٹوٹ پڑے تھے۔ ”تم...؟“ اس کی زبان لڑکھائی۔

”ہاں میں...“ میں مسکرایا۔ ”اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ کیا میں کوئی بدروح ہوں؟“

”نہیں یہ بات نہیں۔“ میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ ”میں اس پر حیران ہوں کر تمہیں میرے گھر کا پتہ کیسے چلا؟“

”دل لے دل کو راہ ہو تو گھر کی راہ اور اس کا پتہ بھی مل جاتا ہے۔“

”اچھا! اس کے سرخ ہونٹوں پر تبسم بچھل گیا۔ ”کیسے آتا ہوا۔ کوئی خدمت؟“

”اگر تم واقعی خدمت کرنا چاہتی ہو تو ان لوگوں کی خدمت کرو جو اس کے مستحق ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ جیسے میرا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہی ہو۔

”جس عورت کا پرس تم پر سون اڑا لائی ہو۔ وہ اسے لے جا کر واپس کر دو، ابھی اور اسی وقت۔“

”کون سا پرس؟ کیا پرس؟ میں کسی کا پرس لے کر نہیں آئی ہوں؟“ اس نے احتجاج کیا۔

”دیکھو نسرین! میرا لہجہ تند ہو گیا۔“ اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں۔ پرسوں شام کے وقت، تم نے جامع کلا تھ مارکیٹ میں فینسی ساڑھی ہاؤس کے سیزمیں کی حماقت سے فائدہ اٹھایا اور پرس لے کر نو دو گیارہ ہو گئیں۔ وہ پرس کسی حرام کی کمائی والے شخص کی بیوی کا نہ تھا اور اس میں جو زیورات اور سونا تھا وہ شادی کے زیورات بنانے کے لیے تھا۔ اگر ان لوگوں کو یہ پرس

جرم قابل معافی نہیں ہے، مگر... میں اس کینگی کا بدلہ نہیں لوں گا۔ میں یہاں ہنگامہ آرائی کرنے نہیں آیا۔ تمہارے لیے بہترینی ہے کہ وہ رقم اور سونا میرے حوالے کر دو' ورنہ..."

"ورنہ کیا...؟" اس نے نہایت پرسکون لہجے میں کہا۔ "تم خواہ مخواہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ سونے کے بارے میں تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

"ورنہ یہ کہ میں تشدد سے کام لوں گا۔" میں نے ڈنڈا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اب میری سمجھ میں یہی آرہا ہے کہ میں تم دونوں کو ڈنڈے مار مار کر بے ہوش کر دوں، پھر گھر کی تلاشی لے کر نہ صرف چوری کا مال برآمد کر لوں بلکہ جاتے جاتے گھر کا پوری طرح صفایا بھی کرتا جاؤں۔ تم دونوں ہوش میں آنے کے بعد شاید دماغی توازن کھو بیٹھو۔ اس لیے کہ دماغ پر شدید ضرب آنے سے اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔"

نسرین اور نوی کے چہروں پر لبو کی ایک بوند بھی نہ رہی تھی۔ وہ سفید پڑتے چلے جا رہے تھے۔ نسرین نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں پس و پیش نہیں کروں گا۔ چند لمحوں بعد وہ بولی تو دہشت سے اس کی آواز مرتضیٰ ہو رہی تھی۔ "اگر تم اپنی تسلی و تسفی کرنا چاہتے ہو تو میرے کمرے میں چل کر الماری اور تجوری کی تلاشی لے سکتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"تم کتنی ہوشیار ہو، اس کا تو مجھے اندازہ ہے۔ تم اس لیے اپنے کمرے کی تلاشی دے رہی ہو کہ اصل مال کہیں اور چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ ہر کیف میں پہلے الماری اور تجوری کی تلاشی لوں گا۔ اس کے بعد تم سے بات ہو گی۔"

میں نے نوی اور نسرین کو آگے آگے چلنے کا اشارہ کیا اور ان کے پیچھے پیچھے نسرین کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ نسرین کی خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی مجھ پر سحر طاری ہو گیا۔ اس کی خواب گاہ کا ماحول بڑا خواب ناک تھا۔ اس نے اس کی آرائشی میں بڑی نفاست سے کام لیا تھا اور اس کے ذوق کی داد نہ دینا نا انصافی تھی۔

اچانک میرے دل میں اس نادر خیال نے جنم لیا کہ وہ رقم اور سونا نسرین کی تجوری سے برآمد نہ ہوا تو اس کا جو مال بھی برآمد ہو گا وہ میں اپنے قبضے میں لے لوں گا۔ تاوٹھیک وہ راہ راست پر نہیں آجائی۔

نسرین بستر کے قریب پہنچ کر جھکی تو میں نے بڑی سرعت سے آگے بڑھ کر نوی کو ڈھال بنا لیا۔ تاکہ وہ تکیے کے نیچے سے چابیوں کی بجائے پستول نکالے تو اس کے نشانے کی زد میں میرے بجائے نوی آجائے۔ مگر اس نے چابیاں نکال کر میری جانب اچھال دیں۔ میں نے الماری کی طرف بڑھتے ہوئے خواب گاہ کا جائزہ لیا تو نشست گاہ کی طرح وہاں بھی چار کھیلے رکھے دکھائی دیے۔ ان میں کرشنا چوڑا کے پھولوں کے پودے رکھے تھے۔ خوب صورت پھول اس کی کزوری لگتے تھے۔

مگر خواب گاہ میں کھیلے دیکھ کر مجھے ابھمن سی ہونے لگی۔ عموماً لوگ وہاں کھیلے نہیں رکھتے۔

طریقے آتے ہیں۔ ان کے تشدد سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔"

"دیر کس بات کی ہے۔ شوق سے جاؤ اور ابھی جاؤ اور ابھی اسی وقت پولیس کو لے آؤ۔ دل میں جو بھی حسرت ہے وہ پوری کرلو۔" نسرین نے آخری جملہ ادا کرتے وقت بالکل غیر محسوس انداز میں آنکھوں سے اشارہ کیا تھا جیسے میرے پیچھے کوئی کھڑا ہو اور اس کے اشارے کا شکر ہو۔

میں نے سرعت سے پلٹ کر دیکھا۔ میرے پیچھے نوی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا۔ وہ ڈنڈا فضا میں بلند کر کے میرے سر پر ضرب لگانا چاہتی تھی۔ میں جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ڈنڈا صوفے کی پشت پر آگیا۔ اگر میں تیزی نہ دکھاتا تو میری کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی۔ میں اپنی جگہ سے بجلی کا کوند این کر نوی پر جھپٹا۔ اس نے پھر فضا میں ڈنڈا اٹھرایا۔ مگر میں نے پھرتی سے اس کی نازک کلائی پکڑ کر مروڑ دی تو وہ زور سے چیخی۔ "ہائے... میں مر گئی۔"

ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اس کی کلائی کسی ڈال کی طرح نازک سی تھی۔ میرے ہاتھ کی سخت گرفت نے اس کی کلائی کو پچکا سا دیا تھا۔ جب میں نے اس کی کلائی چھوڑی تو وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ پھر میں نے اسے دھکا دے کر صوفے پر گرادیا۔

نسرین تو اپنی جگہ پھرتی کھڑی تھی جس پر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ میں نے جیسے ہی لپک کر ڈنڈا اٹھایا تو ان دونوں کے چہرے فق ہو گئے۔ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ نسرین کی اس خاموشی میں مجھے انجانا خطرہ کروٹیں لیتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کلفٹن پر جس پھرتی اور چلت پھرت کا مظاہرہ کیا تھا وہ اب یہاں مفقود تھا۔ وہ کسی مصلحت کی خاطر اس روز سے یکسر مختلف حالت میں کھڑی تھی۔

میں پوری طرح چوکنا کھڑا تھا۔

نوی کب اور کیسے میرے پیچھے ڈنڈا لے کر پہنچی تھی۔ مجھے بالکل ہی خبر نہ ہو سکی۔ نوی کی اس صارت نے مجھے ششدر سا کر دیا تھا۔ وہ نسرین کی آلہ کار تھی اور ہر بات کو سمجھتی تھی۔ خطرے کی بو سونگھ لیتی تھی۔ اسے نسرین نے شاید تربیت دے رکھی تھی کہ ایسے مختلف موقعوں پر کیا کرنا چاہیے۔ کوئی خطرہ درپیش ہو تو کس طرح نمٹنا چاہیے۔ یقیناً وہ نسرین کی مجرمانہ سرگرمیوں سے پوری طرح واقف تھی اور کسی بھی بات کی تکفیر فوراً پہنچ جاتی تھی۔

میں نے ڈنڈا اٹھاتے ہوئے نوی سے کہا۔ "خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔ تم میرا سر پھوڑ دینا چاہتی تھیں نا۔ اب میں تمہارا سر پھوڑوں گا؟ میں نے آج تک اپنے کسی دشمن کو معاف نہیں کیا ہے۔"

"نہیں... نہیں۔" وہ دہشت سے چلائی۔ اور دوڑ کر نسرین کے پیچھے کھڑی ہو گئی، جیسے اس سے پناہ کی طلب گار ہو۔ اس کا شاخ گل ایسا بدن قہر قہر کانپ رہا تھا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

"نسرین!" میں نے زہر آلود لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "تم نے نوی کو حملہ کرنے کا اشارہ کر کے اپنے پیروں پر کھلاڑی ماری ہے۔ اگر میں تمہاری شیطان صفت ملازمہ کے حملے کی زد میں آجاتا تو میری کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی۔ تم سے ایک بمبائیک جرم سرزد ہوا ہے اور یہ

نسرین نے مجھے بلا جھجک الماری کی چابیاں تھما دیں۔
مجھے شبہ ہوا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ اس لیے میں نے اس کی طرف چابیاں
اچھالتے ہوئے کہا۔ ”چلو الماری تم ہی کھولو۔“ پھر میں نومی سے مخاطب ہوا۔ ”نومی ڈیر تم اپنا
کھڑا دیوار کی طرف کر کے کھڑی ہو جاؤ۔“

نومی نے بلا چون و چرا میرے حکم کی تعمیل کی تھی۔ گویا وہ ایک کونے میں دیوار کی طرف
منہ کیے کھڑی تھی، مگر اس ناگن کا بھی کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ نسرین جس وقت الماری کھول رہی
تھی، اس وقت میری پوری توجہ اس کی جانب مبذول ہو گئی تھی۔ کہیں وہ الماری سے پستول نکال
کر مجھے زیر نہ کر لے اور ساری بساط الٹ کر رہ جائے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے پاس پستول ہو گا۔
وہ ایک مجرم عورت تھی اور روز ہی وارداتیں کرتی پھرتی تھی اور میں پہلے اس کے پاس پستول دیکھ
چکا تھا۔

اچانک اطلاعی گھنٹی بجی تو ہم تینوں ہی چونک پڑے۔ معلوم نہیں کون کم بخت تھا جو نا وقت
چلا آیا تھا۔ وہ جو بھی تھا اس نے میرے لیے مسئلہ پیدا کر دیا تھا اور میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا
تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے نسرین کی طرف دیکھا، جو الماری میں چابی لگی چھوڑ کر گھوی تھی۔ وہ
خائف اور کسی قدر سراسیمہ سی نظر آ رہی تھی۔ جیسے میری موجودگی نے اسے پریشان کر دیا ہو۔
میں نے اس کے کمرے سے ملحق غسل خانے کی طرف دیکھا، اس میں باہر سے چنچنی لگی ہوئی
تھی۔ میں نے ان دونوں کو اشارہ کیا کہ وہ غسل خانے کے اندر چلی جائیں۔ ان دونوں کو غسل
خانے کے اندر جانے سے گریز تھا۔ میں نے نومی کے قریب پہنچ کر اسے ڈنڈے کے سرے سے غسل
خانے کی طرف دھکیلا تو وہ سرعت سے اندر چلی گئی، مگر نسرین اپنی جگہ کھڑی رہی۔ میں نے اس کی
جانب ڈنڈا بڑھایا۔ اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی
ہوئی بولی۔ ”میرے گھر پر معزز لوگ آتے رہتے ہیں۔ میں نے آج کچھ لوگوں کو دعوت دے رکھی
ہے۔ شاید ان میں سے کوئی آیا ہے۔ کیا میں جا کر دیکھ آؤں کہ کون ہے۔“

”میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ تمہاری چالاکیوں کو نہ سمجھ سکوں۔“
”سکندر۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد الماری اور
تجوری کی تلاشی دے دوں گی۔“ نسرین نے کہا۔
”میرے استاد مجھ سے کہا کرتے تھے کبھی بھولے سے عورت اور سانپ پر بھروسہ نہ
کرنا۔“ میں نے قریب پہنچ کر اس کا نرم و نازک بازو تھام لیا۔ کیونکہ اطلاعی گھنٹی وقفے وقفے سے دو
تین مرتبہ بج چکی تھی۔ ”ویسے تم مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو۔ میں تمہارے معزز مہمان کو عزت و
احترام سے لا کر نشست گاہ میں بٹھا دوں گا۔ ان سے کہوں گا کہ تم تیار ہو رہی ہو۔ تم میری غیر
موجودگی میں ان سے باتیں کر سکتی ہو مگر مجھے کوئی فریب دینے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ اپنی زندگی سے
ہاتھ دھو بیٹھو گی۔“

پھر میں نے اسے غسل خانے میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا اور چنچنی لگا دی۔ ڈنڈے کو
بستر کے نیچے رکھ کر میں بیرونی دروازے کی طرف لپکا۔ اس لیے کہ گھنٹی اب بھی مسلسل بج رہی
تھی۔ معلوم نہیں کون عاشق زار تھا جو محاذ عشق پر بری طرح ڈٹ گیا تھا اور نسرین کے دیدار کے
لیے بیاب اور بے کل ہوا جا رہا تھا۔
میں نے دروازہ کھولا تو میری نظروں کے سامنے ادیز عمر کا صحت مند اور وجہہ مرد کھڑا
تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا۔ اس کا نام عاشق حسین تھا اور وہ سنا تھا۔ اس کی صرافہ بازار
میں ایک چھوٹی سی دکان تھی، مگر اس کا کاروبار بہت بڑا تھا۔ وہ چوری کا سونا اور زیورات خریدتا
تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہنڈی کا کام اور سونے کی اسمگلنگ کیا کرتا تھا۔ بے حد لالچی
قسم کا شخص تھا۔
چوری کا مال فروخت کرنے کے لیے ہر شخص اسی کے پاس پہنچتا تھا۔ اول تو اس نے کبھی
چوری کا مال خریدنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ دوم اس کے پاس چوری کا مال فروخت کرنے کے لیے
ہر طرح سے تحفظ ملتا تھا، اس لیے کہ وہ پولیس سے خود ہی نمٹ لیتا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس
نے چوری کا مال فروخت کرنے والے کی نشان دہی کی ہو۔ اس سے میرے بڑے پرانے مراسم
تھے۔ اس نے مجھے دروازے پر دیکھا تو اس کے چہرے پر حیرت سی چھا گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا
چہرہ دمک اٹھا۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”اماں یار! تم یہاں کیسے؟“

”اگر یہی سوال میں تم سے کروں تو؟“
”ملا کی دوڑ مسجد تک۔“ اس نے میرے کندھے پر بے تکلفی سے... ہاتھ رکھ دیا۔ ”مس
نسرین نے آج صبح ٹیلی فون کر کے بلایا کہ اس کے پاس بڑا مال آیا ہے۔ بارہ بجے تک پہنچو۔ ہم تو
بارہ سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ کیوں ٹھیک ہے؟“
”تو کیا نسرین تمہارے ہاتھ چوری کا مال بیچتی ہے؟“
”ہاں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم سے کیا چھپانا۔ نسرین سے میں بڑے
عرصے سے چوری کا مال خرید رہا ہوں۔ اس کے مال میں مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ اس لیے کہ وہ
زیادہ مول تول نہیں کرتی۔ کیا تم بھی اس کے پاس چوری کا مال خریدنے آئے ہو؟“ اس نے بائیں
دبائی اور میرے قریب آکر سرگوشی کی۔ ”دیکھو، سکندر بھائی اگر تم اس سے کوئی چیز خریدنے آئے
ہو تو اپنے آپ کو پیچھے ہٹالو۔ میں تمہارے سامنے اس کا سارا مال خریدوں گا... جتنے کا مال ہو گا“
اس پر دس فیصد کمیشن دوں گا۔“

”تمہاری پہلی بات مان لیتا ہوں اور پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ مجھے کوئی کمیشن نہیں چاہیے مگر
میری ایک شرط ہے۔“
”میں تمہاری ایک نہیں دس شرائط پوری کرنے کو تیار ہوں۔“ اس نے اپنے غلیظ دانتوں
کی نمائش کی۔
”تم نسرین پر یہ مت ظاہر کرنا کہ مجھے جانتے ہو۔ بس اس سے اپنے مطلب کی بات کرنا۔
اس کے پاس سو تو لے خالص سونا موجود ہے، جو تمہارے ہاتھ بیچنا چاہتی ہے، اس لیے اس نے

عاشق حسین کا نام سن کر اس نے نومی کی طرف پلٹ کر دیکھا... وہ غسل خانے سے نکل کر اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔ ”تم عاشق حسین سے اتنی دیر باتیں کرو۔ میں تلاشی دے کر آتی ہوں۔“

”مجھے کسی تلاشی کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے اپنے کندھے اچکائے۔ ”میں جانتا ہوں کہ وہ رقم اور سونا تم نے گھر میں نہیں بلکہ کمپن اور چھپا رکھا ہے، جیسی تلاشی بھی دے رہی ہو۔ میں اب جا رہا ہوں، مگر تیسرے دن آؤں گا۔ تین دن کی سہولت دے رہا ہوں۔ اگر تم نے دونوں چیزیں مجھے نہ لوٹائیں تو پھر نتیجے کی ذمہ داری خود ہوگی۔“

پھر میں اس کا جواب سننے کے لیے رکا نہیں تیزی کے ساتھ اس کی خواب گاہ سے نکلا۔ نومی میرے پیچھے پیچھے تھا۔ میں نے نشست گاہ پہنچ کر عاشق حسین سے کہا۔ ”ہیلم صاحبہ آ رہی ہیں۔“ میں نشست گاہ سے نکل کر برآمدے میں آیا تو دروازے کی چٹنی لگانے کی آواز سنائی دی۔ نومی نے لپک کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

میں اس گلی کی ککڑ پر بنے ہوئے ہوٹل میں ایک ایسی میز پر جی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جہاں سے نسرین کا بھگا صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے جی کو تفصیل سے سارا واقعہ سنایا اور اسے یہ بھی بتایا کہ کس مصلحت کے تحت باہر آگیا ہوں۔ ہم دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں، نومی گھر سے نکلتی دکھائی دی۔ جی نے مجھ سے کہا۔ ”میں اس کے تعاقب میں جا رہا ہوں۔ آپ عاشق حسین کے انتظار میں یہاں بیٹھیں۔ آپ عاشق حسین سے مل کر اگر نسرین کے ہاں گئے تو میں اس ہوٹل میں آکر آپ کا انتظار کروں گا، اگر مجھے کسی وجہ سے دیر ہو جائے تو پھر آپ گھر چلے جائیں۔ آپ سے وہیں ملاقات ہوگی۔“

جی تو نومی کے تعاقب میں چلا گیا۔ کوئی نصف گھنٹہ گزر گیا۔ نہ جی آیا اور نہ ہی نومی، البتہ نصف گھنٹے بعد عاشق حسین گھر سے نکلا تو بہت خوش تھا جیسے کوئی بہت بڑا محاذ فتح کر کے آرہا ہو۔ اس نے باہر نکل کر ایک رکشا روکا اور پھر رکشے کی نشست پر جس انداز سے اپنا کوٹ سنبھال کر بیٹھا، اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس لالچی شخص نے میرے ساتھ بددیانتی کی ہے، دھوکا دیا، مجھے ایک سہرا، موقع مل رہا تھا کہ میں اسے بے ایمانی کا مزہ چکھاؤں۔

میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر پر دس کانوٹ پھینکا باقی پیسے بھی نہیں لیے اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ جیسے ہی اس کا رکشا قریب آیا میں نے ہاتھ کے اشارے سے روکا تو رکشا رک گیا۔ عاشق حسین نے جیسے ہی میری شکل دیکھی، اس کی آنکھوں کے دیے ماند پڑ گئے۔ چہرے کی سرفی، زردی میں بدل گئی۔ ”وہ بوکھلا کر بولا۔“ سکندر بھائی، ”تم؟“

”سکندر اعظم کی روح۔“ میں نے جواب دیا۔ اور میری انگلیوں نے معلوم کر لیا کہ سو تو لے سونا کہاں ہے۔ دوسرے ہی لمحے وہ میرے ہاتھ میں تھا۔

”سکندر بھائی... سکندر بھائی۔“ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ ”یہ... یہ غلط بات ہے۔“

تمہیں بلایا بھی ہے اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو میں اس کے بدلے، تم سے میرے جواہرات کے زیورات کا سودا کر سکتا ہوں۔ وہ زیورات تمہیں کوڑیوں کے مول مل سکتے ہیں۔“

”اچھا...“ اس کی باپچیں کھل گئیں۔ ”مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

”تم اس سے وہ سونا خریدو گے نہیں، بلکہ اس کا سونا پرکھ کر واپس کر دو گے کہ یہ سونا جھوٹا ہے۔ اس کی مالیت دس روپے بھی نہیں ہے۔“

”مگر سکندر بھائی!“ وہ تذبذب سے بولا۔ ”وہ سونا کسی اور کو دکھا دے گی تو میں ہمیشہ کے لیے اس کی نظر میں جھوٹا ہو جاؤں گا۔ تم جانتے ہو، میں جھوٹ نہیں بولتا۔ پھر نسرین جیسا گاہک ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”تمہارے علاوہ کسی اور سے سودا نہیں کرتی... اور نہ ہی کرنا چاہتی ہے۔ تمہاری اتنی سی بات پر کسی کا بھلا ہو گا اور پھر یہ ایک نیک کام ہو گا۔ تمہیں دعائیں ملیں گی دعائیں۔“

”میرے جواہرات کا سودا کب ہو گا؟“

”کل!“ میں نے جواب دیا۔ ”کل شام وہ شخص، جس کا نام محسن زیدی ہے، میرے جواہرات کے زیور لے کر تمہارے پاس پہنچے گا۔ وہ تمہیں میرا حوالہ دے گا۔ تم جو دام لگاؤ گے وہ اسے مان لے گا۔“

”کیا وہ چوری کے زیورات ہیں؟“

”ہاں!“ میں نے سر ہلایا۔ ”کسی امریکی خاتون کے ہیں۔ کوئی پندرہ دن قبل ایک ہوٹل سے چرائے گئے ہیں۔“

وہ خوش ہو گیا۔ ادھر میں مجبور تھا کہ اس سے جھوٹ بول کر اس لالچی شخص کو اس سو تو لے سونے کی خریداری سے باز رکھوں۔ ویسے اس کا کوئی بھروسہ نہیں تھا، وہ کسی بھی لمحے مکر سکتا تھا یا پھر کوئی بمانہ بنا سکتا تھا۔ مگر مجھے تو کوئی تدبیر لڑانا تھی اور ان زیورات کو حاصل کرنا تھا۔ میں نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا تو وہ تیزی سے نشست گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

جب میں بیرونی دروازہ بند کر رہا تھا، اس وقت میری نظر جی پر پڑی۔ وہ بے چینی اور وحشت کے عالم میں سڑک پر ٹٹل رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے اشارہ کیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں ابھی آ رہا ہوں۔ پھر میں نشست گاہ میں عاشق حسین کے پاس آیا تو وہ متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی سرگوشی کی۔ ”نومی کہاں ہے؟“

”وہ بھی اندر ہے۔“ میرے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔

میں اسے صوفے پر بٹھا کر مسکراتا ہوا نسرین کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے غسل خانے کا دروازہ کھولا تو نسرین چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی مانند باہر آئی۔ ”تم جو کچھ کر رہے ہو، اچھا نہیں کر رہے ہو، سکندر، اپنی حد سے آگے بڑھ گئے ہو۔“

”کوئی عاشق حسین صاحب تم سے ملنے آئے ہیں۔“ میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے انہیں نشست گاہ میں بٹھا دیا ہے۔ ان سے کیا کہوں۔“

میں نے رکشا والے سے کہا۔ ”تم رکشا چلاؤ۔“ جب رکشا چل پڑا تو میں نے اس سے کہا۔ ”کیا یہ غلط بات نہیں کہ تم نے مجھ سے بددیانتی کی۔ مجھے دھوکا دیا اور ایک تیر سے دو شکار کیے۔“ ”تم پوری بات تو سنو۔“ وہ گڑبڑا سا گیا۔ ”اس نے مجھے کچھ ایسا مجبور کر دیا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ جھوٹ نہ بول سکا۔“

”تم جانتے ہو یہ سونا کس کا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے آم کھانے سے مطلب ہے، پیز گنٹے سے نہیں۔“ ”تو پھر مجھے بھی اس سے کوئی سروکار نہیں کہ یہ مال کیسے اور کہاں سے اور کس خبیث سے حاصل کیا ہے۔... میں کسی سے مال خریدتا نہیں ہوں، بلکہ چاقو کے زور پر چھین لیتا ہوں۔ اس مال کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تم سے بڑی توند میں بھی چاقو گھونپ سکتا ہوں۔“ میں نے قریب ہو کر اس کی نکل ہوئی توند پر ہاتھ پھیرا تو وہ اچھل گیا۔ ”تم نے اکثر میرے ہاتھ میں چوری کا مال دیکھا ہے، کبھی چاقو بھی دیکھا؟“ میں نے رک کر اپنا ہاتھ نیپسے کی طرف بڑھایا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔

”نہیں... نہیں۔“ اس نے دہشت زدہ ہو کر میرا ہاتھ پکڑا تو وہ برف ہو رہا تھا۔ ”میں نے اسے پچاس ہزار میں خریدا ہے۔ تم پچاس ہزار ہی دے دو۔ میں کوئی کمیشن نہیں لوں گا۔“ ”کیا یہ تمہارے باپ کا مال ہے۔“ میں نے بے رحمی کے انداز میں اس کی توند پر ایک ہاتھ بٹا دیا۔ ”تمہیں پچاس ہزار روپے تو کیا پچاس پیسے بھی نہیں دوں۔ البتہ چاقو تمہاری توند میں گھونپ سکتا ہوں۔ کیہنے... ذلیل... میں تمہیں ایک لاکھ کا فائدہ کروا رہا تھا مگر تم نہیں مانے اور کھلی بے ایمانی کر گئے۔ اب بھگتو سزا۔“

”ایک لاکھ کا فائدہ؟ میں ابھی یہ سونا نسرین کو واپس کر آتا ہوں، پھر تم وہ مال دلاؤ دینا۔“ ”اب تو میں تمہیں نیست و نابود کر کے ہی رہوں گا۔“

فرلانگ بھر کے فاصلے پر چورہا تھا۔ اس چوراہے کے فٹ پاتھ پر دو مسلح پولیس والے کھڑے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی وہ شیر ہو گیا۔ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”ریکھو، وہاں پولیس کھڑی ہے۔ اب تم بچ کر کہاں جاؤ گے؟ شرافت سے میرا مال مجھے واپس کر دو۔ ورنہ میں پولیس کے ہتھے چڑھا دوں گا۔“

”میری جان اپنے دل کی یہ حسرت بھی پوری کرلو۔ میں بھی ان سے کہوں گا کہ یہ سونا اس ذلیل شخص کی ایک شناسا نے چرایا ہے، انہیں بھی علم ہو گا اور آج کے اخباروں میں تو یہ خبر بھی چھپی ہے۔ ایس پی صاحب تم سے خود سمجھ لیں گے۔ میرا کیا ہے۔ میں تین چار ماہ کی کات کر آ جاؤں گا۔ نسرین بھی تمہارے خلاف بیان دے گی اور تمہارا کچا چٹھا کھول دے گی... تم خود سمجھ لو، تمہارا کیا حشر ہو گا۔“

عاشق حسین کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس پر میری باتوں کا جادو چل گیا تھا۔ وہ میری باتوں سے دہشت زدہ ہو رہا تھا۔ میں نے گرم لوبے پر ایک بھرپور ضرب لگانے کی غرض سے رکشا والے کا

کندھا ہلا کر کہا۔ ”تم گلشن تھانے لے چلو۔“

”کیوں... کیوں۔“ عاشق حسین حد درجہ سراسیمہ ہو گیا۔ اور تھر تھر کانپنے لگا۔ ”ہم تھانے چل کر ایس پی کو یہ سونا دے آتے ہیں۔ تم ایس پی کو بتا دینا کہ یہ سونا کس سے اور کہاں سے خریدا تھا۔ شاید تمہیں ایس پی صاحب انعام سے بھی نواز دیں، اس لیے کہ یہ سونا انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے خریدا تھا۔“

اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ ”نہیں... نہیں تم خود ہی چلے جاؤ، تم ہی پہنچا دو۔“ ”اگر تم یہ نیک کام انجام دینا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ تم ایسا کرو، مجھے گلشن اقبال کے تھانے پر اتارتے چلو۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے مردہ آواز میں کہا اور رومال نکال کر پیشانی کا پینہ پونچھا۔ اس نے مجھے گلشن تھانے سے کچھ فاصلے پر اتار دیا۔ میں نے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ رکے گا نہیں۔ ایام ہی ہوا۔ میں تھانے کے گیٹ پر پہنچا بھی نہیں تھا کہ وہ رکشالے کر چلا گیا۔ میں رکشالے کر ہو ٹل پہنچا... غیر متوقع طور پر سونا ہاتھ لگ جانے پر میں بہت خوش تھا۔ اب میں نسرین کو جھوٹا ثابت کر سکتا تھا۔ کرایہ دے کر میں اندر آیا، جی نہیں تھا۔

میں نے نسرین کے بنگلے پر پہنچ کر اطلاعی گھنٹی بجائی۔ پانچ منٹ بعد دروازہ کھلا۔ نسرین نے جیسے ہی مجھے دیکھا، دروازہ بند کرنا چاہا۔ میں نے سرعت سے اپنا پیر دروازے میں پھنسا دیا۔ اسے دھکیل کر اندر چلا گیا۔ نسرین مجھے دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔

دفعۃً نسرین بجلی کا کوندا بن کر اپنی خواب گاہ کی طرف لپکی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔

اس نے کمرے کا دروازہ بند کرنا چاہا مگر میں نے اسے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ دروازے کو زور سے دھکا دیا تو وہ فرش پر جاگری اور فرش پر بکھری گئی۔ معاً میری نظر پانچ سو کے نوٹوں کی گڈی پر پڑی۔ میں نے لپک کر وہ گڈی اٹھالی۔ میں نے گڈی کے نمبر دیکھے تو وہ چالیس ہزار کی رقم تھی۔

عاشق حسین نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ اس نے پچاس ہزار روپے کی رقم ادا کی ہے۔

نسرین اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھ پر جھپٹی تاکہ میرے ہاتھ سے رقم چھین لے مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ میں نے اسے دھکا دے کر بستر پر گرا دیا، پھر میں اس کی نفرت بھری شعلہ بار آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا رہا۔ ”... میری رقم مجھے دے دو۔“ وہ تڑپ کر بولی۔

”یہ رقم کہاں سے آئی ہے؟“

”تم کون ہو پوچھنے والے۔“ وہ غصے سے تپ رہی تھی۔ ”یہ رقم میری ہے۔“

میں نے جیب سے سونے کا پیکٹ نکالا۔ ”یہ رقم تم نے اس سونے کے عوض حاصل کی ہے؟“

”ہاں۔“

”آپ؟“

”ایک دلچسپ داستان ہے جو پھر کسی وقت سناؤں گا۔ اب تمہارے جھوٹ کا پلندہ کھل چکا ہے۔ بہتر ہے تم وہ بیچیں ہزار کی رقم واپس کر دو۔ تاکہ کسی کو خوشیاں مل سکیں۔“

”تم یقین کرو۔ اس پرس میں اس سونے کے علاوہ صرف دو سو روپے تھے۔“

”اب مجھے تمہاری کسی بات کا یقین نہیں رہا۔ تم ایک نمبر کی جھوٹی ہو اور مسلسل مجھے فریب دیتی چلی آ رہی ہو۔“

میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹتی چلی جائے گی۔ لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ وہ کسی چٹان کی طرح جی کھڑی تھی۔ پھر اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں غصے کے شعلے اور رخساروں پر ان شعلوں کا عکس لرزتے دیکھا تو کفٹن کے زیرِ ان ساحل پر، نیم تاریکی میں کئی مردوں سے مقابلہ کرتی ہوئی وہ لڑکی میری آنکھوں میں گھوم گئی، میں نے چند لمحے قبل بے بس اور کمزور سمجھ کر جس کے لیے ڈھال بننے کی کوشش کی تھی۔

میں ٹھک جانے پر مجبور ہو گیا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ درحقیقت میں کس قدر نازک صورت حال سے دو چار ہو چکا ہوں۔ پہلی مصیبت یہ تھی کہ میں ایک چار دیواری کے درمیان دو جوان لڑکیوں کے درمیان تھا، دوسری مصیبت یہ تھی کہ ان میں سے ایک لڑکی جو ڈو کرانے میں ماہر تھی۔

”اب تم یہاں سے نہیں جاسکو گے، سکندر۔“ فریزن نے کہا۔ اس کی ہتلیاں ساکت تھیں، کسی ناگن کی طرح گول گول اور بے حرکت۔ اس کا لہجہ بے حد سنگین تھا۔

میرا ہاتھ آہستہ آہستہ اپنے پہلو میں جھکا اور جیب میں ریگ گیا۔ اگلے ہی لمحے میری انگلیاں اپنے مخصوص چاقو سے چموری تھیں۔

